قُلْ لَّا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَکَ کَثْرَةُ الْخَبِیْثِ (القرآن)

حکیم الاسلامؒ

دارالعلوم دیوبند کی

ایک

مظلوم شخصیت

حیات

خدمات

واقعات

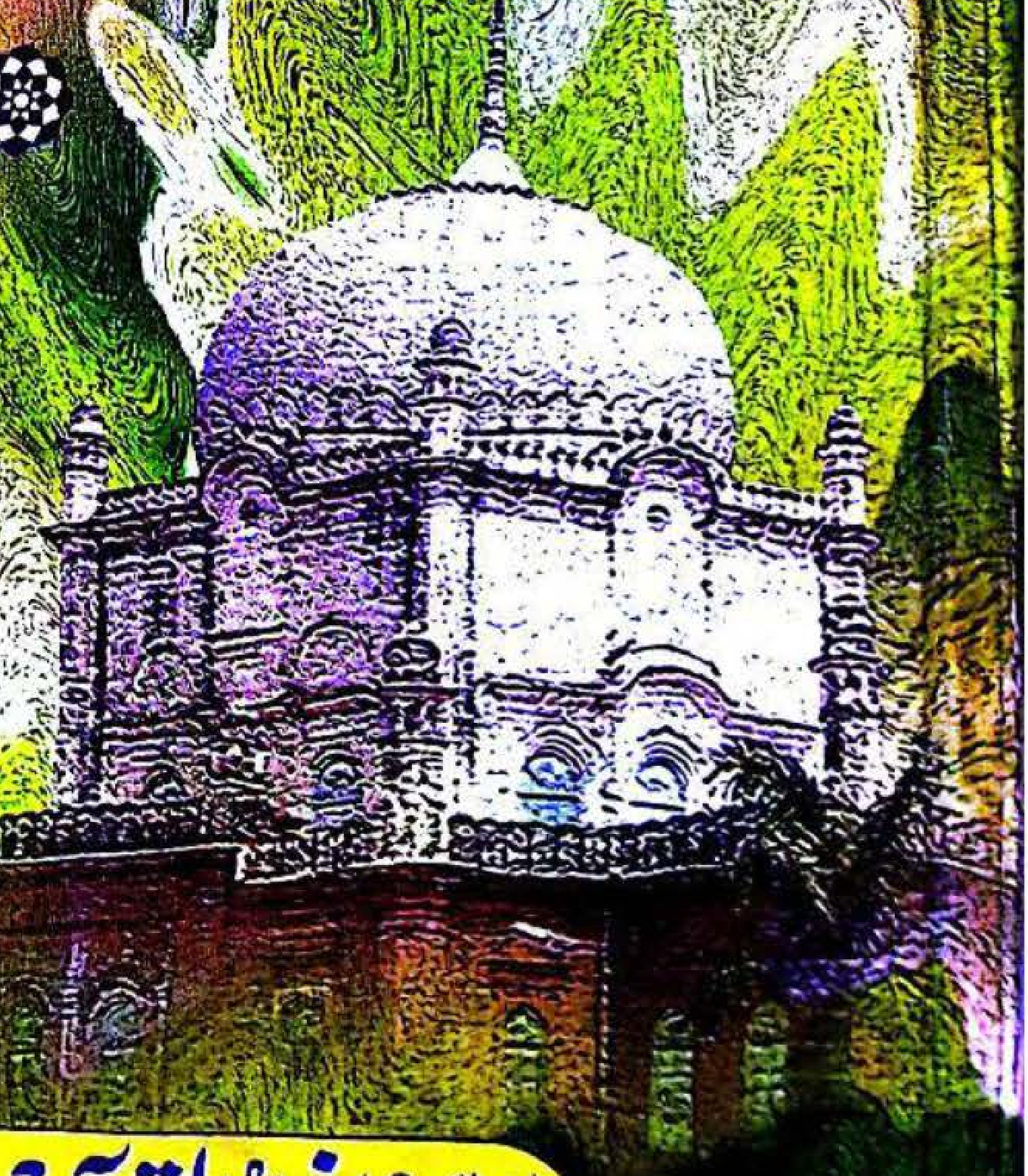

تالیف

محمد سعد صدیقی

رکن شعبۂ تنظیم و ترقی دارالعلوم وقف دیوبند

ادارہ انوار القرآن دیوبند یوپی ۲۴۷۵۵۴

قُلْ لَّا يَسْتَوِى الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكُمْ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ

قرآن کریم

حکیم الاسلام

دار العلوم دیوبند

کی

ایک مظلوم شخصیت

حیات

واقعات

خدمات

جلد سوم

تالیف

محمد اسعد صدیقی

رکن شعبہ تنظیم و ترقی دار العلوم دیوبند

۲۲۷۵۵۲

ادارہ انوار القرآن دیوبند (یوپی)

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں

نام کتاب : حکیم الاسلامؒ دارالعلوم دیوبند کی ایک مظلوم شخصیت

نام مؤلف : محمد اسعد صدیقی، موبائل: 09319255912 , 09359210265

صفحات : ۴۱۶ (چار سو سولہ)

قیمت : ....

سن اشاعت باراوّل : نومبر ۲۰۰۶ء

مطبع : رمزی آفسیٹ پرنٹنگ پریس دیوبند

کمپیوٹر کتابت : الفضل کمپیوٹرس دیوبند (موبائل 09412525824)

ناشر : ادارہ انوار القرآن دیوبند (یوپی) پن کوڈ نمبر: ۲۴۷۵۵۴

موبائل: 09319255912 , 09359210265

ملنے کے پتے

- ادارہ تعلیماتِ اسلام دیوبند
- دارالکتاب دیوبند
- مسعود پبلشنگ ہاؤس دیوبند
- مکتبہ نعیمیہ دیوبند
- فیصل پبلی کیشنز دیوبند
- مکتبہ ملت دیوبند
- مکتبہ جاوید دیوبند
- ازہر اکیڈمی دیوبند

فہرست مضامین

عنوان | صفحہ نمبر

شخصیت کے مختلف پہلو

- حضرت حکیم الاسلامؒ علمی اور عرفانی نسبتوں کی جامع شخصیت ۸
  حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب مدظلہ، مہتمم (وقف) دارالعلوم دیوبند
- حکیم الاسلامؒ کی یاد ۱۱
  حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیری مدظلہ، شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند
- حکیم الاسلامؒ کا نقش جمیل ۱۴
  حضرت مولانا عبدالرشید صاحب محمود گنگوہیؒ نبیرہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ
- الوداع: حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ۱۸
  حضرت مولانا مفتی محمد اشرف سعودی صاحب/ مہتمم سبیل الرشاد بنگلور
- اسلاف کی آخری یادگار ۲۶
  شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ
- سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے ۲۹
  حضرت مولانا عبدالاحد الازہری قاضی شہر و ناظم معہد ملت مالیگاؤں
- تذکارِ طیب ۳۴
  حضرت مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مدیر ماہنامہ معارف اعظم گڑھ
- حضرت مہتمم صاحب کی زندگی کے بعض گوشے ۴۰
  ابن الانور مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر، سابق مدیر ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند
- حضرت قاری صاحبؒ ۴۵
  مولانا قاضی محمد اطہر صاحب مبارکپوریؒ
- قطب ارشاد عارف باللہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ۴۹
  نبیرۂ حکیم الاسلام مولانا محمد فاروق اسلم صاحب قاسمی، استاذ دارالعلوم وقف دیوبند
- رفتید! ولے نہ از دلِ ما ۵۶
  مولانا عبدالرؤف صاحب عالی پیشکار دارالعلوم وقف دیوبند
- آہ! حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ۶۰
  مولانا عبدالحق صاحب سابق پیشکار دارالعلوم دیوبند

عنوان	صفحہ نمبر

- یادگارِ علوم انوری حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ ۶۴
نبیرۂ امام العصر علامہ کشمیریؒ مولانا نسیم اختر شاہ قیصر، استاذ دار العلوم وقف دیوبند
- دار العلوم دیوبند کی ایک مظلوم شخصیت ۶۹
مولانا ندیم الواجدی صاحب / مدیر ماہنامہ ترجمان دیوبند
- الحاج قاری محمد طیب قاسمی ۷۷
جمیل مہدی صاحبؒ، سابق ایڈیٹر روزنامہ عزائم لکھنؤ
- نابغۂ عصر و یگانۂ روزگار حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ۸۴
عادل صدیقی صاحب دیوبند
- حکیم الاسلام، فخرِ روزگار، دانائے زمانہ ۹۴
ابن الانور مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر / سابق مدیر ماہ نامہ دار العلوم دیوبند
- حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ اکابرِ دیوبند کی آخری یادگار ۹۷
حضرت مولانا شمس تبریز صاحب قاسمی ندوۃ العلماء لکھنؤ
- حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ایک آفاقی شخصیت ۱۰۴
حکیم محمد الیاس صاحبؒ میرٹھی
- حضرت قاری صاحبؒ کچھ نقوش و تاثرات ۱۰۷
قاری منظور احمد صاحب گھوسوی استاذ جامعہ مظہر العلوم بنارس
- ایک جامع صفات شخصیت ۱۱۳
خلیفۂ مجاز جانشین حکیم الاسلام خطیب العصر حضرت مولانا سالم صاحب قاسمی
- ایک تاریخی شخصیت ۱۱۵
حضرت مولانا ابو العرفان ندوی معتمد تعلیمات دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
- حضرت حکیم الاسلام چند نقوش ۱۱۷
حضرت مولانا سید احمد صاحب ہاشمیؒ
- ایک باکمال شخصیت ۱۱۹
مولانا قاضی سجاد حسین صاحبؒ
- ملتِ اسلامیہ کی ایک یادگار شخصیت حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ۱۲۲
نبیرۂ امام العصر علامہ کشمیریؒ مولانا نسیم اختر شاہ قیصر: استاذ دار العلوم وقف دیوبند
- حکیم الاسلامؒ ۱۲۹
حضرت مولانا محمد عبید اللہ صاحب / مہتمم جامیہ اشرفیہ لاہور

عنوان	صفحہ نمبر

- حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ۔۔۔ ۱۴۸
  حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی مدظلہ/مہتمم جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا، پاکستان
- آہ! حضرت حکیم الاسلامؒ ۔۔۔ ۱۵۷
  شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ کھٹک، پاکستان
- خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا ۔۔۔ ۱۶۱
  حضرت مولانا فاضل حبیب اللہ رشیدیؒ صاحب/ماہنامہ الرشید ساہیوال پاکستان
- موتُ العَالِم موتُ العَالَم ۔۔۔ ۱۶۵
  حضرت مولانا محمد اشرف خاں صاحب پاکستان/ماہنامہ البیان پشاور، پاکستان
- آفتاب علم وعمل غروب ہو گیا ۔۔۔ ۱۷۱
  حضرت مولانا سید عبدالقادر صاحب آزاد، پاکستان/روزنامہ نوائے وقت پاکستان
- دارالعلوم دیوبند کا آخری چراغ گل ہو گیا ۔۔۔ ۱۷۴
  حضرت مولانا سمیع الحق صاحب/ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک پشاور، پاکستان
- حکیم الاسلام کا سانحۂ ارتحال ۔۔۔ ۱۷۷
  حضرت مولانا اخلاق احمد صاحب عثمانی، ماہنامہ بینات کراچی، پاکستان
- جامع الکمالات شخصیت ۔۔۔ ۱۸۱
  حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی/ماہنامہ بینات کراچی، پاکستان
- آہ! علوم قاسمی کا ترجماں نہ رہا ۔۔۔ ۱۸۳
  حضرت مولانا حکیم انیس احمد صدیقی، کراچی الرشید ساہیوال
- آہ! حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ ۔۔۔ ۱۸۶
  حضرت مولانا محمد یوسف صاحب قریشی ماہنامہ صدائے اسلام پشاور
- دارالعلوم دیوبند اور حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ ۔۔۔ ۱۸۹
  جرنلسٹ سید زاہد حسین صاحب
- حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ شخصیت اور خدمات ۔۔۔ ۱۹۲
  مولانا عبدالرشید صاحب بستوی/ناظم تعلیمات جامعۃ الامام محمد انور شاہؒ دیوبند
- روح طیب الوداع، السلام ۔۔۔ ۲۰۸
  مولانا ڈاکٹر طاہر الاسلام صاحب قاسمی دیوبندی/مقیم حال سعودی عرب
- حکیم الاسلام ایک شخصیت ایک تاثر ۔۔۔ ۲۱۱
  اظہر صدیقی صاحب جرنلسٹ

عنوان	صفحہ نمبر
● بیسوی صدی کی عظیم شخصیت قاری محمد طیب صاحبؒ مولانا ڈاکٹر عبید اقبال عاصم قاسمی/علی گڑھ	۲۱۸
● آشیاں اجڑا کیا---ہم ناتواں دیکھا کئے مولانا احسن مفتاحی: روزنامہ اخبار مشرق کلکتہ	۲۲۸
● فرشتوں کی انجمن کا ایک انسان نبیرہ امام العصر علامہ کشمیریؒ مولانا نسیم اختر شاہ قیصر/استاذ دارالعلوم (وقف) دیوبند	۲۳۴

حکیم الاسلام اور ان کی حکمت ریز تصانیف

عنوان	صفحہ نمبر
● حضرت قاری صاحب کی تصانیف پر ایک نظر مولانا اسیر ادروی استاذ جامعہ اسلامیہ بنارس	۲۴۵
● حکیم الاسلام اور ان کی تصانیف مولانا محمد عمران القاسمی بگیانوی، محلہ محمود نگر، مظفر نگر	۲۸۷

حکیم الاسلام اور ان کی شاعری

عنوان	صفحہ نمبر
● حکیم الاسلامؒ کی شاعری حضرت مولانا محمد اسلم قاسمی شیخ الحدیث والتفسیر دارالعلوم وقف دیوبند	۳۳۹
● حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ شاعر کی حیثیت سے ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن خدا بخش لائبریری پٹنہ	۳۴۴
● قاری صاحبؒ کا ذوق شعر گوئی مولانا ابوالقاسم صاحب نعمانی بنارس	۳۶۳
● حکیم الاسلام بحیثیت شاعر مولانا ڈاکٹر عبید اقبال عاصم قاسمی، علی گڑھ	۳۷۱
● کلمات طیبات یعنی ذکر اللہ کے دس اسلامی کلمے	۳۸۷
● بزم طیب کے چراغ فہرست خلفاء حضرت حکیم الاسلامؒ	۴۱۰
● وصیت نامہ حضرت حکیم الاسلامؒ	۴۱۱

شخصیت کے مختلف پہلو

حضرت حکیم الاسلامؒ

علمی اور عرفانی نسبتوں کی جامع شخصیت

حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب مدظلہ مہتمم (وقف) دارالعلوم دیوبند

خطیب بے مثال امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے اپنی طلاقت لسان فصاحت کلام، اور جامعیت خطاب پر مشتمل ایک عظیم وطویل حقیقت کو خیر المدارس جالندھر میں پیرایۂ اختصار عطا کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ:

"اگر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی جامع الصفات ذات گرامی کو دیکھنے والا قسم کھا کر یہ کہے کہ میں نے حقائق اسلام کی حکمت آفرینیوں کے ساتھ حضرت اقدس شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو، کتاب اللہ کے ظاہر و باطن کے انسانیت نواز علوم کے ساتھ حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کو حقائق واحکام اسلام پر ناقابل شکست استدلال کے ساتھ حجۃ اللہ فی الارض شیخ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کو تفقہ اسلام کا مدلل راہ نمائی کے ساتھ فقیہ الاسلام حضرت اقدس مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کو علم وعرفان کی بہم آمیز جرأت ایمانی کے ساتھ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی کو عالم بے عدیل حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کو ان کی منفرد قوت حفظ واتقان کے ساتھ علم حدیث پر مثالی وسعت نظر کے ساتھ محدث جلیل حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کو —— بے مثال طلاقت وفصاحت کے ساتھ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کو، تفقہ فی الدین اور کمال اتباع سنت کے ساتھ شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کو فراست ایمانی پر تدبر کامل کے ساتھ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب

عثمانیؒ سابق نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کو اور علم و عرفان زہد و اتقاء اور فضل و کمال کے پیکر جمال کے ساتھ حکیم الامت حضرت اقدس مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کو دیکھا ہے، تو میرا دل اس پر یقین رکھتا ہے کہ انشاء اللہ وعند اللہ حانث نہیں ہوگا''۔

حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ صاحبؒ کے اس یقین کی تائید حضرت حکیم الاسلام قدس سرہٗ کے شیخ، شیخ العالم حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے اس عرفانی قول و عمل سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت تھانویؒ کے مرضِ وفات میں وفات سے دو روز قبل حضرت حکیم الاسلام بغرض عیادت حسب معمول تھانہ بھون تشریف لے گئے اور حضرت حکیم الاسلامؒ کی تشریف آوری پر شدت علالت کی اس حالت میں حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ آپ کے آنے سے مجھے علالت میں خفت، بدن میں قوت اور روح میں بشاشت بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

دوسرے روز حضرت حکیم الاسلام نے، ایک روز بعد دارالعلوم میں مجلس شوریٰ کے اجلاس کی وجہ سے واپسی کا ارادہ حضرت سے ظاہر فرمایا، اور بعد فجر واپسی کی اجازت خواہی کے لیے حضرت کے دولت کدہ پر تشریف لے گئے۔ جہاں مولانا شبیر علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے، حضرت مہتمم صاحبؒ نے عرض کیا کہ حضرت آپ کے پاس سے جانے کو جی تو نہیں چاہتا لیکن کل مجلس شوریٰ ہے اس کی وجہ سے جانا بھی ضروری ہے، اس لیے میں بطیّب خاطر نہیں بلکہ بضیق خاطر واپسی کی اجازت لینے کے لیے حاضر ہوا ہوں، یہ سن کر حضرتؒ نے قریب آنے کا اشارہ فرمایا۔ اور فرمایا کہ مجلس شوریٰ کی وجہ سے جانا بھی ضروری ہے، گو میرا دل بھی آپ کو واپسی کی اجازت دینے کے لیے نہیں چاہ رہا ہے، اور پھر حضرت حکیم الاسلام کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوما، پھر آنکھوں سے لگایا، پھر سر پر رکھا جس سے حکیم الاسلام غیر معمولی طور پر محجوب بھی ہو رہے تھے اور آبدیدہ بھی۔ پھر حضرت تھانویؒ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ میرا وقت اخیر ہے۔ یہ ہاتھ میں نے اس لیے چوما اور قلب و دماغ پر لگایا کہ اس ہاتھ کے لگانے سے مجھے

حضرت اقدس نانوتویؒ حضرت مولانا محمد احمدؒ حضرت شیخ الہندؒ حضرت گنگوہیؒ اور جماعت کے تمام بزرگوں کی جامع نسبتوں کی برکات اور غیر معمولی سکینت قلب حاصل ہوئی اللہ رب العزت نے آپ کی ذات میں ان تمام نسبتوں کو جمع فرمادیا ہے اور اس وقت جو بھی حضرات وہاں موجود تھے سب پر گریہ طاری تھا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ اس واقعہ کو بیان فرماتے وقت آبدیدہ ہو کر فرمایا کرتے تھے کہ حضرت اقدس تھانویؒ کے اس مشفقانہ عمل کو میں اپنے لیے عظیم سعادت، عظیم شہادت اور وسیلۂ مغفرت سمجھتا ہوں۔

حضرت حکیم الاسلام کے علمی کمالات، عرفانی رفعت اور نسبتوں کی جامعیت پر یہ واقعہ ایک تاریخ ساز شہادت ہے، اور اس کی توثیق مزید اشد بلاءً الانبیاء ثم الامثل فالامثل کے مطابق، تاریخ دارالعلوم کا ہائلۂ کبریٰ ہے کہ جس پر صبر، سکوت اور استغناء کی وہ عظیم مثال قائم فرما کر حضرت حکیم الاسلامؒ دنیا سے تشریف لے گئے کہ تاریخ جماعت اکابرؒ میں اس کی کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ عزم و عزیمتِ مثالی کے ساتھ بتوفیق الٰہی انہی صفاتِ عرفانی کو ''وقف دارالعلوم دیوبند'' کی بنیادوں پر شامل فرما کر گئے ہیں، اس لیے وقف دارالعلوم کا اصل اور حقیقی سرمایہ یہی ہے کہ جس کی بحمد اللہ تعالیٰ ''خدام وقف دارالعلوم دیوبند'' اپنی بساط کے بقدر روزِ اوّل سے تاحال تمام بزرگان جماعت کی امانت قرار دے کر بدل وجان حفاظت کر رہے ہیں اور انشاء اللہ کرتے رہیں گے۔ اور عالمی پیمانے پر اسی کا یہ شاید نتیجہ اہل علم و بصیرت کے سامنے ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا قدیم ''وبلند معیار تعلیم'' عرفانی ذوق، تحفظ مسلک، اور طرز وطریق اکابرؒ کی مکمل رعایت ''وقف دارالعلوم دیوبند'' میں پورے اہتمام کے ساتھ الحمد للہ باقی اور محفوظ ہے۔

اللہ تعالیٰ وقف دارالعلوم دیوبند کے علمی فیضان کو نسبت عرفانی قاسمی ورشیدی کے ساتھ عالمگیر پیمانے پر دوام واستمرار عطا فرمائے۔ (آمین)

حکیم الاسلامؒ کی یاد

حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیری مدظلہ
شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم وقف دیوبند

دنوں کو گذرتے دیر نہیں لگتی حالاں کہ سانحہ وفات پر چند سال بیتنے کو آئے ہیں تاہم محسوس ایسا ہوتا ہے کہ کل ہی کی بات ہے، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سروقد، آتش بہ رخسار، نفیس پوشاک میں ملبوس دار العلوم کے دفتر اہتمام کے زینے پر لپک کر چڑھ رہے ہیں، آہستہ خرام بلکہ محوِ خرام کا انداز رفتار تو کبھی نہیں دیکھنے میں آیا بلکہ ایک بھرپور نوجوان کی تصویر بنے ہوئے تقریباً دوڑ کر چلنے کے عادی تھے، سر پر ریشم سے زیادہ نرم بال، سیاہ گھنی ڈاڑھی سفید چہرہ پر گویا کہ چاند کے ارد گرد ہالہ، معصومیت کا پیکر، لطیف المزاج، اس قدر نفیس کہ انشاء کے اس شعر کے واقعی مصداق ؎

نزاکت اس گلِ رعناء کی دیکھیو انشاء ❁ نسیمِ صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

خطابت کے تاجدار، لطائف کی انسائیکلوپیڈیا، اکابر کے واقعات وقصص کی قاموس، باہوش منتظم، فہیم، دانشور، زبان شکر وقند، تقریر سحر ہلال، تحریر حکمتِ قاسمی کا مرقع، جس میں اپنی ذہانت کا رس گھولتے، دل آزاری سے نفور، دل داری کے خوگر، جسور وغیور، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے یہ شگفتہ وشستہ انسان دار العلوم دیوبند کے حادثہ کے نتیجہ میں مرقع عبرت بن گیا، خاتمہ عمر پر تو صرف استخواں تھے ساری زندگی شجر وطوبیٰ کی حیثیت سے گذاری، جس کے گھنے سایہ میں حریف وحلیف، دوست ودشمن نے عافیت وراحت پائی اور پھر اسی سایہ دار درخت کو پیہم صدمات سے سکھا دیا بلکہ جلا دیا، جس پر وہ زبان حال سے یہ کہتے ہوئے دنیا سے اٹھ گئے ؎

نہ پوچھ حال مرا دوہ چوب خشک صحرا ہو ❁ لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا

یعقوب علیہ السلام نے انما اشکوبثی وحزنی الی اللہ کی دھیمی دھیمی صدا بلند کی، ایوب علیہ السلام نے رب انی مسنی الضروانت ارحم الراحمین کا ورد کیا، آدم ثانی سیدنا نوح نے رب لاتذرعلی الارض من الکافرین دیارا کا نعرہ لگا کر ظالمین کی صفوں کو درہم برہم کردیا مگر یہ انسان عجیب وغریب تھا جس کی زبان پر نہ رنجوری کا شکوہ نہ دشمنوں کے لیے دعا بد، نہ خلوتوں میں اپنے خدائے قہار کے سامنے بداندیشوں کی شکایت، بلکہ صبر ورضا کا پیکر، سکوت کالق ودق صحرا، سوز وساز کا خاموش دریا بن کر اپنے قلب پر آلام واحزان کا بوجھ لیے ہوئے دنیا سے چل دیے، فانا للہ وانا الیہ راجعون، ان کی بوقلموں شخصیت رنگ برنگ صفات کی مظہر تھی، لیکن خلوت ہو یا جلوت، تحریر ہو یا تقریر، سب پر علم ودانش کا رنگ غالب تھا، خطبات چھپ کر ہاتھوں ہاتھ اٹھ گئے بلکہ مالی منفعت حاصل کرنے میں وہ ضمیر فروش تاجر بھی پیچھے نہ رہے جو مرحوم کی زندگی میں گستاخ وحریف رہ چکے تھے۔ اس ستم ظریفی پر علیین سے ان کی روح کہتی ہوگی۔ ے

خدا کا شکر ہے مرنے کے بعد قدر جانی ۞ خدا کا شکر ہے کہ مردہ مرا پسند ہوا

۞۞۞

حکیم الاسلامؒ کا نقش جمیل

از: حضرت مولانا عبدالرشید صاحب محمود گنگوہیؒ
نبیرہ فقیہ الامت حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ

ہفت روزہ خدام الدین، لاہور (پاکستان)

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ۔ مکرما سلیل الکرام البررۃ سالم اسلم اعظم سلمہم اللہ۔

آہ! مولانا قاری محمد طیبؒ رہ گزر آخرت ہوگئے۔ ہونا ہی تھا نہ کوئی نئی بات ہے نہ غیر متوقع حادثہ، مگر دلوں کی دنیا اور یادوں کی بستی سے ان کا نقش جمیل مٹ جانا ممکن نہیں۔ وہ باقیات صالحات سے بھی تھے اور وجعلھا کلمۃ باقیۃ فی عقبہ ان کی زندگی اور زبان یہی تھی۔ ان کی شیریں زبانی شگفتہ بیانی صورت نورانی، ہوش مندی وفکرار جمندی ذہن اور دردمندی دل کو کون بھلاسکتا ہے، دوائر علمیہ میں ان کی جامعیت۔ علوم وافکار کا تنوع، تبحر، ادبی ذوق خوبی تعبیر، حسین وبدیع ترجمانی، مجامع میں خطاب گویا فلک اعلیٰ سے اذا تکلم تخیل الینا انہ یوید کا سا کیف، حکمت ربانیہ ولی اللہی بھی ابن جوزی کی سی سحر انگیزی بھی کس صاحب ذوق جوہر شناس کو رہ رہ کر یاد نہ آئے گی۔

عجزت النساء ان یلدن مثل طیب اب وہ کوہ کن کی بات کوہ کن کے ساتھ کس کس نادرۂ اور خلیقہ پر تعجب کریں۔ زبان ایسی کہ سب سمجھیں، بیان ایسا کہ دل مانے عقل کی پاسبانی بھی۔ "لیکن کہیں کہیں اسے تنہا بھی چھوڑ دے" کے سے افکار بھی دلائل عقلی بھی، نقلی بھی جدل عدل بھی انفسی آفاقی بھی اور حقائق ومعرفت، آگیں بھی۔ میں نے مجلس سے اٹھتے ہوئے اکثر لوگوں کو کہتے ہوئے سنا۔

عالم کیا ہے ایک دریا ہے عجیب ناالغیط ...

آہ! آخر وہ وقت آگیا ع

عشية قيل طيب ليس فينا

انہی کا یہ شعر ہے ؎

خوگرِ عیش وطرب اب آہ اپنا دل نہیں ۞ اے تماشا گاہِ عالم بس تجھے آداب ہے

بے شمار محاسن ومکارم اور مناقب ومحامد کے ساتھ ان کی طبع لین، علم وفضل سے معمور، سیرت، معاملات ومعاشرت میں ستھرا، بے عیب متوازن کیریکٹر، جدال ومراء سے تنفر، غیر متصادم مزاج۔

"(بھائی میں لڑنا نہیں چاہتا لڑنا میری افتاد نہیں)" اہم امور وحوادث میں ان کی ایسی رواداری کہ بعض اشخاص کو تداہن وتہاون کا شبہ ہوجائے مگر سچ پوچھئے تو وہ مساحت تھی نہ مداہنت۔ یہ الطاف خداوندی اس تبرِمۃ پر مثال تھے۔ اب کون ہے جو اس کا دعویٰ کر سکے۔ ہاں مگر بشری اقسام کا انفکاک بھی ممکن نہیں۔ ممکن کبھی اس سے مامون نہیں ہوسکتا۔ الا لقوم الخاسرون۔

اخیر کے چند سال جس ضیق خلجان اور ذہنی انتشار کے گزرے بجز اس کے کیا کہا جاوے کہ وکان امر الله قدراً مقدوراً۔

اللہ تعالیٰ ان کو کفارہ سیآت بنادے۔ یہ ابتلاءِ عام ہے۔ عوام اور علماء حسب حالات سب ان میں مبتلا ہیں۔ بقول مولانا ندوی مسلمانوں سے اجتماعی کام کی صلاحیت اٹھتی جارہی ہے۔ ارتفاقی مزاج کم ہورہا ہے۔ کون تبریہ کرسکتا ہے۔ الانبیاء اشد بلاء فالامثل۔ مگر اس شخصیت کے خدوخال وجمال محبوبی میں ان کا محسوس ہونا ناگزیر تھا۔ پھر ہوا جو کچھ ہوا۔ اور کہا گیا جو نہ کہنا تھا حق بھی ناحق بھی۔ حدود کے اندر بھی، تجاوز بھی۔ اخلاص سے حق کہا گیا کہنے والا ماجور۔ ناحق اور حدود سے متجاوز کہا گیا۔ تو اس کی شکایت ہی کیا ؎

مانجیٰ الله والرسول معاً ۞ من لسان الوریٰ فکیف انا

اب تعزیۃ آپ کے متعلقین، پسماندگان سے وہی کہتا ہوں جو ایک بدوی نے حضرت ابن عباسؓ سے ان کی وفات پر کہا تھا کہ ؎

آپ کو عباسؓ سے بہتر ان کی وفات کا اجر مل گیا۔ اور عباسؓ کو آپ سے بہتر اللہ اور لقاءِ رب میسر ہو گیا۔ زیادہ موجب تاسف و تالم یہ مضمون ہے۔

خیرٌ من العباس اجوك بعدهٗ ❁ والله خیرٌ منك للعباس

ورنہ ویسے تو یہ قانون ہے۔ اب عالم آخر کہاں کب، اللہ جانے۔ البتہ اس دعا کی ضرورت ہے ؎

اِذا مات العالم ثلمة فی الاسلام لایسدها الا عالم آخر.

نزلنا ساعة ثم ارتحلنا ❁ كذا لدنيا رجالٌ فارتحلنا

قرب الرجال الیٰ دیار الآخرة ❁ فاجعل الهی خیر عمری اخرة

اخیر میں ایک بات اور کہنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ حضرات اگر محسوس نہ کریں اور حق دیں بہر کیف مجھے نصیحت کی عزت حاصل ہے اس میں اسن ہوں سن و سال کا تفاوت بالکل غیر معتبر بھی نہیں کہ اس حدیث کو سامنے رکھیں۔

انا امنةٌ لاصحابی فاذا ذهبتُ الیّ اصحابی مایوعدون واصحابی اَمنةٌ لامتی فاذا ذهبت اصحابی الٰی امتی مایوعدون.

بڑوں کا اٹھنا حرمان تو ہے ہی پیش آنے والے خطرات کا ارہاص بھی ہے اب تک جانے کتنے فتنے رُکے ہوں گے۔ انابت و استعاذت کی ضرورت ہے۔

یہ خط ختم کر چکا تھا کہ لکھنؤ کے کچھ حضرات اور ایک قاری اسلم نامی تشریف لے آئے۔ دفعتہً نصف صدی قبل کا واقعہ ذہنی اسکرین پر ابھرا۔ میرے حضرت والد صاحبؒ علیل ہو کر شفایاب ہوئے تھے۔ دیوبند سے ایک بڑا مجمع حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب، مولانا اعزاز علی صاحبؒ، حضرت علامہ ابراہیم صاحبؒ اور حضرت سید اصغر حسین میاں صاحبؒ وغیرہ مزاج پرسی کو تشریف لائے۔ مولانا محمد طیب ۲۵ رسالہ بھی ساتھ تھے۔ بعد مغرب کا وقت تھا۔ حضرت حکیم صاحبؒ نے فرمایا طیب ایک رکوع سناؤ یاد ہے۔ ولقد خلقنا الانسان ونعلم ماتوسوس به نفسه الی آخرہ سنایا۔ سماں بندھ گیا۔ آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ میرے

کانوں نے یہ خوش لحنی عمر میں پہلی مرتبہ سنی تھی، ساز بھی سوز بھی۔ دل گداز بھی نغمہائے دلکش سحاب اندر سحاب بھی۔ یہ پہلا نقش تھا جو آج بھی تازہ ہے۔ اس کے بعد دیوبند پہنچ کر تو بارہا سنی۔ جہری نمازوں میں بھی اکثر جب وہ ہوتے امامت وہی کرتے۔ جس کا لحن بھی لحن طیبی سے کچھ مشابہ ہوتا۔ میں تاثر لیتا۔ اب برسوں سے اس کی نوبت نہیں آئی تھی کہ کچھ سنتا۔ مولانا کہولت سے گزر کر شیخوخت کی منزل میں آگئے تھے۔ لحنیت اور گلے کے گھنگرو اپنا زیرو بم ختم کر چکے تھے۔

پرسوں یہ لکھنوی حضرات اور قاری اسلم ندوی آئے میں نے کچھ سنانے کی فرمائش کی۔ برائے نام کچھ تشابہ تھا یا ذہن نے محسوس کیا قریب تھا کہ دل اور آنکھیں بے قابو ہو جائیں۔ بند و ضبط ٹوٹ جائے۔ قراءتِ طیب یاد آ گئی۔ اوپر سے یہ حادثہ سن ہی چکا تھا۔ عشية قيل طيب ليس فينا۔ آج وہ نہیں ہیں وہ عصر ختم ہو گیا۔ دیوبند کا زمانہ قیام اپنا قیام، اکابر کا مجمع۔ مولانا محمد طیب کا حسین سراپا۔ ان کی لحنیت، طیب سب کی آنکھ کا تارا تھے۔ ان کی نسبت، حضرت مہتمم سلالہ قاسم الخیرات کے بیٹے ہونا ذاتی جمال و کمال مکارم، خوش کلامی، خوش خطابی، خوش تعبیری مضامین خوش نوائی لحن۔ لباس و تلبس تک میں گونہ تزئین جمال امتزاج اور رنگ علمی مذاکرہ میں نوالی انداز۔ جمال بھی کمال بھی نوال بھی۔ مگر جلال نہیں (بہ مفہوم عرفی) ورنہ زندگی کے سب پہلو جلالت کے شاہدِ عدل اور فخامت کے غماز جو بعد میں ایسے نمایاں ہوئے کہ فخر اماثل کہے گئے۔ یہ ہرگز نہ اطراء ماوح تھا نہ مبالغہ۔ اللہ ان کی گور کو اپنے انوار سے معمور فرمائے۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کے بعد سے بہ ظاہر مداح و معتقدین سے زیادہ مجھے ان کے اوصافِ ذکیہ پر اطلاع ہے۔ مجھے بہت سے زمان و مکان واقعات و احوال میں ان سے اور ان کا قرب رہا ہے۔ سفر میں حضر میں، حج میں۔ ایک ہفتہ ہونے کو آیا۔ ان کا نقش جمیل پر کس کس نوع وجہت سے ابھر کر نہیں آیا۔ ان کی جوانی، بڑھاپا، کہولت ان کے اقوال، افکار، رفتار، مجالس وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ اب اللہ ان کو احیار امت کی انجمن

میں جگہ دے۔ اور یہ ان کی صحبت کبھی منتہی نہ ہو۔ دل بھی چاہتا ہے کہ بس یہی ذکر کرتا رہا ہوں۔ کوئی ذکر کرتا ہے تو میں گویا اس کے منہ سے نوالہ چھین لیتا ہوں اور خود بات کرنے لگتا ہوں بار بار خیال ہوتا ہے کہ کہاں کس حال میں ہوں گے نہ قاصد ہے نہ سفیر ہے نہ مرغ نامہ بَر ہے۔ کن کن اخیار و آباء صالحین سے ملاقات ہو رہی ہوگی۔ کوئی بے قاعدگی ہوئی بھی ہوگی تو وہ یعفوعن کثیر ہے اور اس کا کثیر تو کل ہی ہے۔ سب محو کر دے گا۔

کتنی شہادات ان کے لیے ہوں گی۔ جنازہ پر آنے والے شہدا ہی ہیں۔ کتنوں نے عقیدت سے زندگی میں مصافحہ کیا ہوگا۔ انتم شهداء الله في الارض۔ کتنوں نے ان کے محققانہ خطاب سے شہادتِ حق سنی ہوگی۔ اور خود ان کے لیے شہادت دی ہوگی۔

خطہ ہائے ارض میں کون سا مقام ہے جہاں انھوں نے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اور بات نہ کہی ہوگی۔ ایشیاء، یوروپ، مغربِ اقصیٰ مشرقِ وسطیٰ سب ان کے اعمال نامہ میں مکتوب و محفوظ ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کو صبر دے، اجر دے، حادثہ کی اہمیت ناقابلِ انکار ایسی شخصیت کا فقدان ناقابلِ تلافی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ماخوذ ماہ نامہ الرشید صفر، ۱۴۰۴ھ

(ہفت روزہ خدام الدین لاہور)

❁❁❁

الوداع

حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

حضرت مولانا مفتی محمد اشرف سعودی صاحب/مہتمم سبیل الرشاد بنگلور

اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے، جس نے ہمیں پریشان کن حالات میں اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ کا حکم دیا اور اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ. کی بشارت سنا کر ہماری ڈھارس بندھائی۔

درود وسلام ہو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو خاتم النّبیین ہیں۔ رحمۃ اللعالمین بھی اور بالمومنین اور رؤف رحیم بھی کہ آپ نے صاحبزادہ حضرت ابراہیم کے انتقال پُر ملال پر اِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ (ابراہیم! ہم تمھاری جدائی سے غمگین ہیں) فرمایا کہ ضعفاء امت کو تھاما۔ سہولت وآسانی کی راہ پیدا کی اور تسلی خاطر اور اطمینان قلب کا نسخۂ کیمیا عطا فرمایا۔

ہم اس عظیم المناک حادثے پر جو بتاریخ ۶ر شوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء بروز یکشنبہ صبح گیارہ بج کر دس منٹ پر حکیم الاسلام حضرت علامہ مولانا قاری محمد طیبؒ کی وفات حسرت آیات کی شکل میں پیش آیا۔ خدائے رحمٰن ورحیم سے توفیق صبر مانگتے ہیں اور اسوۂ حسنہ کا اتباع کرتے ہوئے حضرت حکیم الاسلام ہی سے اپنا صدمۂ فراق بیان کرتے ہیں۔

حضرت والا! کیسے یقین کرلیں کہ آپ نے ہم نیازمندوں سے منھ پھیرلیا۔ نورِ معرفت سے روشن اور تابناک آنکھیں بند فرمالیں، علم وحکمت کے موتی برسانے والی زبان پر مہر سکوت ثبت فرمادی۔ ہمارے سروں پر سے اپنا دستِ شفقت اٹھالیا۔

اپنے الطاف وعنایات کا وسیع دامن سمیٹ لیا۔ ہم سے کنارہ کشی اختیار فرمالی۔ گوشۂ تنہائی آپ کو پسند آ گیا۔ اور بڑی خاموشی کے ساتھ آپ ہماری مشتاق اور بے چین نگاہوں سے مستور ہو گئے۔ اِنَّ لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ. اَنْتُمْ لَنَا سَلَفٌ وَنَحْنُ لَکُمْ خَلَفٌ وَاِنَّا اِنْشَآءَ اللّٰہُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ.

حکیم الاسلام! آپ علم وحکمت کا چمکتا ہوا چاند تھے، جس کی خنک اور ٹھنڈی چاندنی ہزاروں کے لیے وجہ سکون اور سامانِ قرار تھی۔ کسی بھی محفل میں آپ قدم رنجہ فرماتے تو واقعی ایسا محسوس ہوتا کہ ماہتاب علم وحکمت طلوع کر رہا ہے، چادرِ مہتاب پھیلتی چلی جا رہی ہے اور دل ودماغ سکون وطمانیت کی ایسی لطیف کیفیات سے آسودہ ہوتے چلے جاتے جن کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا، اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ آپ حکیم الاسلام تھے، خطیب الاسلام تھے، فخر الاماثل تھے زبدة الافاضل تے ——— عظیم المرتبت تھے، رفیع المنزلت تھے، رئیس المتکلمین تھے سلطان الواعظین تھے میر کارواں تھے، پیر رہرواں تھے، سالارِ قافلہ تھے، سرخیل طائفہ تھے یادگارِ سلف تھے، تاجدارِ خلف تھے، بزرگوں کی آبرو تھے، خردوں کی آرزو تھے، چشم وچراغِ خاندان قاسمی تھے، گل سرسبدِ چمنستان تھانویؒ تھے، ملتِ اسلامیہ کی شان تھے، جماعتِ علماء کی آن تھے ——— اللہ رب العزت نے آپ کو اتنے اوصافِ عالیہ سے نوازا تھا، اور آپ کی ذات بابرکات میں اتنے کمالات ودیعت فرمادیے تھے کہ ہر خطاب آپ پر جچتا تھا اور ہر لقب آپ کی کلاہِ افتخار میں نگینے کی طرح جڑ جاتا تھا۔

بظل جلیل: لوگ کہتے ہیں کہ آپ بڑے نرم مزاج اور نرم گفتار تھے۔ اس میں کیا شک ہے؟ یہ امر واقعہ ہے کہ آپ خلق ومروت، تواضع وانکساری، حلم وبردباری اور نرم روی ونرم گفتاری کا حسین وجمیل پیکر تھے۔ جو بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا وہ آپ کی خوش اخلاقی وخوش گفتاری کی لطیف شبنم میں ضرور بھیگا ——— لیکن اس

نرم دم گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ آپ گرم دم جستجو نہیں تھے ـــــــ آپ کی یک رخی اور غلط تصویر کشی ہوگی۔ بے وقت کا راگ چھیڑنا، بے محل شور مچانا اور خواہ مخواہ کی زور آزمائیوں میں لگنا یقیناً آپ کا وطیرہ اور شیوہ نہیں رہا، لیکن وقت پڑنے پر آپ نے جس جرأت و ہمت، بے باکی و بے خوفی، حمیتِ ملی، غیرتِ قومی، جوشِ اسلامی اور جلالِ ایمانی کا اظہار فرمایا وہ اس بات کا بین ثبوت تھا کہ آپ اپنے نرم قالب میں ولولوں اور حوصلوں سے بھرپور اور بڑا مضبوط اور قوی قلب رکھتے تھے اور رزم گاہِ حق و باطل میں بے دریغ نبرد آزما ہو سکتے تھے چناں چہ تحفظ دین و شریعت کے سلسلہ میں حکومتِ وقت کے خلاف سب سے پہلے آپ ہی نے آواز بلند کی اور پھر آپ ہی کی زیرِ صدارت بمبئی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء کنونشن عظیم الشان پیمانے پر منعقد ہوا کرسی صدارت پر رونق افروز ہو کر آپ نے جو معرکۃ الآراء خطبہ دیا اور اربابِ اقتدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جس واشگاف انداز میں گفتگو فرمائی وہ بے مثال لازوال اور آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

آپ نے کس بلند آہنگی کے ساتھ فرمایا:

آج پرسنل لاء کے نام پر ان تبدیلیوں کا مواد بنام اصلاح و ترمیم پیش کیا جا رہا ہے ـــــ یہ اصلاح اسی قسم کی ہے جسے قرنِ اوّل کے منافقین اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ کے نعرے کے ساتھ لے کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن عالم الغیب والشہادۃ نے کھلا اعلان فرما دیا: اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ"۔

مجھے اس وقت ایک سخت لفظ کہنے پر معاف کیجئے کہ وہ سماج کتنا دیوث ہے جو لاکھوں ماؤں بہنوں بیٹیوں کو بازار میں بیٹھنے کی اجازت دیتا ہے اور چار شادیوں کی محض اجازت اور وہ بھی خاص شرائط عدل و دیانت سے مشروط اجازت پر اعتراض کرتا ہے"۔

جس ملک میں راتوں کے کلب ہوں۔ مادرِ وطن کی بیٹیوں کے بدن سے عفت وعصمت کا لباس رات بھر اتار کر تار تار کیا جا رہا ہو اور خدا کے غضب سے حکومت اور سماج بے نیاز ہو۔ ایسے ملک کے چند ایسے سر پھرے مصلحین کو مسلم پرسنل لاء کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے سو بار خود شرمانا چاہیے تھا جنھیں بے شرم سماج کو ٹوکنے تک کی بھی ہمت نہیں۔ ان میں اسلام کے فطری اور اعلیٰ وارفع قانون عصمت پر حرف زنی کرنے کی ہمت آخر کہاں سے پیدا ہوئی''۔

بہر حال نعرہ زنوں کا انداز قد ہر لباس میں عریاں ہے، خواہ وہ آئین کا لباس پہن کر آئیں یا سماج اور معاشرہ کی اصلاح کا۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی فرد دینِ خداوندی میں ترمیم وتبدیلی کا نعرہ بزعم خود کوئی اصولی بات سمجھ کر لگا رہا ہے تو میں اس اجتماع کے موقع پر اپنے تمام علماء کرام اور دانشورانِ محترم کی طرف سے یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اپنے اس عقیدے پر اٹل ہیں کہ جس طرح خدائے بزرگ وبرتر نے اپنے نظام خلق کو اپنی سچی فطرت پر قائم کیا ہے جس میں تبدیلی ناممکن ہے کہ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ اسی طرح اس نے اپنے نظامِ امر کو بھی جس کا نام دین ہے، اپنی فطرت کی اساس پر قائم کیا ہے، اس لیے اس میں تبدیلی ممکن نہیں۔ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ '' یہ قانونِ فطرت ہے اور فطرت تبدیل نہیں ہوسکتی، اگر کوئی زمین، آسمان چاند سورج اور کواکب ونجوم کو نہیں بدل سکتا۔ صرف اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے تو دین کے کلیات وجزئیات احکام وآداب، اخلاق وعقائد معاملات ومعاشرت اور اجتماعی قوانین تک کی فطری حدود کو نہیں بدل سکتا۔ وہ صرف فائدہ اٹھانے کے لیے اتارے گئے ہیں۔ بدلنے کے لیے نہیں لائے گئے۔ بدلنے کی جب بھی سعی لاحاصل کی جائے گی تو خدائی حدود تو اپنی جگہ قائم رہیں گی لیکن بدلنے والوں کے حق میں سماج کا ڈھانچہ بکھر کر غلاظتوں اور گناہوں کا ڈھیر ہو جائے گا۔

علامہ اقبالؒ نے ایسے ہی موقع کے لیے فرمایا تھا

حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم ❁ رزمِ حق وباطل ہو تو فولاد ہے مومن

میر کارواں! آپ سے زیادہ کون اس حقیقت کو جانے گا کہ علم کا راستہ کتنا کٹھن اور دشوار ہوتا ہے، اس میں کیسی خطرناک گھاٹیاں آتی ہیں، کیسے بھیانک موڑ ملتے ہیں اور کیسے خوف ناک مرحلے درپیش ہوتے ہیں۔ قدم قدم مشکلات مصائب سدِ راہ بنتے ہیں اور جگہ جگہ عوارض وموانع کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ سفر بڑا صبر آزما اور بہت تھکا دینے والا ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر اور اولوالعزم پیغمبر نے علم ہی کا راستہ طے کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ—— ''اس سفر میں تو ہم بہت تھک گئے''۔ وَلَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا. (الکہف)

سفر کی یہی دشواریاں اور راستے کے یہی پیچ وخم ہیں جن سے گھبرا کر بہت سے عازمین سفر پہلے ہی قدم پر ارادۂ سفر ترک کر دیتے ہیں بعض کچھ آگے بڑھتے ہیں لیکن تھوڑا ہی فاصلہ طے کر کے ہمت ہار جاتے ہیں۔ بہت کم ہی جیالے اور سورما ایسے ہوتے ہیں جو مشکلاتِ راہ سے بے پرواہ آگے اور آگے چلے جاتے ہیں۔ لیلائے علم کی دُھن انھیں مسلسل رہ نوردی اور دشت پیمائی پر مجبور کرتی رہتی ہیں۔ اور جب تک وہ عروس علم سے ہم کنار نہیں ہو جاتے، سراپا اضطراب اور مجسم حرکت بنے رہتے ہیں۔

زعیم العلم! آپ ان ہی جیالوں اور سورماؤں کے رہبر وقائد تھے، آپ نے اپنے لیے اسی دشوار گذار اور صبر آزما راستے کا انتخاب فرمایا اور رَبِّ یَسِّرْ کہہ کر اس پر قدم رکھا تو پھر رکنے کا نام نہیں لیا۔ میدان علم میں بڑھے تو بڑھتے ہی چلے گئے اور کوہِ علم پر چڑھے تو چڑھتے ہی چلے گئے۔ آپ زندگی بھر جادۂ علم کے نشیب وفراز کو ہموار کرنے اور اس کے جھاڑ جھنکاڑ کو گل وگلزار بنانے میں لگے رہے۔ آپ نے اسی سنگلاخ راستے پر ایسے لالہ وسوسن اُگائے اور نسرین ونسترن کھلائے جو فردوسِ نظر بنے۔ ایسی دلنواز لے چھیڑی جو جنت گوش بنی اور علم کے متوالوں کو ایسی شرابِ طہور پلائی کہ دل ودماغ کیف وسرور کی ایک نئی دنیا سے آشنا ہوئے اور رہروانِ علم کو پتہ بھی نہ چلا کہ منزل مقصود نے کب ان کے قدم چوم لیے۔

لیکن کیا معلوم تھا کہ جن کے لیے آپ نے یہ سب کچھ کیا جن کے لیے آپ نے

اپنے دھن کی بازی لگادی، جنھوں نے آپ سے بہت کچھ پایا۔ آپ کا نام لے کر اور آپ کی نسبت بتا کر اپنی دینی و دنیوی حیثیت بنائی۔ آپ کے روبرو زانوئے تلمذ تہ کیا۔ آپ کے دستِ مبارک سے اپنے سروں پر دستارِ فضیلت بندھوائی، اپنی کتابوں پر آپ سے تقریظیں لکھوائیں، آپ کی شیریں بیانی سے اپنے جلسوں کی رونق بڑھائی، وہی آپ کے خلاف طوفان اٹھائیں گے جاں گداز آوازے اور روح فرسا طعنے کسیں گے مخالفتوں، ایذا رسانیوں، دشنام طرازیوں اور الزام تراشیوں کا ایسا شیطانی چکر چلائیں گے کہ چشم فلک حیران، اخلاق و آداب شرمسار خجل اور تہذیب و شائستگی آب آب ہو کر رہ جائیں اور اس طرح گویا حق وفاداری ادا کریں گے۔ شیخ سعدیؒ نے بہت پہلے کہا تھا۔

یا وفا خود نبود در عالم ❁ یا مگر کس دریں زمانہ نکرد
کس نیاموخت علم تیرا زمن ❁ کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد

عزیمت پناہ! آپ کے دورِ ضعیفی اور پیرانہ سالی میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آپ کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا، آپ کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے جاتے۔ آپ کی طویل اور زریں خدمات کا بھرپور اعتراف کیا جاتا۔ عقیدت و محبت کے پرُ خلوص نذرانے پیش کیے جاتے اور اعزاز و اکرام کے بلند ترین منصب پر آپ کو فائز کیا جاتا۔ اس کے برخلاف ناشکری، ناسپاسی اور احسان ناشناسی کے ایسے نفرت انگیز نظارے دکھائے گئے اور دنائتِ طبعی اور خستِ جبلی کے ایسے مکروہ مظاہرے کیے گئے کہ نبض عالم تھم تھم گئی لیکن آفریں ہے آپ کی ہمت مردانہ پر کہ ایک طرف تن تنہا آپ کی نحیف و نزار ذات اور دوسری طرف ہر قسم کے اسلحوں اور ہتھیاروں سے لیس بھیانک لشکر لیکن آپ نے سپر نہیں ڈالی، ہار نہیں مانی، جان سے جانا گوارا فرمالیا لیکن آن نہیں چھوڑی، بلاشبہ آپ نے عین میدانِ جنگ میں جان دی ہے اور علم کے راستے میں آپ نے جام شہادت نوش فرمایا ہے۔

حکیم الاسلام! ہدیہ مبارک باد قبول فرمایئے۔ آپ شہیدِ علم بنے، بیشک شہیدِ علم! ؎

جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر ❁ عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ❁ ہر مدعی کے واسطے دارورسن کہاں

ممکن ہے کہ بعض نافہم بغلین بجائیں اوران کی کوتاہ بینی اور کم نگہی اس میں اپنی کامیابی کا سراب دیکھے لیکن دنیا جانتی ہے کہ سنگ ریزوں اور جواہر پاروں کا کوئی مقابلہ نہیں۔ بے قیمت پتھر سونے کے قیمتی پیالے کو چکنا چور کرسکتا ہے لیکن اس دنیا پر نہ پتھر قیمتی بن سکتا ہے اور نہ سونا بے قیمت اسی جہاں دیدہ اور سرد وگرم چشیدہ سعدی نے کہا تھا۔

سنگ بدگوہر کاسۂ زریں شکند ❁ قیمت سنگ نیفزائد وزرکم نہ شود

حلیم الطبع آپ نے ٹھیک ہی کیا۔ آخر آپ کب تک ان حالات میں ہمارے درمیان رہتے۔ صبر وتحمل کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور جذبات، ضبط وبرداشت بھی لامتناہی نہیں ہوتے حلم وبُردباری کے پیالے کو ایک دن چھلکنا ہی تھا وہ چھلکا اور آپ نے رختِ سفر باندھ لیا۔

فروغِ بزم! آپ کیا تشریف لے گئے، پوری محفل بے نور اور بے رونق ہوگئی دانش وحکمت کا قصر درخشاں شب گزیدہ ہے اور اندھیروں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ وہ عزت وآبرو داستانِ پارینہ بن گئی۔ جو آپ کی رہین منت تھی۔ عظمت وقار اور تفوق وبرتری کا وہ شاندار محل زمین بوس ہوگیا جو آپ کے دم قدم سے سرفراز تھا۔ آپ کی شان تو وہ تھی کہ جب آپ کسی علاقے کا سفر فرماتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی فرمانروا اپنی قلم رو کا دورہ کررہا ہے۔ اور آپ کے بعد اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے ع

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

علوم ومعارف کا لہلہاتا چمن خزاں رسیدہ ہے اور اپنے بوڑھے مالی کو رورہا ہے خوب صورت روشیں پامال اور دل کش کیاریاں خاک بسر ہیں۔ پتہ پتہ سوگوار اور ڈالی ڈالی بے قرار ہے، ہر غنچہ گریاں اور ہر پھول ماتم کناں ہے۔ گوشے گوشے سے سسکیوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ آہوں کا دھواں اٹھ رہا ہے اور پوری فضا پر غبار الم چھاتا چلا جارہا ہے۔

لطیف المزاج! اب آپ دور پہنچ گئے ناروا گستاخیوں اور بے جا جسارتوں سے بہت دور، ظالمانہ حملوں اور سنگ دلانہ یورشوں سے بہت پرے حاسدوں اور معاندوں کی

رسائی اب آپ کے حریم ناز تک نہیں ہوسکتی۔ اب آپ اطمینان وسکون کے ساتھ سو رہے ہیں اور دائمی راحت وآرام کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ مبارک ہو آپ کو بستر گل اور پھولوں کی سیج۔ مبارک ہو آپ کو نومۃ العروس اور سکھ کی نیند، لیکن خدارا یہ بتائیے کہ آپ کے پسماندگان خصوصاً مولانا محمد سالم، مولانا محمد اسلم، مولانا محمد اعظم اور ہزاروں عقیدت مندوں اور ارادات مندوں کے سینوں میں آپ کے اس طرح چلے جانے سے حسرت ویاس کا جو گہرا داغ اور کاری زخم لگا وہ کیسے مٹے گا، وہ کیسے مٹے گا وہ کیسے مٹے گا؟

ارحم الراحمین! حضرت حکیم الاسلامؒ کو پوری ملتِ اسلامیہ کی طرف سے بہترین جزا عطا فرما! ان کے درجات ومراتب کو بلند سے بلند فرما اور انھیں جنت الفردوس کا اعلیٰ مقام نصیب فرما۔ آمین۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے ❁ سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

❁❁❁

اسلاف کی آخری یادگار

(از: شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ

یہ دل گداز خبر اب تک پرانی ہو چکی ہو گی کہ دار العلوم دیو بند میں سلف کی آخری یادگار حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ہمیں داغِ مفارقت دے کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ لیکن اس سانحے کی ٹیس نہ جانے کب تک دلوں میں تازہ رہے گی۔ اس لیے کہ یہ صرف کسی ایک شخص کی وفات نہیں۔ یہ ایک پورے عہد کا۔ اس کے مزاج و مذاق کا اور اس کی دلآویز خصوصیات کا خاتمہ ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن.

وما کان قیس هلکه هلك واحد ۞ ولکنه بنیان قـوم تهـدّمـا

حضرت قاری صاحبؒ کی ذاتِ گرامی اور دار العلوم دیو بند کے اس بابرکت دَور کی دل کش یادگار تھی جس نے حضرت شیخ الہند۔ حضرت تھانویؒ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری اور ان جیسے دوسرے حضرات کا جلوۂ جہاں آرا دیکھا تھا۔ جس ہستی کی تعلیم و تربیت میں علم و عمل کے ان مجسم پیکروں نے حصہ لیا ہو۔ اس کے اوصاف و کمالات کا ٹھیک ٹھیک ادراک بھی ہم جیسوں کے لیے مشکل ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ کے پیکر میں معصومیت حسنِ اخلاق اور علم و عمل کے جو نمونے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں ان کے نقوش دل و دماغ سے محو نہیں ہو سکتے۔

احقر کے والد ماجد مفتی اعظم پاکستان قدس سرہ اور حضرت قاری صاحب قدس سرہ بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھ اور زندگی کے ہر مرحلے میں ایک دوسرے کے رفیق رہے۔ دونوں نے دار العلوم دیو بند میں ایک ساتھ پڑھا۔ ساتھ فارغ ہوئے۔ ساتھ ہی پڑھانا شروع کیا۔ دونوں ایک ہی وقت میں حضرت شیخ الہندؒ کے دستِ مبارک پر بیعت ہوئے۔ اور پھر حضرت کی وفات کے بعد ایک ہی ساتھ تھانہ بھون حاضر ہو کر حکیم الامت

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ اور تقریباً ساتھ ہی ساتھ دونوں کو حضرت تھانویؒ کی طرف سے خلافت عطا ہوئی۔

۱۳۴۵ھ میں سب سے پہلا حج بھی دونوں نے ساتھ کیا، غرض ظاہری تعلیم اور باطنی تربیت سے لے کر سیر و تفریح تک ہر چیز میں دونوں کی رفاقت مثالی تھی۔ پھر جب قیام پاکستان کی تحریک شروع ہوئی اور آزادی ہند کے طریق کار سے متعلق علماء دیوبند کے درمیان اختلاف رونما ہوا تو حضرت والد صاحبؒ کی طرح حضرت قاری صاحبؒ کا نقطۂ نظر بھی حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کی رائے کی طرف مائل تھا۔ لیکن حضرت قاری صاحب نے اپنے آپ کو عملی سیاست سے بالکلیہ یک سو کر کے ہمہ تن دارالعلوم دیوبند کی خدمت کے لیے وقف کیا ہوا تھا۔ اس لیے یہ نقطۂ نظر اسٹیج پر نہ آسکا۔ حضرت والد صاحبؒ قیام پاکستان کے بعد یہاں تشریف لے آئے۔ اور حضرت قاری صاحب کے لیے دارالعلوم دیوبند کی گراں بار ذمہ داری کے پیش نظر دیوبند چھوڑنے کا سوال ہی نہ تھا، لیکن یہ بات میں نے حضرت قاری صاحب سے بارہا سنی کہ جس روز حضرت مفتی صاحب دیوبند سے پاکستان کے لیے روانہ ہوئے اس روز میں دن بھر روتا رہا۔

آپ نے حضرت والد صاحب کی وفات پر جو تعزیتی مکتوب ارسال فرمایا اس میں بھی لکھا تھا کہ:

> ''تقسیم ملک کے بعد جب آپ نے پاکستانی قومیت اختیار فرمائی اور یہاں سے ہجرت فرما کر پاکستان تشریف لے گئے تو میں مرنے والے کے لیے بھی اتنا کبھی نہیں رویا تھا جتنا آپ کے فراق پر رویا۔ یہ حالت دیکھ کر سب گھر والے بھی پریشان ہو گئے تھے کہ آخر کیا حادثہ پیش آگیا جو اتنا گریہ طاری ہے۔ یہ تعلق کی بناء پر تھا کہ ابتدائے عہد سے ہم رفیق رہے تھے''۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر: ص: ۳۰)

اس کے بعد وہ ہمہ وقتی رفاقت چھوٹ گئی۔ لیکن قلب و روح کا رشتہ کسی مرحلہ پر نہ

ٹوٹا۔قیام پاکستان کے بعد بار ہا حضرت قاری صاحبؒ کراچی تشریف لائے اور یہ ممکن نہیں تھا کہ کراچی تشریف لانے کے بعد آپ دارالعلوم تشریف نہ لائیں۔ چناں چہ ہر بار خدام دارالعلوم کراچی کو اپنی شفقتوں سے بہرہ ور فرماتے۔طلباء اور اساتذہ سے خطاب بھی ہوتا۔اور پھر حضرت والد صاحبؒ اور ان کے درمیان جو باغ و بہار مجلس ہوتی اس میں علمی تبادلۂ خیال کے علاوہ ماضی کے تذکرے، زمانہ طالب علمی کی یادیں، اساتذہ کے واقعات اور نہ جانے کتنے موضوعات پر گفتگو ہوتی اور ہم خدام کو افادات کا نہ جانے کتنا خزانہ ہاتھ آجاتا۔

حضرت قاری صاحبؒ کی وفات بلاشبہ پوری امت کے لیے عظیم سانحہ ہے۔اور ہم میں سے ہر شخص پر ان کا حق ہے کہ اپنی وسعت کے مطابق انھیں ایصال ثواب کریں۔اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں درجات عالیہ عطا فرمائیں، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی دولت سے نوازیں۔آمین۔

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

(از: حضرت مولانا عبدالاحد الازہری
قاضیٔ شہر و ناظم معہد ملت مالیگاؤں

مورخہ ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو آل انڈیا ریڈیو سے جونہی یہ خبر صاعقہ اثر نشر ہوئی کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اس عالمِ ناپائیدار میں نہ رہے۔ پورے ملک میں ہر طرف صفِ ماتم بچھ گئی۔ اس المناک خبر نے نہ جانے کتنوں کو مرغِ بسمل کی طرح تڑپا دیا اور نہ جانے کتنی آنکھوں کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیا۔ حضرت قاری صاحب کا سانحۂ ارتحال صرف ہمارے ملک بلکہ کل عالمِ اسلامی کے لیے نہایت دردناک اور ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ حضرت قاری صاحب مرحوم (جن کو مرحوم لکھتے ہوئے قلم کا جگر خون ہوتا ہے بانیٔ دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے پوتے تھے۔ جب ان کی عمر سات سال کی ہوئی تو انھیں دارالعلوم دیوبند میں حفظِ قرآن پاک کے لیے داخل کیا گیا۔ موصوف نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور خداداد قوتِ حفظ کی بدولت اس چھوٹی سی عمر میں ان کا رابطہ انھیں کے بقول اس الہامی درس گاہ دارالعلوم سے استوار ہوا تو عمر کی آخری سانس تک برقرار رہا۔ اس لیے آج یہ بات بلا مبالغہ اور بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہزاروں فضلائے دارالعلوم میں وہی ایک تنہا اور نمایاں فاضل ہیں جن کا بچپن اور طفلانہ معصومیت کا زمانہ جن کے شباب اور نوجوانی کی شوخیوں کا عہدِ زریں، جن کی شیخوخت پھر کہولت اور ملک و ملت کی مدبرانہ قیادت کا انقلاب آفریں دور دارالعلوم کی فضاؤں بلکہ اس کی ٹھنڈی چھاؤں میں بسر ہوا، جس عظیم شخصیت نے دارالعلوم سے وابستگی اور وارفتگی کا وہ تاریخی ریکارڈ قائم کیا ہو جس کی عظمت و تقدس جس کی معصومیت اور پاکیزگی

پراس کے تمام معاصرین متفق ہوں، سوچیے اور غور کیجیے اس پر اور اس کے معصوم دل پر اور اس کے پاکیزہ جذبات پر کیا اور کیسی بجلی نہ گری ہوگی جب اس کے آخری اوقات میں اس کی تمناؤں کے مرکز اور افکار وخیالات کے محور دارالعلوم دیوبند کے دروازے اس کے لیے بند کردیے گئے ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ صرف حضرت قاری صاحب مرحوم کی زندگی ہی کا ایک کربناک المیہ نہیں ہے۔ بلکہ ملتِ اسلامیہ کی تاریخ کا بھی ایک زبردست المیہ ہے۔ آج جہاں تک اس کی شناعت اور قباحت کا تعلق ہے اس کو کم کرکے دکھلانا بہت ہی دشوار اور مشکل ہے۔

حضرت قاری صاحب مرحوم دارالعلوم دیوبند کے متواتر ۵۴ سال مہتمم اور سربراہ رہے ہیں، اور یہ واقعہ ہے کہ دارالعلوم انھیں کے دورِ اہتمام میں ایک ہندوستانی درسگاہ سے بلند ہوکر بین الاقوامی درسگاہ اور یونیورسٹی کے روپ میں ظاہر ہوا۔ نیز اتنے طویل زمانے تک دارالعلوم کے مہتمم رہنے کے بعد لفظِ مہتمم ان کے نام کے ساتھ ایسا موزوں ہوا کہ وہ ان کے نام کی جگہ بولا جانے لگا'' تاریخ اسلام میں بہت سی شخصیتیں ایسی گذری ہیں کہ ان کے روشن کاموں اور مجاہدانہ کارناموں نے ان کو ایک لقب عنایت فرمایا اور وہ اسی نام سے جانے پہچانے لگے۔ یہاں تک کہ وہی لقب یا خطاب ان کے نام کی بجائے لیا جانے لگا۔ جیسے شیخ احمد سرہندیؒ مجدد الف ثانیؒ سے۔ حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ شیخ الہند سے، مولانا حضرت حسین احمد مدنیؒ شیخ الاسلام سے، اور حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ شیخ الحدیث کے القاب وخطابات سے مشہور ومعروف ہوئے۔ بالکل اسی طرح حضرت قاری صاحبؒ نصف صدی سے زائد عرصہ تک دینی علوم اور اسلامی معارف کی نشر واشاعت کرنے اور علماء وفضلاء کی سرپرستی کرنے کی بناء پر حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم سے مشہور ومعروف ہوئے۔ اور انھوں نے ملک کے ہر خطے اور دنیا کے ہر حصے میں اپنے اس لقب اور خطاب کا جو انھیں وقت کے مشاہیر علماء اور اعاظم صوفیاء اور مشائخ کی طرف سے ملا تھا۔ بھرم قائم اور برقرار رکھا۔ ان کے مواعظ اور ان کی تقریریں سن کر عوام

وخواص اس پر مہر تصدیق ثبت کرتے تھے کہ حق ہے کہ ایسا ہی علوم ومعارف کا بحرِ ذخار مرکز علوم دارالعلوم کا مہتمم اور سرپرست رہے، اور لوگ اطمینان کا سانس لیتے تھے کہ بیشک جب تک اس شیریں گفتار خطیب کی آواز باقی ہے۔ ہند میں اسلام کا جھنڈا بلند اور اسکا ستارہ اوجِ اقبال پر رہے گا، اسی لیے جب یہ خیال آتا ہے کہ ملکوتی آواز اور روحانی ساز بند ہو گیا ہے۔ تو سینے میں دل بیٹھنے لگتا ہے اور دور کہیں سے یہ آواز سنائی دینے لگتی ہے ؎

داغِ فراقِ صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

حضرت قاری صاحبؒ ۱۹۲۹ء میں باضابطہ مہتمم بنائے گئے۔ انھوں نے اہتمام کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد دارالعلوم دیوبند کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر ترقی کی خاطر شبانہ روز جدوجہد کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کے لیے انھوں نے جام جم کی طرح ملک و بیرون ملک میں گردش کیا۔ انھوں نے اتنی کثرت سے دورے اور اسفار کئے ہیں کہ ان کی کثرتِ اسفار کو دیکھ کر ایک مرتبہ سحبان الہند مولانا سعید احمد صاحب نے فرمایا تھا کہ اب تک کے جتنے مہتمم تھے۔ وہ سب ثوابت تھے اور موجودہ مہتمم سیارہ ہیں۔ جہاں جاتے دارالعلوم ہی سے متعارف ہوتے۔ ہر جگہ صرف ان کا نام سن کر عوام وخواص کی زبردست بھیڑ جمع ہو جاتی تھا اور پھر حضرت قاری صاحب ان کے سامنے اپنے شیریں اور شگفتہ انداز بیان میں خطابت کی جوئے شیر بہا کر سب کو مست و بے خود بنا دیا کرتے تھے۔ جس طرح لوگ ان کے گرد جمع ہوتے تھے اور ان کی تقریر وموعظت سے اپنے ایمان میں تازگی روح میں بالیدگی اور قلب میں گرمی اور سوز پاتے تھے وہ ان کو ہر دل عزیزی کا پتہ دیتی ہے۔

حضرت قاری صاحب کا نمایاں وصف یہی ان کی خطابت اور موعظت تھی تاہم وہ اپنے مواعظ میں عام واعظوں کی طرح سطحی اور سوقیانہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کی تقریر کیا ہوتی تھی۔ جیسے علوم ومعارف کا کوئی دریا ابل رہا ہے۔ جو ان کی علمی پختگی کی ناقابل تردید دلیل ہوتی تھی۔ جب وہ اپنی تقریروں میں رموز قرآن فرماتے تھے تو گمان

ہوتا تھا کہ جیسے ابن تیمیہؒ اور امام رازیؒ محوِ گفتگو ہیں۔ حدیث کے رازہائے سربستہ کھولتے تو اندازہ ہوتا کہ امام احمد بن حنبل، امام بخاری اور امام مالک اسٹیج پر جلوہ افروز ہیں۔ اور تصوف و معرفت کی گرہ کشائی پر آتے تو امام غزالی، جنید و شبلی کا گمان ہونے لگتا اور جب فلسفہ و حکمت پر لب کشائی فرماتے تو ابن سینا اور فارابی کو شرما دیتے غرض کہ وہ اپنی ذات سے انجمن تھے۔ انھوں نے اپنی تقریروں سے ہندو بیرون ہند میں تہلکہ مچا دیا اور ایک پاکیزہ انقلاب برپا کر دیا۔ وہ اس شعر کے صحیح مصداق تھے ؎

شورشِ عندلیب نے روحِ چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں

وہ صرف مقرر ہی نہیں تھے بلکہ صاحبِ تحقیق مصنف اور ایک کامیاب معلم و مدرس بھی تھے، اسی کے ساتھ وہ ایک صاحبِ نسبت شیخ طریقت بھی تھے۔ ان کے شاگردوں کی طرح ان کے عقیدت مندوں اور ارادت کیشوں کی تعداد بھی بے حد و بے شمار ہے۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ جو جتنا بڑا مقرر و خطیب ہوتا ہے ویسا ہی بدعمل اور کوتاہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن قاری صاحب موصوف اس سے مستثنیٰ تھے وہ جتنے بڑے مقرر تھے، اتنے ہی بڑے متبع سنت اور عامل بالشریعت بھی تھے انھوں نے اتنے بڑے بڑے جلسوں کو مخاطب کیا ہے کہ آج کے لوگوں میں سے کم ہی کسی کو ایسے مواقع ملے ہوں گے لیکن اس کے باوجود انھوں نے کبھی کسی کی دل آزاری اور دل شکنی نہیں کی، نہ زبان و بیان سے نہ عمل و کردار سے ان کا وعظ سن کر لوگ جذباتِ اسلامی سے سرشار ہو جاتے۔ اور اپنے گناہوں اور بدعملیوں سے سچی و پکی توبہ کرتے۔ جو لوگ ان کے ساتھ سفر و حضر میں رہے ہیں وہ گواہی دیں گے کہ کس طرح ان کے دن کی طرح ان کی راتیں بھی روشن و منور رہتی تھیں۔

بہرحال ان کی زندگی پر لکھنے کے لیے یہ دو ورقہ کافی نہیں ؏

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

یہ چند سطریں یوں ہی قلم سے ٹپک پڑیں، اس وقت ہندوستان میں بیچاری مظلوم

وستم زدہ ملت جن حالات سے دوچار ہے ان میں سے ان کے جیسے باخدا عالموں کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن مشیتِ ایزدی کے آگے کس کو دم مارنے کی قدرت ہے؟ شاید اللہ تعالیٰ نے اس میں کوئی خیر چھپا رکھا ہو، ہم کو صبر کرنا چاہیے اللہ تعالیٰ قاری صاحبؒ کی مغفرت فرمائے اور ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین۔

ان کلمات کے ساتھ ہم قاری صاحبؒ کے خویش واقارب بالخصوص حضرت مولانا محمد سالم صاحب دامت برکاتہم اور کل دارالعلوم برادری اور برادرانِ ملت کی خدمت میں تعزیت پیش کرتے ہیں۔

❀❀❀

تذکارِ طیب

حضرت مولانا ضیاء الدین اصلاحی/مدیر ماہنامہ معارف اعظم گڑھ

یوں تو دیو بند کی تاریخ جن اکابر علم وفضل کے گرد گھومتی ہے وہ فخر روزگار اور امت اسلامیہ کے گل سرسبد تھے ان میں سے ہر ایک کا علم عمل سے اور عمل علم سے بازی لے جاتا دکھائی دیتا ہے دیو بندیت کی تشکیل کا مجموعی رُخ دارالعلوم ہے جس نے اپنے دورِ اوّل ہی میں دین وملت کا مرکز ومرجع بنے اور ولی اللہی علوم کی امامت وقیادت کی سعادت حاصل کرلی تھی دارالعلوم کا دورِ اوّل جن قدسی صفت بزرگوں کی بزم سے آباد تھا ان کے پاک نفوس کے اجتماع نے دارالعلوم کو دارالعلوم بنایا اور چشمۂ علم سے علم کا دریا اور دریا سے علم کا بحر ذخار بنایا۔

دیو بندیت کو کسی گروہی یا جزوی دائرے میں محدود سمجھنا ایک عام غلط فہمی ہے حالاں کہ ایک فکر اور مسلک ہے جو بہ ظاہر ایک اقلیم گاہ کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ یہ کوئی نیا مسلک اور نیا فکر بھی نہیں بلکہ برصغیر کی ہزار سالہ تاریخ پر مشتمل علم وعمل، طریقت وشریعت اور تذکیر وتبلیغ کے ان حلقوں کی مربوط اور منطبق شکل ہے جو اپنے اپنے وقت میں الگ الگ دائروں اور مختلف صورتوں میں مصروف خدمت رہے جنھیں مرور ایام اور اختلاف احوال نے ایک دوسرے سے دور رکھا تھا مگر بلاشبہ ان کے پیچھے اخلاص مندی اور خدمت دین وملت کے سچے جذبات کارفرما تھے دیو بندیت نے ان مختلف الجہات خدمات کو کتاب وسنت کی معین کردہ حدود کا اور اہل علم وتحقیق بزرگوں کے نقوش عمل کی روشنی میں منضبط ومربوط کیا اور اس کی تہذیب وتنقیح کے بعد اسے مصفی ومجلی کرکے امت کے سامنے ایک گلدستۂ علم وعمل کی شکل میں پیش کردیا دیو بندیت کا یہی وہ کارنامہ ہے جس نے دیو بند کو ۱۴ رویں صدی ہجری اور ۱۹ رویں

صدی عیسوی میں ملت ہندیہ کی نگاہ میں عظمت واحترام اور عقیدت واعتراف بخشا۔

دارالعلوم دیوبند کی پہلی ۶ ردہائیاں دیوبندیت کے تعارف اور تشکیل میں صرف ہوئیں یہی وہ دور ہے جس میں دیوبند کی گود سے وہ یگانۂ روزگار، اہل علم، اربابِ فن، اصحاب رشد، اور رجال کار پیدا ہوئے جن سے ملت ہندیہ کی گذشتہ ایک صدی کی تاریخ زندہ وتابندہ ہے برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی پر ۱۸۵۷ء کے طوفان کے بعد دیوبند نے جو اثر ڈالا اور اس کو دین کا جو ذوق اور علم کا جو مزاج بخشا وہ ایک طرف علمائے دیوبند کی مقبول عام ہزاروں دینی اور مذہبی تصانیف کی شکل میں نظر آتا ہے جس نے اردو زبان کو اسلامی لٹریچر سے مالا مال کردیا ہے دوسری طرف دینی مدارس کے اس طویل سلسلہ کی صورت میں علم کی آبِ جو بنا ہوا ہے جو ہندوپاک کے شہر شہر اور قریہ قریہ کو سیراب کررہی ہے اور اس سے بڑھ کر اصلاح وتبلیغ کی اس عالمگیر دعوت کی شکل میں دنیا کے سامنے ہے جو برصغیر سے لے کر عالم اسلام، افریقہ ویورپ اور امریکہ وکناڈا تک بسنے والے مسلمانوں کے قلوب کے تخم ایمان کو شاداب کررہی ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اسی دیوبند کے اس دور میں مکمل ترجمان تھے وہ چودھویں صدی اور ۲۰ عیسوی کے اختتام پر دیوبند کے عروج وکمال اور ترقی وتعارف کے لحاظ سے آخری شخصیت تھے جن کے افکار، خیالات، تصانیف اور خطابات کو دنیا نے دیوبندیت کا ترجمان گردانا اور صحیح گردانا کیوں کہ وہ دیوبند کے صحیح معنی میں پہلے عظیم نمائندے تھے جنھوں نے دیوبندیت کے فروغ کے لیے بیرون ملک کے اسفار کیے، افغانستان، مشرقی وسطیٰ، افریقہ، برما، یورپ اور امریکہ تک آپ کی تقریروں کی گونج پہنچی، عوام وخواص آپ کے دلنشیں مواعظ سے مستفید ہوئے حلقۂ ارادت وعقیدت وسیع سے وسیع تر ہوا اور اسی کے نتیجے میں دیوبند کا پیغام دنیا کے کونے کونے تک پہنچا اور آپ کی ہردلعزیز مقبول، شخصیت اور متوازن انداز فکر کی بدولت اپنے اور پرائے سب ملک دیوبند کی حقانیت وعظمت کے معترف ہوگئے۔

اس میں شک نہیں کہ جماعت دیوبند کے عبقری افراد مثالی اساتذہ صاحب ارشاد ومشائخ اور باکمال ارباب علم وفن کے اجتماع نے دارالعلوم کو علم وفن کی کہکشاں بنادیا تھا اور علم نبوی ﷺ کی یہی وہ فصل بہار تھی جسے لاکھوں نگاہوں نے اجلاس صدسالہ کی صورت میں دیکھا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی ذات گرامی سیاسی طالع آزماؤں کے اٹھائے ہوئے گرد وغبار سے بے نیاز رہ کر تاریخ دیوبند کا ایسا تابناک عنوان ہے جو ہمیشہ ہی دین وملت کے خدمت گاروں میں ایک بلند مقام پر فائز رہے گا حضرتؒ کی ذات گرامی جولائی ۸۳ء میں عالم بالا کو سدھاری تو مناسب معلوم ہوا کہ آپ کے تذکار سے نگاہوں کو روشن اور دل کی بستی کو کچھ دیر کے لیے آباد کیا جائے اسی مناسبت سے مجلّہ ''معارف'' کا حسب ذیل تعزیتی اداریہ پیش ہے جو مختصر ہونے کے باوجود اپنی جامعیت اور حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ دل کش اور عبرت انگیز بھی ہے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریاؒ کی وفات کا غم ابھی فراموش نہ ہوا تھا کہ ایک اور آفتاب علم وہدایت غروب ہوگیا، یعنی مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو اس جہانِ فانی کو الوداع کہا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ. وہ ممتاز عالم دین تھے، ان کی شہرت سے یہ برصغیر ہی نہیں پوری اسلامی دنیا گونج رہی تھی، دینی، علمی اور تعلیمی عمارت کا بہت بڑا ستون گر گیا اور جماعت دیوبند کی ایک قدیم اور اہم یادگار مٹ گئی وہ اس قافلہ کے آخری مسافر تھے جس کا آغاز خاندان ولی اللہی سے ہوکر حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خلفاء اور دارالعلوم دیوبند کے اکابر تک پہنچا تھا۔ افسوس اب علم وعرفاں کی وہ شمع گل ہوگئی جس سے دارالعلوم نصف صدی سے جگمگا رہا تھا والبقاء للہ وحدہ وہ دارالعلوم کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پوتے اور مولانا حافظ احمد صاحب کے صاحبزادے تھے جو دارالعلوم دیوبند کے پانچویں مہتمم اور چار برس تک ریاست حیدرآباد دکن کی عدالت عالیہ کے مفتی تھے قاری صاحبؒ کی پرورش

وپرداخت اسی مقدس خانوادہ اور دارالعلوم کے اس عہد زرّیں میں ہوئی جو علمی، تعلیمی، دینی اور روحانی حیثیت سے بے مثال تھا اور جب اس کا آسمان علم وکمال متعدد مہر و ماہ سے جلوہ فگن تھا ان کی ولادت ۱۳۱۵ھ-۱۸۹۷ء میں ہوئی تاریخی نام مظفر الدین تھا سات برس کی عمر میں دارالعلوم دیوبند میں داخل کیے گئے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور دوسرے نامور فضلاء کی موجودگی میں مکتب نشینی اور بسم اللہ کی تقریب عمل میں آئی دو ہی برس میں قرآن مجید تجوید وقراءت کے ساتھ حفظ کرلیا پانچ برس درجہ فارسی میں رہے اس کے بعد عربی شروع کی آٹھ سال میں درسیات سے فارغ ہوکر ۱۳۳۷ھ-۱۹۱۸ء میں دارالعلوم سے سند فضیلت حاصل کی اور وہیں مسند درس پر متمکن ہوگئے جس کا سلسلہ آخر تک جاری رہا تفسیر وحدیث اور علم واسرار کی کتابیں خصوصاً حجۃ اللہ البالغہ ہمیشہ ان کے زیر درس رہیں بزرگوں کی جوہر شناسی سے ۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم کے نائب مہتمم اور چند ہی برس بعد مہتمم بنائے گئے جس کے وہ پوری طرح اہل ثابت ہوئے۔

مولانا محمد طیب صاحبؒ تقریباً ساٹھ برس تک دارالعلوم کے مہتمم رہے اس طویل مدت میں بڑے نازک دور آئے مگر انھوں نے دارالعلوم کو ہر خطرہ سے بچایا اور اس پر کوئی آنچ نہ آنے دی ان کے دور میں اس کی شہرت وعظمت میں چار چاند لگ گئے اور وہ ترقی کے بام عروج پر پہنچ گیا انھوں نے اس کا آوازۂ شہرت پوری دنیائے اسلام اور ایشیاء، یورپ، امریکہ اور افریقہ کے ملکوں تک پہنچا دیا وہ دارالعلوم کے مقصد ومسلک کی اشاعت اور دین کی تبلیغ کے لیے برابر سفر کرتے رہتے تھے، اس کی وجہ سے دارالعلوم کا حلقہ اثر بہت وسیع ہوگیا اور ہر جگہ کے خواص تو درکنار عوام بھی اس سے اچھی طرح روشناس ہوگئے اور وہ ملک گیر اور بین الاقوامی ادارہ بن گیا اسے جامع ازہر پر بھی اس حیثیت سے برتری حاصل ہے، جو حکومت کی اعانت اور سرپرستی کے بغیر محض توکل علی اللہ اور مسلمانوں کے عام چندے سے چل رہا ہے۔

تقریر وتحریر کا اچھا ملکہ تھا بڑے خوش بیان واعظ تھے اور اس میں ان کا طوطی بولتا تھا

پورے ملک میں ان کی خطابت کی دھوم تھی، اس کے لیے بیرون ملک سے بھی دعوت نامے آتے وہاں بھی ان کی تقریریں پسند کی جاتی تھیں دو دو تین تین گھنٹے تک انشراح ونشاط کے ساتھ مسلسل تقریر کرتے اور بات میں بات پیدا کرکے پورا سماں باندھ دیتے دقیق موضوع پر بھی بولتے تو ان کا نکتہ آفریں دماغ اور مواج ذہن معلومات کا دریا بہادیتا تقریریں اتنی مؤثر اور دل پذیر ہوتیں کہ سننے والے کو کوئی اکتاہٹ اور گھبراہٹ نہ ہوتی حقائق واسرار کا بند قفل کھول دینے اور مشکل مضامین کی تفہیم پر بڑی قدرت تھی اس حیثیت سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی مقبول تھے وہ بھی ان کی حکیمانہ متکلمانہ اسلوب سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا ان کی تصنیفات میں بھی یہی رنگ غالب تھا جو جدید طبقہ کے شکوک وشبہات کا ازالہ کردیتا تحریر کی مشق بھی طالب علمی ہی کے زمانہ میں ہوگئی تھی ابتداء میں ''القاسم'' میں مضامین لکھے عموماً تصنیف وتالیف اور مقالہ نگاری کا کام دورانِ سفر میں انجام دیتے وہ شاعر بھی تھے مگر ان کے شاعرانہ کمال پر پردہ پڑا رہا، عرفان عارف کے نام سے ان کے کلام کا ایک مجموعہ بھی چھپا تھا۔

وہ پہلے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے بیعت ہوئے مگر چند ماہ بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا تو وقت کے نامور شیخ طریقت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے متوسل ہوگئے اور ۱۳۵۰ھ میں ان سے خلافت بھی پائی ان کے سرچشمہ فیض سے بھی ہزاروں تشنگانِ معرفت سیراب ہوئے۔

نام کی طرح شکل وصورت اور سیرت وکردار کے بھی طیب تھے ظاہری نفاست اور حسن وجمال کے ساتھ پاک دل اور پاک طینت بھی تھے ان کے مخالف بھی ان کی نیکی، شرافت، تحمل، نرم خوئی او، عفو وحلم کے معترف تھے اپنے خلق عظیم اور لطف عمیم کی وجہ سے مسلک کے لوگوں میں مقبول تھے اور ان کی ذات اختلافات سے بالاتر سمجھی جاتی تھی چناں چہ ابتداء ہی سے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے متفق علیہ صدر رہے۔

مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور دار العلوم دیوبند ایک ہی اسم کے دو مسمی تھے، مگر

زندگی کے اخری دنوں میں انھیں دارالعلوم کی جدائی کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ وفات سے دو ماہ پہلے بستر علالت سے لکھے ہوئے ایک خط میں دارالعلوم کے لیے اپنی تڑپ، بے قراری اور تشویش کا اس طرح اظہار فرماتے ہیں:

”نہ اپنی ذات کا غم ہے نہ اپنے عزیزوں کا غم بلکہ غم دارالعلوم کا ہے جماعت جو ایک سو سولہ برس تک اوروں کے لیے ہدایت تقوی اور توحید کی علامت تھی بکھر کر رہ گئی، یہی میری بیماری ہے، زندگی کی آخری آرزو اور آخری دعا یہ ہے کہ دارالعلوم کا پہلا رنگ جس میں روحانیت تھی خلوص تھا اور سب ایک تھے اور فیصلے ایک رائے سے ہوتے تھے پھر بحال ہو جائے کاش ان کی دعا قبول ہوتی اور وہ یہ حسرت لے کر دنیا سے نہ جاتے دارالعلوم اور مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی سب سے قیمتی متاع ہیں جن سے وہ فقیری میں بھی امیر ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ انہی کی ناعاقبت اندیشی ان دونوں کی تباہی کا موجب بن جائے“۔

بارالٰہا! دین اور علم دین کے خادم شریعت کے محرم علوم و معارف قاسمی کے امین اور مسلکِ دیوبند کے شارح و ترجمان کی تربت کو اپنے انوارِ رحمت سے منور اور جنت الفردوس کے پھولوں سے معطر فرما۔ اَللّٰھُمَّ صَبِّ عَلَیْهِ شَآبِیْبَ رَحْمَتِكَ وَرِضْوَانِكَ یَاأَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ.

❁❁❁

حضرت مہتمم صاحب کی زندگی کے بعض گوشے

ابن الانور سید محمد ازہر شاہ قیصر رسابق مدیر ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند

ہر بڑے انسان کی طرح حضرت مہتمم صاحبؒ کی زندگی کے بھی مختلف پہلو اور ان کی صدرنگ سیرت کے بہت سے گوشے تھے ایک مختصر مضمون میں ان سب پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ممکن نہیں ایک بڑے عبقری، مفکر اور مصلح مزاج کے انسان کی زندگی بہت سی خصوصیات وامتیازات کی جامع ہوتی ہے بعض وقت یہ خصوصیتیں ایک دوسرے کے متضاد بھی ہوتی ہیں مگر یہ اس بڑے انسان کی بڑائی کا ایک تابناک پہلو ہوتا ہے کہ وہ ان سب خصوصیات کو ساتھ لے کر چلتا ہے اور اس کے عمل وکردار سے یہ متنوع اور متضاد صفتیں اپنی اپنی جگہ جلوہ گر ہوتی ہیں۔

مہتمم صاحبؒ کی زندگی پر محاسن ومکارم کا غلبہ تھا اس وجہ سے اپنے پچپن سال کے دورِ اہتمام میں وہ علمی، دینی اور سیاسی حلقوں میں نیک نام اپنی دینی جدوجہد میں کامیاب۔ اور اپنے علم وفضل اور قوت تحریر وتقریر کی بناء پر صف اوّل کے لوگوں میں شمار ہوتے رہے حضرت مہتمم صاحبؒ نے اپنی ساری زندگی میں جن امور کا خاص طور پر خیال رکھا وہ میرے خیال میں درج ذیل ہیں۔

مسلک کی پختگی

حضرت مہتمم صاحبؒ بہ ظاہر نرم رو، نرم گفتار اور ہر مجلس کی زینت اور ہر طبقہ میں ہردلعزیز تھے مگر واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم اور مسلک دیوبند ان کی زندگی کا پہلا اور آخری موقف تھا انھوں نے اپنی تحریر، تقریر، گفتگو، سفر، حضر سے دارالعلوم کے مسلک کو آگے بڑھانے میں غیر معمولی محنت فرمائی ہے جماعت دیوبند کا کوئی بھی نمائندہ ان کی طرح امریکہ، انگلینڈ مصر، سعودی عربیہ، برما، سری لنکا، پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش، جبش وغیرہ تک بار بار جا کر دارالعلوم کا تعارف اور اس کے مسلک کی بنیادوں کو مستحکم نہیں بنا سکا ہے موصوف کی مکمل سوانح عمری سامنے آئے گی تو اس

سے پتہ چلے گا کہ گذشتہ پچاس سال ہی میں انھوں نے اپنے ملک اور غیر ممالک میں لاکھوں میل کا سفر کر کے دور دراز حلقوں میں دار العلوم کی آواز پہنچائی اور اس کے علم وتقویٰ کی خصوصیات کو کم از کم نصف دنیا میں مقبول بنایا۔

مجھے حضرت مہتمم صاحبؒ کی زندگی میں اکثر اس کا خیال آتا کہ دار العلوم سے علمی اور دینی لٹریچر کی اشاعت کا کچھ نہ کچھ سلسلہ قائم رہا لیکن حضرت مرحوم اگر دار العلوم میں یا اس سے باہر ایک تحقیقی اور علمی ادارہ ایسا قائم فرما دیتے جو بہت وسیع پیمانہ پر دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں اسلامی تعلیمات کو عام کرتا تو یہ بھی ایک بہت بڑی خدمت ہوتی۔

جماعت کا اتحاد

حضرت مہتمم صاحبؒ کو جماعت کا اتحاد بہت عزیز تھا، اس کے لیے وہ جماعت کے ہر چھوٹے بڑے کی دل داری فرماتے اور سب کو اپنے ساتھ لے کر چلتے تھے پچاس سال تک دار العلوم کی مجلس شوریٰ سے انھوں نے اس طرح نباہ کیا کہ کبھی ان کے اور مجلس شوریٰ کے اختلافات ابھر کر سامنے نہیں آئے حالاں کہ دار العلوم جیسے عظیم الشان اور عظیم الاثر ادارہ کے وسیع انتظامات کے سلسلہ میں ان کے اور مجلس شوریٰ کے درمیان اختلافات کا پیدا ہونا ناگریز تھا اور یہ اختلافات پیدا بھی ہوتے تھے مگر حضرت موصوف کبھی خود کو جھکا لیتے تھے اور مجلس شوریٰ کی بات مان لیتے تھے اور کبھی اپنے دلائل اور حقائق سے مجلس شوریٰ کو اپنی رائے ماننے پر مجبور فرما دیا کرتے تھے آخر عمر میں انھیں دار العلوم کی بعض اونچی شخصیتوں سے اختلافات پیدا ہوئے جو اپنی جگہ بے حد رنجیدہ اور افسوس ناک ہیں مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موصوف تقاضائے عمر سے معاملات پر کنٹرول کرنے سے عاجز آچکے تھے اور بعض ایسے عناصر سامنے آگئے جنھوں نے نہ اختلافات کی سنگینی کا احساس کیا اور نہ ان کی کوئی حد مقرر کی۔

حضرت موصوف کا ایک نمایاں کارنامہ یہ تھا کہ دورِ اہتمام میں بیسوں ایسے مدرسین اور کارکنان دار العلوم تھے جن کے فکر ونظر سے حضرت موصوف ہم آہنگ نہیں تھے مگر دار العلوم کے اسٹیج پر حضرت موصوف نے کبھی انھیں بری نظر سے نہیں دیکھا کبھی ان کی حق تلفی نہیں کی

اور کبھی ان کے مراتب ومناصب میں تخفیف کا ارادہ نہیں فرمایا شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مولانا محمد میاں صاحب، غیرہ سے وہ سیاسی طور پر پوری طرح متفق نہیں رہتے تھے مگر ان سب حضرات نے ہمیشہ دارالعلوم کے وجود اور اس کے مفاد کو مقدم جانا اور احاطہ دارالعلوم میں یک دل، یک زبان، اور ایک قلم ہو کر چلے یہی وجہ ہے کہ ان سب حضرات کے دور مسعود میں دارالعلوم کو روحانی اور مادّی ترقیات نصیب ہوئیں اس کی عمارتیں بڑھیں، طلبہ، اساتذہ اور کارکنوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور دارالعلوم کی شہرت چاردانگ عالم میں پہنچی اور دارالعلوم کو اجلاس صد سالہ جیسی عالمی تقریب بنا کر ہندوستان میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی داغ بیل ڈالنے کا موقع ملا۔

اساتذہ اوران کی اولاد کا احترام

حضرت موصوف کو اپنے مشائخ اور اساتذہ حضرت شیخ الہندؒ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا غلام رسول ہزارویؒ، (مدرس قدیم دارالعلوم) حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ، حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ، مولانا اعزاز علی صاحب وغیرہم سے غایت درجہ کا تعلق خاطر تھا ان کے بہت سے مضامین اور ملفوظات اور ان کی زندگی کے بہت سے واقعات انھیں محفوظ تھے جنھیں اکثر اپنی تقریروں اور مجلسوں میں بیان فرماتے تھے ۱۹۷۷ء میں کشمیر میں حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ کے متعلق سمینار کے انعقاد کی کوشش میں وہ براہِ راست اس جذبے کے ماتحت شریک رہے کہ اس طرح عوام وخواص کے سامنے حضرت علامہ موصوف اور دوسرے بزرگانِ دیوبند کے حالات اور علوم کی یاد تازہ کرنے کا موقع ملے گا مشائخ واساتذہ کا بے حد احترام فرماتے تھے ہمیشہ عزت کے ساتھ ان کا نام لیتے اور ان کی دینی خدمات اور علمی کارناموں کی یاد تازہ فرماتے اساتذہ کی اولاد کی ہر طرح خبر گیری بلکہ ناز برداری فرماتے ہمیشہ یہ چاہتے کہ ان کے اساتذہ کی اولاد باعزت طور پر علمی اور دینی مشاغل میں اپنا وقت گذارے اپنے اس جذبہ کو بروئے کار لانے میں ان نوجوانوں کو بھی

کاموں میں مصروف رہنے کی تاکید کرتے اور خود بھی ان کی نگرانی فرماتے تھے مجھے ایسے متعدد حضرات کے حالات کا علم ہے جنھیں حضرت مہتمم صاحبؒ اپنے علمی اور روحانی رشتوں کی بناء پر ہمیشہ مدد دیتے اور ان کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔

غیبت سے اجتناب حضرت مرحوم کا سب سے بڑا اور بے حد قابل رشک وصف یہ تھا کہ وہ انتہائی شائستہ کلام تھے کسی چھوٹے بڑے سے کبھی بھی درشت کلامی نہیں فرماتے تھے پینتالیس سال کی طول طویل معیت میں ہم نے کبھی جلوت وخلوت میں انھیں اپنے بدترین سے بدترین کسی مخالف کی غیبت کرتے ہوئے نہیں پایا بعض وقت ناگوار طبع امور کے پیش آجانے پر کافی کافی دیر تک تنہائی میں رہتے اور یہ محسوس ہوتا کہ جو ناگواری پیش آئی ہے اس پر اپنے باطن میں تحمل پیدا کرنے کی کوشش فرمارہے ہیں، اور بعض وقت کسی معاملے میں بہت ہی اذیت پہنچتی تو رنج وغم کی وجہ سے بخار ہوجاتا مگر ان نازک مراحل میں بھی کسی شخص کے خلاف نہ خود کچھ بولتے تھے نہ دوسرے کسی کو بولنے کی اجازت دیتے تھے ان کی صحبت میں اگر ہم لوگوں کو گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھنے کا موقع ملتا تھا تو ہم اس کو ایک نیکی سمجھتے تھے کہ ہمارا اتنا وقت حضرت مہتمم صاحبؒ کی صحبت کی وجہ سے غیبت، بدگوئی، اور بداندیشی سے محفوظ رہا۔
کارکنان دارالعلوم میں صرف مولانا عبدالحق صاحب سابق پیشکار اہتمام کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان کے پچاس سالہ خادمانہ اور نیازمندانہ تعلق کی بناء پر حضرت مہتمم صاحب ان سے ایسے بے تکلف تھے کہ معاملات دارالعلوم میں بعض وقت پیشکار صاحب کی غلطیوں پر کچھ اظہار ناراضگی فرمادیتے تھے۔

عبادات سے شغف نماز کی جماعت کے ساتھ پابندی فرماتے کہ بلکہ مسجد دارالعلوم یا اپنے محلہ کی مسجد طیب میں خود امامت فرماتے۔
تہجد اور بعد مغرب نوافل پڑھنے کا دائمی معمول تھا۔ مہینے میں کم از کم بیس راتیں ایسی گذرتیں جن میں رات میں دو دو بجے تک جلسوں میں شرکت رہتی قیام گاہ پر واپس

تشریف لاکر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ آرام فرماتے اور پھر تہجد کا اہتمام ہوتا جس دن بہت تکان ہوتی اس دن صبح سویرے تلاوت کلام پاک ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوکر آٹھ نو بجے تک سو رہتے حیرت کی بات ہے کہ علالت کے نو دس مہینے بھی کھڑے ہوکر پورے خشوع کے ساتھ نمازیں ادا فرماتے رہے۔

علوم قاسمیہ پر نظر

سب سے پہلے ہم نے مفسر قرآن اور محدث دوراں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو علوم قاسمی کا بیان کرتے ہوئے پایا مولاناؒ تقریر و تحریر پر مہارت تامہ اور جدید اسلوب و ادا پر پوری دسترس رکھتے تھے غامض مسائل کو اتنے آسان طریق پر بیان فرماتے کہ کم سواد لوگ بھی ان سے استفادہ کرتے پھر سنا کہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ سابق صدر المدرسین کے یہاں بھی علوم قاسمی کا چرچہ رہا ہے مگر ہمیں مولاناؒ کی ان مجالس میں کبھی شرکت کا موقع نہیں ملا جس میں مولانا علوم قاسمی سے بحث فرماتے تھے۔ پھر حضرت مہتمم صاحب کی زبان پر ہمیں علوم قاسمی کا ذکر ملا حضرت مہتمم صاحب قدیم اسلوب اور اصطلاحات کا سانچا تو نہیں توڑتے تھے۔ مگر حضرت نانوتویؒ کے بہت سے علمی حقائق پر ان کی نظر تھی جس زمانہ میں پاکستان میں مسئلہ حیات النبی ﷺ پر لمبی چوڑی بحث چلی تو حضرت مہتمم صاحب نے کئی بار حضرت نانوتویؒ کی تصانیف سے ایسے مضامین بہ طورِ استشہاد و استناد کے نقل فرمائے جن سے حضرت کی حیات برزخی اور حیات تامہ کا سراغ ملتا تھا یاد آتا ہے کہ اس موضوع پر مرحوم نے ایک مفصل مضمون بھی تحریر فرمایا تھا افسوس ہے کہ اب روایات کہن کا جاننے والا اور ماننے والا کوئی شخص سامنے نہیں رہا نئی آب و ہوا اور نیا زمانہ ہے ع

اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

❁❁❁

حضرت قاری صاحبؒ

(از: مولانا قاضی محمد اطہر صاحب مبارکپوریؒ)

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ علم و فضل، ارشاد و تبلیغ، اخلاق و عادات، درس و تدریس حلم و صبر، نظم و ضبط، تصنیف و تالیف، حکمت و موعظت، تقویٰ و طہارت، اور دیگر علمی و دینی و ذاتی اوصاف و کمالات میں اپنے دور کے فرد واحد تھے۔ عوام و خواص میں مقبولیت و محبوبیت اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے جو مستحقین ہی کو ملتا ہے۔ حضرت قاری صاحب اپنے اوصاف جمیلہ کی وجہ سے اس فضلِ خداوندی کے بہترین مستحق تھے پورے عالم اسلام میں ان کو جو مقبولیت و محبوبیت حاصل تھی اس میں ان کے معاصرین میں کوئی شریک و سہیم نہیں ہے حد یہ ہے کہ ان کے مخالفین بھی ان کے ادب و احترام میں بخل نہیں کرتے تھے۔

وہ علمائے دیوبند کے اصلاحی و علمی و دینی تحریک کے سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی تھے بلکہ اس حلقہ کے آخری ترجمان تھے ان پر اس جماعت کا ایک دور ختم ہوگیا اور اس کی جملہ خصوصیات اب کسی ایک ذات میں باقی نہیں رہیں۔

حضرت قاری صاحبؒ کی عام خدمات اور ان کے ثمرات سے صرفِ نظر کر کے اگر صرف دارالعلوم دیوبند کی کم و بیش ۵۰ رسالہ خدمات ہی سامنے رکھی جائیں تو دینی و علمی خدمت کا ایک طویل سلسلہ نظر آئے گا جس کے نتیجہ میں دارالعلوم واقعی ازہر ہند بن گیا اور مسلمانانِ عالم کی قدیم و مشہور درسگاہوں جامع زیتون، جامع قروین، جامعہ ازہر، وغیرہ میں اس کا بھی شمار ہونے لگا۔ انھوں نے "مدرسہ عربیہ دیوبند" کو زندگی کا مقصد قرار دے کر واقعی معنی میں دارالعلوم بنایا۔ ان کا یہ کارنامہ علمی دنیا میں عظیم کارنامہ ہے جو ان کی عظمت کے لیے کافی ہے۔

حضرت قاری صاحبؒ کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بہت کچھ لکھنا باقی

ہے مجھے اس وقت دو ایک واقعہ بیان کرنا ہے۔ میری ان کی آخری ملاقات فتنہ کے عین شباب میں بمبئی میں حضرت قاری صاحبؒ کے خادم خاص ماسٹر چودھری عزیز الحق صاحب آسامی کے مکان پر ہوئی اس زمانہ میں حضرت قاری صاحب افکار وصدمات کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ نقاہت وناتوانی کے ساتھ شدت کا بخار تھا۔ اس وقت ان سے ملنا جلنا ایسے بھی مناسب نہیں تھا۔ پھر اس دورِ ابتلا وفتن میں ان سے ملنا اپنے کو مشتبہ کرنا تھا۔ میرے دل ودماغ پر برادرِ عزیز قاضی حیات النبی متوفی جمعہ ۲۰ رصفر ۱۴۰۲ھ کی جدائی کا بے حد اثر تھا اور میں نیم دیوانگی کے عالم میں اپنے بزرگ سے مل کر مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت کی درخواست کر کے تسلی کے کلمات سننا چاہتا تھا جس سے میرا غم ہلکا ہوتا چناں چہ اسی لیے میں حضرت قاری صاحبؒ کی خدمت میں پہنچا اور اپنی بات کہہ کر دعائے مغفرت کی درخواست کی۔ حضرت قاری صاحبؒ اپنی قدیم وضع کے مطابق نہایت خلوص سے ملے اٹھ کر بیٹھے اور دیر تک دعا کرنے کے بعد تسلی دیتے رہے۔ قرآن وحدیث اور بزرگوں کے واقعات بیان کرتے رہے۔ میں ان کا حالِ زار دیکھ کر بار بار اٹھنا چاہتا تھا مگر وہ ہر بار مجھے بٹھاتے تھے آخر کار مجھے ان کی محبت اور اپنی عقیدت دونوں پر جبر کرنا پڑا۔

کہا جاتا ہے کہ آدمی کا اصل روپ سفر میں کھلتا ہے۔ ایک مرتبہ مجھے حضرت قاری صاحبؒ کی معیت وصحبت دو دنوں تک پونہ کے سفر میں حاصل رہی۔ ان کے حلقۂ ارادت سے میرا بھی دینی وعلمی تعلق تھا میرے دوست اور قاری صاحب کے بے تکلف خادم جناب سجاد حسین صدیقی نے میری کتاب "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" حضرت قاری صاحب کو سفر میں وقت گذاری کے لیے دیدی تھی۔

ہمارے کئی بزرگ اپنے حلقۂ ارادت ومشیخت میں دوسروں کی پذیرائی اور موجودگی کو اپنے حق میں مضر سمجھتے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ ان کی وجہ سے کہیں ہمارے حلقہ میں دراڑ نہ پڑ جائے اس لئے وہ ہر وقت اسی فکر میں رہ کر اپنے خوردوں سے ایک گونہ

بے اعتنائی برتتے ہیں اور کوئی ایسی بات نہیں کرتے جس سے خوردہ نوازی ظاہر ہو مگر حضرت قاری صاحبؒ کے اپنے ذہن ومزاج اور اخلاق کے اعتبار سے اتنا بلند تھے کہ خوردنوازی کو اپنے لئے مضر نہیں سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ بڑے انبساط وانشراح سے پیش آتے تھے حتی کہ بعض اوقات ان کے اخلاق کریمانہ سے شرم محسوس ہونے لگتی کھانے اور ناشتے کے وقت اپنے پاس بٹھاتے تھے۔ سامنے کے خاص خاص کھانے میری طرف بڑھاتے تھے اور اصرار کرکے کھلاتے تھے خود تو عمر کے تقاضے اور مرض کی پرہیزی کی وجہ سے کم خوری پر مجبور تھے۔ اور مجھ کو بسیار خوری پر مجبور کرتے پچاسوں مریدوں اور معتقدوں سے بھرے دسترخوان پر اس قسم کا مظاہرہ خوردنوازی کے ساتھ وسعت ظرفی اخلاقی برتری اور حوصلہ مندی کی بات ہے۔

بات پر بات یاد آتی ہے مجھے بعض ایسے بزرگوں کے ساتھ کھانے اور ناشتے کا اتفاق ہوا ہے جو بھرے دسترخوان پر انڈوں کی زردی نوچ نوچ کر خود اڑاتے تھے اور سفیدی دوسروں کی طرف بڑھاتے تھے اور رکابیوں پر غائرانہ نظر ڈالتے تھے کہ الذذا شیئ کھانے کسی اور رکابی میں تو نہیں ہیں۔

ان دونوں واقعات میں مقابلے کے نتیجہ میں میرے نزدیک حضرت قاری صاحب کی عظمت بڑھ جاتی ہے اسی سفر میں حضرت قاری صاحبؒ کا وعظ ہوا۔ ظاہر ہے ان کے نام پر کتنا زبردست مجمع ہوا ہوگا۔ آپ نے مجھے پہلے تقریر کا حکم دیا۔ عام طور سے مصنف وصحافی تقریر وخطابت میں یوں ہی سے ہوتے ہیں جس طرح مقرر وخطیب کے لئے چند سطریں سلیقے سے لکھنا ”کارے دارد،، ہوتا ہے ویسے بھی میں تقریر کے میدان سے دور رہتا ہوں۔ مگر حضرت قاری صاحبؒ کی ان کے الفاظ میں گذارش پر انکار نہ کرسکا اور تھوڑی دیر کچھ بیان کیا اس کے بعد آپ نے خطبہ مسنونہ پڑھ کر اپنے وعظ کی ابتدا میرے بیان کی تعریف وتوصیف سے فرمائی اور کہا کہ اس جامع تقریر کے بعد مزید کی ضرورت نہیں ہے اس لیئے اسی متن کی شرح کروں گا۔ چنانچہ شروع سے آخر تک اسی کا حوالہ دیتے رہے اور

پورے وعظ کا موضوع یا متن اسی کو قرار دیا۔ اب ایسے لوگ کہاں ملیں گے؟

پھر بات پر بات آ گئی۔ ایک جلسہ میں کئی علماء ومقررین مدعو تھے جن میں میں بھی شامل تھا میں نے ایک خاص موضوع پر اپنی تقریر میں زور دیا۔ میرے بعد ایک بزرگ نے تقریر فرمائی جس کی ابتدا میری تقریر کی مخالفت سے تھی اور وہ کہتے رہے کہ آج مسلمانوں کو اس کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس بات کی ضرورت ہے اور میں سوچتا رہا کہ حضرت اپنی بڑائی کا مظاہرہ اس انداز میں نہ فرماتے تو ان کے حق میں اچھا ہی رہتا۔

اسی پونہ کے سفر میں دو دن تک حضرت قاری صاحبؒ کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا جس میں میں نے ان کی خلوت وجلوت کے معلومات اور عادات واطوار قریب سے دیکھے۔ ان کی شخصیت قریب سے بڑی پرکشش معلوم ہوئی جس طرح سے دور سے بڑی پرکشش معلوم ہوتی تھی۔ اگر شخصیت کے دیکھنے اور پرکھنے میں دور ونزدیک کی مسافت حائل نہ ہو تو اس کے اصلی خدوخال نظر آتے ہیں۔

قطب ارشاد عارف باللہ حکیم الاسلام

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

(از: نبیرۂ حکیم الاسلام مولانا محمد فاروق اسلم صاحب قاسمی
استاذ دار العلوم وقف دیوبند

قطب ارشاد عارف باللہ حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اکابر دیوبند کے اس زرّیں سلسلہ کی آخری کڑی تھے جس نے مسلمانوں کے علمی اور سیاسی زوال کے بعد ہی ان کی علمی وفکری قیادت کی اور ان کے ملی وجود کی حفاظت کی، ان کی وفات سے ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ دعوت وعزیمت کا ایک باب بند ہو گیا اور ایک تاریخ مکمل ہو گئی، ان کا علم وفضل علوم شریعت میں مجتہدانہ نظر اور مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے اور دینی رخ میں ان کی رہنمائی کرنے کی صلاحیتوں نے انھیں عالم اسلام کے ممتاز علماء کی صف میں شامل کر دیا تھا۔

دار العلوم دیوبند سے انھوں نے بیس اکیس سال کی عمر میں فراغت حاصل کر لی تھی اور اس سے پہلے بہت کم عمری میں حفظ کر چکے تھے، درس نظامی سے فراغت کے بعد فوراً ہی دار العلوم میں بلا معاوضہ خدمتِ تدریس میں مشغول ہو گئے جو آخر عمر تک ان کا محبوب ترین مشغلہ رہا، اکابر کے مشورہ سے شروع میں انھوں نے ہر فن کی ابتدائی کتابیں پڑھائیں اور آہستہ آہستہ ترقی کرتے رہے، یہاں تک کہ نصاب میں شامل مختصر اور مطول ہر کتاب کئی کئی سال ان کے زیر درس رہی، درس وتدریس کا یہ مشغلہ تقریباً ۶۵ رسال کے طویل عرصہ کو محیط ہے، جس میں ان کے چشمۂ علوم سے بے شمار تشنگانِ علم سیراب ہوئے، اور ہزار ہا یگانہ فضلاء تیار ہوئے، لیکن مدارس کے عام مزاج کے خلاف انھوں نے

اپنا مطالعہ اور علمی جستجو درس کی متداول کتابوں تک محدود نہیں کیا بلکہ ہر فن کی اعلیٰ ترین کتابوں کا مطالعہ کیا اور ہر مسلک و مشرب کے علماء کے علمی نوادرات کی خوشہ چینی کی، اس وسعت مطالعہ کے ساتھ فطری ذہانت و ذکاوت اور علمی مناسبت نے علوم شریعت میں ان کو ایسا رسوخ اور گہری نظر عطا کی تھی جس کے حامل مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ع

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

لیکن ان صلاحیتوں کے باوجود مزاجی تواضع اور انکساری کا حال یہ تھا کہ جب تمام اکابر نے متفقہ طور پر دارالعلوم دیوبند میں درس بخاری آپ کے سپرد کیا تو کسی طرح اس ذمہ کو اٹھانے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے تھے اور اپنی کم مائیگی کا اظہار کر کے آبدیدہ ہو جاتے، اور جب بخاری شریف کے پہلے درس کا وقت آیا تو دیر تک گھر میں نوافل پڑھتے رہے اور اللہ تعالیٰ سے مدد و توفیق کی دعائیں کرتے رہے۔

حضرت والا کی شخصیت میں وفور علم کے ساتھ کمال عمل کا ایسا امتزاج تھا کہ یہ فیصلہ کرنا ممکن نہ تھا کہ ان دونوں میں کون سی جانب راجح ہے، انھوں نے علوم شریعت کو جس گہرائی اور دقت نظر سے سمجھا تھا اسی قدر اپنے عمل میں تقویٰ اور احتیاط کا لحاظ رکھا تھا اور اس عمل نے ان کے علم کو جلا بخشی تھی۔

دارالعلوم میں زمانہ طالب علمی کے دوران ہی انھوں نے حضرت شیخ الہندؒ سے اصلاحی تعلق قائم کر لیا تھا، تقریباً چھ مہینے بعد ہی حضرت کی وفات ہوگئی تو کچھ عرصہ تک حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے اس راہ کی ہدایتیں لیتے رہے، پھر باضابطہ حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے ہاتھ پر بیعت کی جسکے بعد حضرت تھانویؒ نے ان کو اپنی خلافت سے بھی نوازا تھا اور آپ پر اپنے خصوصی اعتماد و اطمینان کا اظہار فرمایا تھا۔

یہی سب جوہر تھے کہ دارالعلوم دیوبند کی ادارات و سربراہی کے لیے اس وقت کے تمام اکابر کی متفقہ نگاہ انتخاب آپ پر پڑی اور آپ کے خالص علمی مزاج اور کار انتظام سے طبعی مناسبت نہ ہونے کے باوجود دارالعلوم کا اہتمام باصرار آپ کے سپرد کیا گیا، اس

انتخاب کی برکتیں آگے چل کر پوری جماعت دیوبند کے حق میں ظاہر ہوئیں کہ ۶۰ رسال کے قریب آپ نے دارالعلوم کو اس خوش اسلوبی سے چلایا کہ ہزار طوفان آئے لیکن دارالعلوم پر کوئی آنچ نہیں آنے دی اور وہ ایک مختصر سے مدرسہ سے بڑھ کر عالمگیر شہرت کا حامل ادارہ بن گیا۔

سارے فضل وکمال کے باوجود اپنی کم مائیگی کا جذبہ ایسا غالب تھا کہ تواضع کا مجسمہ نظر آتے تھے اور اس میں بڑے چھوٹے کا کوئی فرق نہیں کرتے تھے، علم وفضل کے ساتھ اور دوسرے کمالات کے ساتھ ایک نمایاں ترین وصف حلم اور بردباری تھا جس کا اعتراف کرنے پر ان کے شدید مخالفین بھی ہمیشہ مجبور ہوئے، جب کبھی اختلاف وتنازع کا دور آتا اور ان کی شخصیت کسی اعتراض اور تنقید کا نشانہ بنائی جاتی، یہ وصف اور نمایاں ہوکر سامنے آجاتا۔

دارالعلوم دیوبند کے اجلاس صد سالہ کے بعد جب دارالعلوم میں کچھ سیاسی افراد کی مخالفت کی وجہ سے آپ کی عمر کی سخت ترین آزمائش شروع ہوئی تو اس وصف کو اپنی معراج نصیب ہوئی، اس دور ابتلاء میں جو تین سال سے زائد عرصہ تک چلتا رہا، اور جس میں مخالفین نے ان کی ذات کو مجروح کرنے میں اپنی بساط بھر کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اس کے لیے کوئی حربہ اٹھا نہیں رکھا تب بھی نہ آپ کی زبان پر کبھی کسی کے خلاف ایک حرف شکایت آیا اور نہ کسی غم وغصہ کا اظہار ہوا بلکہ اس طوفان کے سرد ہونے کے بعد جب بہت سے شدید مخالفوں کو اپنی غلطی کا احساس اور اس پر ندامت ہوئی اور انھوں نے آکر معافی کی درخواست کی تو بلاتوقف نہ صرف معاف کیا بلکہ یہ بھی فرمایا کہ میں نے تو تمھیں اسی وقت معاف کردیا تھا جب تمہاری کسی زیادتی کی اطلاع پہنچتی تھی۔

دوسرے علمی کمالات کے ساتھ ادبی ذوق فطری تھا، عام بات چیت ہو علمی مجلس ہو یا وعظ وتقریر کا موقعہ گھنٹوں بھی آپ کی شیرینی گفتار میں نہ فرق آتا، نہ سننے والے کو کوئی اکتاہٹ محسوس ہوتی، خالص علمی گفتگو میں بھی کلام کی برجستگی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی میں فرق نہیں آتا تھا اور یہ شگفتہ بیانی ضرب المثل بن گئی تھی، عربی زبان وادب

سے خصوصاً بے انتہا دلچسپی تھی اگر چہ اس کو کبھی موضوع کے طور پر اختیار نہیں کیا، فارسی اردو اور عربی کے بے شمار اشعار نوک زبان تھے، جن کو برمحل گفتگو کے دوارن استعمال کرتے اور زبان کی چاشنی میں اضافہ ہوجاتا خود بھی ایک باکمال شاعر تھے اور مذکورہ تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے جن کا ایک مجموعہ ''عرفان عارف'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اجلاس صد سالہ کے موقع پر دارالعلوم کی ایک منظوم تاریخ ''ارمغان اجلاس'' کے نام سے امریکہ کے پہلے سفر کے موقعہ پر ''سفرنامہ امریکہ'' منظوم لکھا اس سے پہلے آنکھوں کے آپریشن کے لیے علی گڑھ تشریف لے گئے تو علاج کے دوران ہسپتال میں ''آنکھ کی کہانی'' کے نام سے ایک طویل نظم لکھی، یہ تمام نظمیں آپ کی ادبی مناسبت، قادرالکلامی اور جودت طبع کی آئینہ دار ہیں، دوسری تصانیف کی طرح شعری مجموعوں میں بھی مخصوص حکیمانہ اسلوب نمایاں ہے۔

اس کے ساتھ ایک صاحبِ طرز ادیب و مصنف تھے موجودہ دور کی ضرورت کے مطابق اہم اسلامی موضوعات پر سو سے زائد کتابیں قلم سے نکلیں، اور اکابر علماء نے ان کے علمی اور تحقیقی قدر و قیمت کا اقرار کیا تصنیف و تالیف وعظ و تقریر بلکہ عام گفتگو تک میں آپ کا مخصوص حکیمانہ اسلوب نمایاں رہتا، جو آپ کی خصوصیت تھا۔

اپنے اوقات کی حفاظت اور قدر دانی میں بے مثال تھے، آخر عمر تک مصروفیات میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی بلکہ اضافہ ہی ہوا تھا اس کے باوجود عبادت و ریاضت کے معمولات میں کبھی کوئی فرق نہیں آنے دیا، انتظامی امور اور درس و تدریس سے جو وقت بچتا وہ تصنیف پر صرف کرتے اور یہ سلسلہ دوران سفر بھی جاری رہتا، چوں کہ آپ کی عمر کا ایک بڑا حصہ سفر میں گذرا ہے اس لیے تصانیف کی ایک خاصی تعداد دوران سفر ہی میں وجود میں آئی، عمر کے ضعف اور مسلسل امراض کے ساتھ بہ کثرت کار اور ہمہ وقت مشغولیت دیکھنے والوں کے لیے ہمیشہ حیرت کا سبب بنتی اور ایک زندہ کرامت نظر آتی تھی، کسی بھی کام کو شروع کرنے کے بعد پوری توجہ اس پر لگا دیتے، گویا اس کا فکر اور

خیال دل و دماغ پر مستولی ہو جاتا، اگر درمیان میں کوئی سفر یا ہنگامی مصروفیت پیش آ جاتی تو شروع کیے ہوئے کام کو اس سے پہلے پورا کرنے کی کوشش کرتے، اسی لیے کسی بھی لمبے سفر سے کئی دن پہلے شب و روز کے آرام کے اوقات مختصر کر دیتے، تصنیف و تالیف کے وقت یہ انہماک بہت بڑھ جاتا، بسا اوقات پوری رات ایک نشست پر لکھتے ہوئے گذر جاتی اور انھیں احساس بھی نہ ہوتا۔

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو

لیکن ان عظیم علمی و عملی ذمہ داریوں اور ان کی مصروفیات کے باوجود اہل خانہ یا باہر کے متعلقین کو کبھی بھی بے اعتنائی یا عدم توجہ کی شکایت کی نوبت نہ آتی ہر ایک کے ساتھ یکساں شفقت و محبت کا معاملہ فرماتے، چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی بے حد حوصلہ افزائی فرماتے اور کبھی کچھ انعام بھی عنایت فرما دیتے، اہل خانہ کے ساتھ گفتگو کے لیے اہتمام کے ساتھ شب و روز کی مصروفیات میں سے کچھ وقت نکالتے اور لطیف پیرایوں میں ان کی علمی و اخلاقی تربیت فرماتے۔

خانگی مجلس کی ابتداء کسی عنوان سے ہو لیکن ہمیشہ تھوڑی دیر میں ایک مجلس وعظ و تذکیر بن جاتی جس میں حضرت والا اپنے مخصوص طرز میں انبیاء و بزرگان دین کے واقعات احادیث و قرآن کے قصائص عبر اور علمی مسائل بیان فرماتے اور اہل خانہ میں دینی جذبہ اور ایمانی ذوق و شوق ابھارتے، اس مبارک مجلس کے ختم پر ہر ایک کو اپنے ایمان میں ایک تازگی اور جذبہ عمل میں اضافہ محسوس ہوتا۔

یہ بھی ایک عجیب خصوصیت تھی کہ حاضرین مجلس میں سے ہر ایک یہ محسوس کرتا کہ سب سے زیادہ اسی کی طرف متوجہ ہیں، اسی احساس اور ساتھ ہی حضرت والا کے دلنواز طرزِ کلام اور لہجہ کی شیرینی کا اثر ہوتا کہ گھنٹوں کی مجلس میں نہ حاضرین کے انہماک میں فرق آتا اور نہ کوئی اکتا کر اٹھتا۔ برسوں سے روزانہ عصر کی نماز کے بعد علمی مجلس کا دستور تھا جو آخری دن تک جاری رہا۔

رمضان المبارک میں مجلس تراویح کی نماز کے بعد ایک ڈیڑھ گھنٹہ تک چلا کرتی، جس میں دارالعلوم کے اساتذہ اور طلبہ اور باہر کے مہمانوں کی ایک معقول تعداد حاضر رہتی، ان مجالس میں ہر طرح کے علمی موضوعات پر بات ہوتی، سوالات کرنے کی پوری آزادی رہتی، تمام اساتذہ وطلبہ اپنے ذوق کے مطابق مختلف علمی سوالات کرتے اور حضرت والا اپنی پوری بشاشت کے ساتھ ہر ایک کا سوال سنتے اور تشفی بخش جواب دیتے، وفور علم کا نتیجہ تھا کہ بسا اوقات ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی پوری مجلس ایک ہی سوال کے جواب میں تمام ہوجاتی، ہر سوال کو پورے سکون کے ساتھ سنتے، اور اگر سوال کرنے والا پوری بات نہ کہہ پاتا تو خود اس کے سوال کو واضح کردیتے تاکہ اور لوگ بھی سمجھ لیں، پھر پورے شرح وبسط کے ساتھ ایک ایک جزء کا جواب دیتے کہ سامع کا ذہن مکمل مطمئن ہوجاتا، اور دور دراز کے شبہات بھی باقی نہ رہتے، افسوس ہے کہ چند ایک کے علاوہ ان مجالس کے ضبط کا انتظام نہیں ہوسکا ورنہ یہ ایک بیش بہا علمی ذخیرہ ہوتا، اور تصنیف وتالیف کے میدان میں حضرتؒ نے ایک بیش بہا علمی خزانہ چھوڑا ہے، مختلف موضوع پر لکھے گئے ان کے مقالے علمی سوالوں کے تحریری جوابات، کتابوں کے مقدمے، سیرت وسوانح کے مضامین کا ایک طویل سلسلہ ہے جو رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوئے۔

لیکن یہ بھی خدائی قانون ہے کہ عظمتوں کے آسمان تک پہنچنے والی شخصیات جس طرح سر پر بٹھائی گئیں اور ان کا اعزاز ہوا اسی درجہ ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے اور ان کے صبر کا امتحان لیا گیا، ہر دور کی تاریخ اس پر گواہ ہے۔

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

حضرت حکیم الاسلامؒ کی عظمت کا نشان وہ دور ابتلاء وآزمائش ہے جو اجلاس کے بعد ان پر آیا، خاص طور پر اس لیے کہ یہ دور عمر کے اس آخری حصہ میں آیا جب انسان کے تمام قویٰ مضمحل ہوجاتے ہیں، حضرت والا نے مخالفتوں کے اس طوفان میں جس صبر وثبات اور استقامت وعزیمت کا ثبوت دیا وہ ان کی عظمتوں کا ایک نشان ہے اشد

الناس بلاء الانبياء ثم الامثل فالامثل۔

دارالعلوم دیوبند جس کو انھوں نے ہمیشہ اپنی ذات سے مقدم رکھا اور اس کی ترقی کے لیے اپنی زندگی تج دی تھی، ان کی آنکھوں کے سامنے اختلاف وانتشار کی بادِ سموم سے اجڑ رہا تھا۔

اجلاس صد سالہ کے بعد اس دورِ ابتلاء میں جس کا سلسلہ ان کے آخری سانس تک دراز ہوا اپنے اور پرایوں کے تیروں کا نشانہ بنتے ان کا شیشۂ دل چکنا چور ہو گیا تھا اور بالآخر یہی غم وصدمہ ان کا مرض وفات بن گیا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حضرت حکیم الاسلامؒ کی مرنجان مرنج شخصیت وضع داری، گہرائی گیرائی، علمی رسوخ، خطابت کا کمال، ذہانت وذکاوت یہ سب وہ کمالات وخصوصیات ہیں جنھوں نے ان کو اپنے ہم عصروں میں نہیں بلکہ اکابر علماء میں ممتاز بنا دیا تھا، ان کے صحیح تعارف کے لیے یہ چند صفحات کافی نہیں ہو سکتے، یہ تو ان کی سوانح کے عنوانات کا درجہ رکھتے ہیں۔

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

❁❁❁

رفتید! وَلے نہ از دلِ ما

از: مولانا عبدالرؤف صاحب عالی
پیشکار دارالعلوم وقف دیوبند

اس دوآبہ گنگ وجمن میں ہزار سال پہلے جب قافلۂ اسلام پہنچا اور اس کے ساتھ علوم نبوی کے امین اور جانشین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی آئے، جنھوں نے اس سرزمین اصنام کی معروف وباعظمت تصور کی جانے والی ندویوں کے کنارے وضوکر کے اذان دے کر پہلی نماز پڑھی تو اخلاص وعبدیت اور خشوع وخضوع سے بھرپور ان سجدوں کی بارگاہِ الٰہی میں مقبولیت کا نظارہ آنے والی صدیوں نے کیا جب ہند کے باسیوں نے رشد وہدایت کے داعی اور اصلاح وتبلیغ کے پیغامبروں کی شکل میں دیکھا۔ جن کے آثار ونشان اس دوآبہ کی بستیوں، قصبوں اور قریوں میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں، اور جن کی خدمات کے ثمرات اور جن کے انوار کی تابانی اس علاقہ کو برصغیر کے مسلمانوں کی نگاہ میں بھی اسلامی حدود کے اندر محترم بنادیا۔ جب کہ یہاں کے قدیم بسنے والوں کے نزدیک منیوں اور رشیوں کی تپسیاؤں کے لیے مشہور اور گنگا جمنا کی مزعومہ پاکیزگیوں کا یہ مسکن مدتوں سے ممتاز اور تجلیات الٰہی کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔

بہر حال سنتِ الٰہی کے مطابق ہر قوم اور ہر علاقے میں آنے والے نذیر وبشیر فرستادگان خداوندی کے قدموں سے امکانی طور پر مس ہونے والے اس خطے کو معزز ومحترم قرار دیا جاتا ہو تو کچھ بعید نہیں۔ گو مرور ایام اور گردش زمانہ نے اس کے قابل اعتبار آثار وثبوت باقی نہ رہنے دیے ہوں۔ چناں چہ رب کریم نے بھی یہاں آنے والے اوّلین علمبردارانِ توحید کے قدموں کو وہ برکت بخشی کہ ان کے نقوش پا پر چلنے والے اخلاف اپنے بعد آنے والوں کے لیے مینارۂ صداقت وحقانیت بن گئے اور انھیں کی فیض

بخشیوں نے جہاں شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ، علاء الدین صابرؒ اور شاہ عبدالرزاق جھنجھانویؒ جیسے بزرگوں کی شکل میں تشنگانِ ہدایت کی رہنمائی کی اور پھر آگے چل کر ولی اللہی فکر کا چشمہ یہیں سے پھوٹا اور اس کے فیض یافتگان کی جماعت نے آگے چل کر حاجی امداد اللہ جیسے سرخیل اور حضرت گنگوہیؒ اور حضرت نانوتویؒ جیسے یکتائے زمانہ افرد پیدا کیے ان ہی کی مساعی اور فکر و ذہن کا عملی نقشہ دیوبند کی شکل میں نمودار ہوا۔ وہ دیوبند جو ۱۸۵۷ء کی ہنگامہ خیزیوں کے بعد اسلامیانِ ہند کی تعلیم و تربیت کا عظیم مرکز بنا، اس دیوبند نے گزشتہ سوا سو سال کے اندر ملت کی جو رہنمائی کی وہ اس دور کے ہر ہر موڑ پر مسلمانانِ ہند کی تاریخ کا ایک ایسا سنگ میل بن گیا ہے جس کو یہاں کا ہر راہ نوردِ تاریخ دیکھے اور چومے بغیر نہیں گزر سکتا۔ اسی راہ کا ایک سنگ میل حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کی ناقابل فراموش شخصیت کی شکل میں سامنے آیا۔ جس کا وجود پر کشش، جس کا نظارہ جاں فزا جس کی قربت روح پرور، اور جس کی تابانی افق تا افق تھی۔ وہ دیوبند کی حقیقی ترجمان ایک ایسی ذات تھی جس میں پچھلے سرگردانِ دیوبند کی خصوصیات جمع تھیں اور ان کی انھیں خصوصیات نے انھیں اک ممتاز حیثیت عطا کر دی تھی۔ آج قافلۂ دیوبند کے اس آخری سرخیل کی وفات کو ایک عشرہ گزر چکا ہے۔ جس کا تذکرہ آج کی صحبت میں پیش نظر ہے جس پر دیوبند کی سنہری تاریخ کا ایک دور ختم ہو گیا اور جو اپنی ذات، اپنی صفات، اپنی خدمات اور اپنی خصوصیات کی بناء پر لاریب اس جماعتِ حقہ کا ایسا ترجمان تھا کہ مجموعی اعتبار سے جس کی مثال اس سے پہلے ہمیں نظر نہیں آتی۔ ''تذکارِ طیب'' یوں تو دیوبند کے مخلصین و متوسلین کے لیے کچھ کم لذیذ نہیں۔ تاہم وقف دارالعلوم دیوبند جو حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی ایک روشن یادگار اور روایات اکابر کا امین اور حقیقی طور پر مسلک دیوبند کا محافظ ہے اس کے خدام و وابستگان اس ذات طیب صفات سے تعلق و محبت کا اظہار اپنا ذاتی فریضہ ہی نہیں گردانتے بلکہ اپنی دینی و اخلاقی ذمہ داری بھی سمجھتے ہیں اور مسلکی اور جماعتی حق بھی۔

واقعہ یہ ہے کہ زندگی کی صبح وشام پر کائنات قائم ہے کسی زندگی کی صبح مسرتوں اور امیدوں کا پیغام لاتی ہے اور کسی زندگی کی شام اس دفتر نشاط وسرور کی بساط لپیٹ دیتی ہے، یہ عمومی زندگیوں کے آغاز وانجام کی ایک مسلسل داستان ہے لیکن جو زندگیاں اپنی ذات کے دائرے سے باہر جماعت اور طبقہ، مسلک اور مشرب، ملک اور ملت کے تانوں بانوں میں گتھی ہوئی ہیں اور جن کے فکر وخیال، الفاظ وبیان، نقل وحرکت اور جہد وسعی سے ایک عالم متاثر ہوتا ہو اور جن کے اشارات وکنایات سے ہزاروں اور لاکھوں افراد محظوظ ومستفید ہوتے ہوں اور جن کے التفات دل ونگاہ سے زندگیاں بنتی اور سنوتری ہوں۔ جماعتیں اور ادارے وجود پذیر ہوتے ہوں، تاریخ کا رخ متعین ہوتا ہو، جادہ پیماؤں کو دست گیری اور کاروانوں کو منزلوں کا سراغ نصیب ہوتا ہو ایسی زندگیاں جماعتوں قوموں اور ملکوں کے لیے آفتاب کی حیثیت رکھتی ہیں جن کی ضیاء بخشیوں سے تعمیر وترقی کی راہیں کھلتیں اور ہدایت وسعادت کے نقشے ابھرتے ہیں۔ ایسی شخصیات جب اپنی عمر طبعی پوری کر کے منزل آخرت کی طرف رواں ہوتی ہیں تب ان کے وجود سے پھیلی ہوئی روشنیوں، ان کے فیضان سے معمور مجلسوں اور ان کے افکار سے آباد بزم ہائے خیال کی قدر وقیمت کا احساس جاگتا ہے۔ اور قدر شناسوں کو اپنی تنگ دامانی کا اور ناقدروں کو اپنی قدر ناشناسی کا اندازہ ہوتا ہے مگر وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ تلافیٔ مافات کی مہلت باقی نہیں رہتی۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی زندگی ایک ایسی بھرپور زندگی تھی جو اسلاف کی نسبتوں کی جامع، حکمتِ قاسمی کی وارث، ولی اللہی فکر ونظر کی حامل اکابر کے زہد وریاض کا عکس اور بزرگوں کے ورع وتقوی کا نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ حلم وشفقت، رافت وعطوفت، سماحت ورعایت کی تصویر کہی جاسکتی ہے پھر اپنے اوصاف حسنہ عالی ظرفی، کریم النفسی، بلند حوصلگی، استقلال واستقامت دلداری وہمدردی، قدر شناسی وخوردنوازی کی بناء پر ہر کہ ومہ کے لیے مرکز ثقل کی حیثیت رکھتے

تھے۔ وسعتِ مطالعہ، تعمق نظر، ذکاوت وذہانت، علمی بصیرت، مزاجی اعتدال نے انھیں ایک مثالی شخصیت میں ڈھال دیا تھا اس کے علاوہ قدرت نے انھیں علوم وحدیث وتفسیر، حکمت وتشریع، ادب وانشاء تاریخ وسیرت اور احوال اکابر پر گہری نظر عطا کی تھی وہ بدیع وبیان کے بادشاہ تھے، ندرت فکر ونکتہ رسی کا ملکہ خداداد تھا، جمال دلربا، انداز خوشنوا، اطوار دلکشا، اخلاق دلآویز، لہجہ رس بھرا، مجلسوں میں قرون اولیٰ کا سارنگ، کبھی محسوس ہوتا کہ یہ ارشادات نبوی کی مٹھاس ہے۔ یا صدیقی، فاروقی اور عثمانی وعلوی مجلسوں کا ذائقہ ہے۔ کہیں تابعین کے آثار واحوال کا رنگ نظر آتا، کبھی امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور ابن حنبل کی فقہی کی دیدہ وری اور نکتہ سنجی دکھائی دیتی، کبھی جنید وشبلی، شیخ جیلانی، خواجہ اجمیری، نظام الدین اولیاء، مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے ملفوظات گرامی مجلس میں گونجتے معلوم ہوتے، کبھی علماء سلف کی محنتوں اور اخلاص مندیوں کے تذکرے، کبھی سلاطین وامراء کی کشور کشائیوں کے چرچے، کبھی بزرگان دیوبند کی خدمات وخصوصیات کے روح پرور واقعات بس معلوم ہوتا تھا کہ دیوبند اور دیوبندیت ایک ذات میں سمٹ کر نگاہوں کے سامنے آگئی ہے۔

ایک ایسی جامع الصفات شخصیت اس قافلہ دیوبند کی سرخیل تھی جس کی نسبتیں رشیدی بھی تھیں اور قاسمی بھی اشرفی بھی تھیں اور انوری بھی، ولی اللہی بھی تھیں اور مجددی بھی، یہی وہ خصوصیات وامتیازات ہیں۔ جن کی بناء پر حکیم الاسلامؒ کو جماعت دیوبند کا وہ بے مثل اور عظیم سربراہ کہا جاسکتا ہے جس نے ایک صدی گزرنے پر دارالعلوم کو ایک نئی زندگی بخش دی جو انشاء اللہ اگلی ایک صدی تک اس کو افق تا افق عظمت وشہرت اور مقبولیت ومرجعیت سے سرفراز کرتی رہے گی۔

❀❀❀

آہ!

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

(از: مولانا عبدالحق صاحب سابق پیشکار دارالعلوم دیوبند

بعض احباب نے مجھ سے اصرار کے ساتھ فرمایا کہ حضرتؒ کے بارے میں تم بھی اپنے تأثرات قلم بند کرو۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت جیسی عظیم اور بے مثال شخصیت کے بارے میں مجھ جیسا نااہل کیا لکھ سکتا ہے؟ جسے نہ تقریر آتی ہو نہ تحریر، پھر یہ کہ حضرت کی ذات گرامی بہت سی خصوصیات اور امتیازات کی حامل تھی۔ جس پہلو کو بھی لیا جائے اس کے لیے دفتر کی ضرورت ہے اور اگر اس طرف دھیان دیا جائے گا کہ اس ناکارہ نے حضرت جیسی شفیق اور مہربان ذات گرامی کے زیر سایہ پچاس سال گذارے ہیں اگر پچاس سال کی ایک ایک بات کو لکھا جائے تو اس کے لیے بھی کم وقت درکار نہ ہوگا اس لیے میں اس وقت حضرت کے خطاب ''حکیم الاسلام'' پر کچھ عرض کروں گا، حضرت کو یہ خطاب یوں ہی نہیں دیا گیا بلکہ حضرت کی ہر تحریر ہر تقریر ہر مجلس، ہر گفتگو اور ہر خطاب شرعی حکم و اسرار اور دینی مصالح پر مشتمل ہوتا تھا یہ حسن اتفاق تھا یا میری قسمت کی یاوری کہ ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۴ء میں جب اپنی تعلیم کے آخری دو سال کی تکمیل کی غرض سے دیوبند حاضر ہوا تو من جانب اللہ میری مشکوٰۃ شریف حضرت کے یہاں گئی حضرتؒ اس زمانہ میں مشکوٰۃ شریف کا درس نودرہ کی درمیانی درسگاہ میں دیتے تھے۔ اس درسگاہ کے بارے میں حضرت نے درس ہی میں حضرت مولانا محمد یعقوبؒ (اوّلین) صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کا یہ مکاشفہ نقل فرمایا کہ نور کی ایک لکیر عرش سے اس درسگاہ تک آئی ہوئی ہے۔ بہر حال مشکوٰۃ شریف کے درس اور بعد مغرب روزانہ کی مجلس میں جو مکان پر

ہوتی تھی حدیث، فقہ، تصوف، کلام، شریعت وطریقت، اور عقائد وغیرہ پر جو حکمت ریز تقریریں ہوتی تھی، خالص حقائق ومعارف اور شریعت وطریقت کے اسرار وحکم پر مشتمل ہوتی تھیں، مجھے سفر وحضر میں حضرتؒ کی سیکڑوں تقریریں سننے کا موقع ملا کوئی تیس پینتیس سال پہلے جب حضرت بعد نماز جمعہ جامع مسجد دیوبند میں پابندی کے ساتھ خطاب فرمایا کرتے تھے یہ بہت سی تقریریں لکھ بھی لی تھیں مگر افسوس کہ وہ تقریریں ضائع ہوگئیں، اسی طرح اسی دور میں بعد تقریر حضرتؒ جامع مسجد سے سیدھے دارالمشورہ میں تشریف لاتے تھے اور یہ خاص مجلس ہوتی تھی، جس میں حضرت مولانا عبدالسمیع صاحبؒ (والد ماجد مولانا عبدالاحد مرحوم) ومولانا حکیم عبداللطیف مرحوم، اور حاجی محمد قاسم مرحوم والد ماجد قاری عبدالرقیب وغیرہ جیسے بزرگ شریک ہوتے تھے اور علمی سوالات ہوتے تھے اور علمی سوالات کرتے تھے، یہ سوال وجواب بھی گنجینۂ معرفت ہوتے تھے۔ میں نے ایک ہی مضمون مثلاً ''سیرت یا افتتاح'' اور ختم بخاری شریف کی متعدد تقریریں سنی ہیں مگر ہر ایک اچھوتے اور نئے انداز کی ہوتی تھی، ہر شخص اس حقیقت سے واقف ہے کہ حضرتؒ سیاست سے ہمیشہ الگ رہے، کبھی بھی سیاسی پلیٹ فارم سے کوئی سیاسی تقریر نہیں کی مگر جمعیۃ علماءِ ہند کے جس سالانہ اجلاس کی صدارت فرمائی اور جو خطبہ صدارت پڑھا اس کی اہمیت اور افادیت کا جمعیۃ علماءِ ہند کے چوٹی کے لیڈروں نے بھی اعتراف کیا۔ سائنس سے آپ کو کوئی مناسبت نہیں تھی، اور نہ آپ نے سائنس کی کوئی کتاب پڑھی تھی مگر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں سائنس اور اسلام پر جو تقریر ہوئی قرآن وحدیث سے سائنس کے بنیادی اصولوں کو جس بلیغ اور دل نشین انداز میں بیان فرمایا۔ اس کی اہمیت اور افادیت کے سائنس کے پروفیسر معترف ہوئے اور کہا کہ ہمیں تو ان اصولوں کی ہوا بھی نہیں لگ سکی تھی، اخیر میں ایک واقعہ اور بھی سن لیجئے، ہندوستان کے آزاد ہوجانے کے بعد ۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء میں لکھنؤ میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی صدارت میں ایک تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ہر طبقے کے ماہرین تعلیم مدبر وفضلاء کے علاوہ

جمعیۃ علماءِ ہند کے چوٹی کے لیڈر موجود تھے، متعدد مقررین نے کھلے الفاظ میں اعلان کیا کہ ہمیں زمانے کی رفتار کے ساتھ چلنا چاہیے، سائنسی ایجادات وانکشافات اور مشاہدات پر مبنی نئے نظریات کی موجودگی میں ہم کب تک پرانی ودقیانوسی قدروں کے لاشہ کو کندھوں پر لیے ہوئے پھریں گے، مسلمانوں کو چاہیے کہ آزاد ہندوستان کی نئی فضا میں نیا نظام تعلیم مرتب کریں جب تک نیا نظام تعلیم نہیں جاری کیا جائے گا۔ مسلمانوں کی اقتصادی ومعاشی مشکلات پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔ آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد نے تقریر کی۔ آپ غور کریں کہ مولانا آزاد جیسا شعلہ بیان مقرر اور مانے ہوئے خطیب نے اپنی شعلہ بیانی اور دل نشیں بیان سے لوگوں کو مسحور کردیا۔ مولانا نے بھی اشارہ کنایہ اور دبے الفاظ میں نئے نظامِ کی تدوین اور ترتیب پر زور دیا۔ جمعیۃ علماء کے لیڈروں نے بھی اسے پسند نہیں کی اور چاہا کہ اشارہ کنایہ سے مولانا نے پچھلے مقررین کی جو تائید کی ہے اسی اشارہ کنایہ اور بلیغ انداز میں اس کا جواب دیا جانا چاہیے، مولانا آزاد کی تقریر کا اور نقطۂ نظر کا جواب دینا آسان نہیں تھا۔ حالاں کہ ان لیڈروں میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا حفظ الرحمٰنؒ جیسے مقرر اور خطیب بھی موجود تھے۔ مولانا آزاد کی تقریر کے جواب کے لیے سب کی نظریں حضرتؒ پر پڑیں اور سب نے ایک زبان ہوکر اصرار کیا کہ اس وقت آپ کے سوا کوئی دوسرا جواب نہیں دے سکتا، حضرتؒ اٹھے اور خطبہ ماثورہ کے بعد تقریر شروع فرمائی اور کھلے الفاظ میں فرمایا کہ یقیناً ہمیں نئے انکشافات اور سائنسی ایجادات سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ہم قطعاً اس حق میں نہیں ہیں کہ سائنسی ایجادات کو دچھوت سمجھ کر اسے ہاتھ نہ لگائیں اور اسے نظر انداز کریں، لیکن اسے یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کے بنیادی اصول اور عقائد واعمال انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں بلکہ اس خالق کائنات کے بنائے ہوئے ہیں جو عالم الغیب والشہادۃ ہے وہ آج کے نظریات اور ایجادات سے آج سے پہلے بھی واقف تھا اس وقت سے واقف ہے جب سے یہ دنیا آباد بھی نہیں ہوئی تھی، نئے انکشافات اور سائنسی ایجادات سے فائدہ ضرور اٹھائیں گے،

اسلام ترقی پسند مذہب ہے اس میں جمود اور تعطل نہیں ہے اور نہ لکیر کا فقیر ہے اس کے نظریات اور اصول میں لچک ہے، ہر نئی چیز کو اپنے اصول پر جانچ کر اس سے فائدہ اٹھانے کی اس میں صلاحیت ہے مگر اسلام کے بنیادی اصول اور عقائد و اعمال میں ترمیم نہیں کریں گے اور نہ ترمیم کا ہمیں حق حاصل ہے۔

حضرت نے اخیر میں فرمایا کہ میں نے جو کچھ عرض کیا دو لفظوں میں اس کا حاصل یہ ہے کہ مسائل پرانے ہوں اور دلائل نئے ہوں۔ حضرت کی تقریر اور قرآن وحدیث سے دلائل اور شواہد کے دوران حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ وغیرہ خوش ہورہے تھے، ان کی خوشی اور مسرت کے آثار ان کے چہروں سے نمایاں تھے، جس وقت حضرت نے دو لفظوں میں خلاصہ بیان فرمایا مجمع جھوم اٹھا چاروں طرف سے نعرۂ تکبیر اور دارالعلوم زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج اٹھی، مولانا آزاد نے بھی تحسین وآفریں کے الفاظ فرمائے اور جلسہ برخاست ہوگیا۔ حضرتؒ کی خدمت میں میں نے کم وبیش پچاس سال گذارے ہیں حضرت کی حکمت ریز تحریروں اور تقریروں کے بہت سے واقعات میرے ذہن میں ہیں بطورِ مثال اور نمونہ کے یہ چند واقعات عرض کردیے ہیں، انھیں ان گنت اور بے شمار حکمت ریز تحریروں اور تقریروں کی وجہ سے قوم کی جانب سے حضرت کو حکیم الاسلام کا خطاب دیا گیا۔ طاب اللہ ثراہ. وجعل الجنة مثواہ۔

یادگارِ علوم انوری

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ

(از: نبیرۂ امام العصر علامہ کشمیریؒ مولانا نسیم اختر شاہ قیصر، استاذ دار العلوم وقف دیو بند

امام العصر حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کی وفات حسرت آیات پر شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے اپنی تعزیتی تقریر میں فرمایا تھا کہ:

"مجھ سے مصر وشام کا اگر کوئی آدمی پوچھتا کہ کیا تم نے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، شیخ تقی الدین بن دقیق العید اور سلطان العلماء حضرت شیخ عزیز الدین بن عبد السلامؒ کو دیکھا ہے؟ تو میں استعارہ کر کے کہہ سکتا تھا کہ ہاں دیکھا ہے کیوں کہ زمانہ کا تقدم وتاخر ہے اگر حضرت شاہ صاحبؒ بھی چھٹی یا ساتویں صدی مین ہوتے تو ان خصوصیات کے حامل ہونے کی وجہ سے ان ہی کے مرتبہ میں ہوتے"۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے اس بیان کو آج پچاس برس کا عرصہ گذر جانے کے بعد کسی مبالغہ پر محمول نہیں کیا جا سکتا، حضرت شاہ صاحب کی شخصیت اور کمالات کو جن الفاظ کے ذریعہ خراج تحسین پیش کیا جا سکتا تھا ان کا صحیح استعمال حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ ہم تیزہ بختوں بدنصیبوں کی زندگیوں کا ایک عظیم سانحہ ہے کہ ہمیں اکابر دار العلوم میں سے کسی کو بھی دیکھنے کا موقع نہیں ملا، کسی کی بھی مجلسوں میں حاضر ہونے کا شرف حاصل نہ ہوا۔ ان کے واقعات ان کی محیر العقول زندگیاں، ہم تک اپنے بڑوں کی تقریروں وتحریروں کے ذریعہ سے ہی پہنچ سکیں، امام الاکبر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانیٔ دار العلوم دیو بند کی عبقری شخصیت، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی نادرۂ روزگار ہستی، حضرت شیخ الہند کا باکمال وجود،

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے علم وکمال، مولانا حسین احمد مدنیؒ کے حیرت انگیز واقعات، مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی سیاسی سوجھ بوجھ غرضیکہ اکابر کی زندگیوں اور ان کی خصوصیات کو ہمیں اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی اور ہندوستان میں دینی علوم کو زندہ اور تابندہ رکھنے والی شخصیتوں کے دیدار سے ہم محروم رہے لیکن جب ہم اس دورِ قحط الرجال میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دار العلوم دیوبند کو قریب ہوکر دیکھتے ہیں، تو اپنی اس محرومی اور بدقسمتی کا احساس کم ہوتا دکھائی دیتا ہے جو اکابر کے دیدار نہ ہونے کی وجہ سے دل میں پیدا ہوتی ہے جب ہم حضرت حکیم الاسلامؒ کے معصوم پیکر کا خیال دل میں لاتے ہیں، ان کی گفتگو ان کی نشست و برخاست، ان کا لب ولہجہ، ان کی مسکراہٹ ان کا نورانی چہرہ ہماری آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو ہمیں کبھی مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کا دیدار ہوتا ہے، کبھی رشید احمد گنگوہیؒ کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں، کہیں شیخ الہندؒ کا سراپا نظر آتا ہے، کبھی انور شاہؒ چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں، کبھی حسین احمد مدنیؒ کی مشابہت نظر آتی ہے، کبھی عبید اللہ سندھیؒ کا گماں گزرتا ہے، غرضیکہ اکابر دار العلوم کی ہر ادا ہر خصوصیت، ہر امتیاز، ہر علامت ہمیں اس شخصیت میں دکھائی دیتی ہے اور ہمارے دل ودماغ سکون اور راحت محسوس کرتے ہیں کہ اس نعمت سے ہم بالکل ہی محروم نہیں رہے بلکہ اس کا اکثر حصہ ہمیں تنہا ایک شخصیت میں دیکھنے کو مل گیا، اگر یہ کہا جائے یہ لکھا جائے اور اسی کو تاریخ کا نام دیدیا جائے کہ دار العلوم کی شاندار تاریخ کی قد آدم دیواروں کی بنیادوں میں اگر کسی شخصیت کا لہو تیزی وروانی کے ساتھ اخلاص ایثار، امانت اور ایمان بن کر دوڑ رہا ہے تو وہ شخصیت حکیم الاسلامؒ کی ہے —— تو یہ حقیقت سے ذرہ برابر بھی مفر نہیں ہوگا ایک دینی درسگاہ کو عظیم اسلامی یونیورسٹی میں بدل دینے کا تنہا کارنامہ حضرت حکیم الاسلامؒ کا ہے جنھوں نے اپنی زندگی کے ۵۸/ برس اس علمی ودینی کارخانے کو ہر طرح کی ترقیات سے مالا مال اور مضبوط کیا، عظیم الشان عمارتیں، بلند وبالا بلڈنگیں، مضبوط اور پختہ درسگاہیں اور قلعہ نما مکمل دار العلوم آپ

ہی کے دور مسعود کی یادگار ہے، آپ نے جس محنت اخلاص، مشقت، ایثار جانفشانی اور امانت ودیانت کے ساتھ اکابر کے قائم کردہ اس ادارے کو پروان چڑھایا آزاد ہندوستان کی تاریخ میں اس طرح کی کوئی اور مثال ہمیں مشکل ہی سے نظر آئے گی، آپ کے دورِ طیب میں دارالعلوم صرف نام ہی کا دارالعلوم نہیں رہا بلکہ مدارس کی تاریخ میں ایک ایسا عظیم الشان مدرسہ اور ادارہ بن کر سامنے آیا کہ آج ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور افریقہ اور دیگر ممالک کے لاکھوں ہزاروں مدارس دارالعلوم سے وابستگی کو اپنے لیے باعثِ فخر تصور کرتے ہیں۔

جب حضرت حکیم الاسلامؒ زندہ تھے، حیات تھے، ہماری نظروں کے سامنے موجود تھے تو دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ اکابر کے علم وکمالات کو اپنے اندر سمو لینے والی شخصیت اگر فی الوقت کوئی موجود ہے تو وہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی ہے تو اس میں تھوڑا بہت تردد بھی پیدا ہوتا تھا اور ہماری نگاہیں اپنے دوسرے بڑوں کی جانب بھی اٹھ جاتی تھیں مگر آج جب حکیم الاسلام ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں تو ہم نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہیں اور اخلاق وکردار علم وعمل کے تمام پیمانوں پر ان کی شخصیت کو جانچتے اور پرکھتے ہیں تو وہ تنہا اکابر کی زندہ وجاوید یادگار نظر آتے ہیں اور دیگر تمام شخصیتیں ان کے سامنے پست قد نظر آنے لگتی ہیں۔ یہ اور اس خیال اور تصور کو حضرت حکیم الاسلامؒ کی مکمل زندگی اور بھی زیادہ تقویت پہنچاتی ہے انسانی زندگی کے ہر مرحلے پر ہم ان کو ایک کھرا مکمل سچا اور صاف ستھرا انسان پاتے ہیں، ہر موڑ، ہر مقام اور ہر حالت میں ان کا عمل ان کا کردار اس انداز کا نظر آتا ہے کہ اس سے اوپر اٹھ کر کوئی دوسرا نمونہ عمل اس دور میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اکابر دارالعلوم میں امام العصر حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کا شمار ان بلند پایہ ہستیوں میں کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں دارالعلوم کی شہرت کو چار چاند لگائے اور اپنے پیچھے علماء کا ایک ایسا زبردست طبقہ چھوڑا جو ہندوستان کی گذشتہ ۳۰/۳۵ سال کی علمی ودینی، اخلاقی وروحانی زندگی کے آسمان پر روشنی بکھیر رہا ہے اور ابر

رحمت بن کر چھایا ہوا ہے آج بھی ہندوستان و پاکستان میں جو نمایاں افراد اور مسند علم وکمال پر فائز ہستیاں نظر آتی ہیں ان کا براہِ راست تعلق حضرت امام العصرؒ سے جڑا ہوا نظر آتا ہے آپ نے تلامذہ کی وہ بڑی جماعت تیار کی جنھوں نے مختلف میدانوں میں نکل کر اپنی صلاحیتوں کے چراغ جلائے اور اپنی محنتوں سے اصلاح وہدایت کی شمعیں روشن کیں۔ یہ امتیاز تو امام العصرؒ کا ہے اور ان کے تلامذہ میں یہ خصوصیت ہمیں صرف حکیم الاسلامؒ میں نظر آتی ہے کہ وہ حضرت شاہ صاحبؒ کے تمام تلامذہ میں تنہا ایک ایسی شخصیت نظر آتے ہیں کہ جن کی جانب نگاہ اٹھتی ہے اور یقین آجاتا ہے کہ سچائی اور ایمان وعمل کے حسین اور خوبصورت پیکر کیسے ہوتے ہوں گے اور حضرت شاہ صاحبؒ یا دیگر اکابر دارالعلوم کس انداز اور کس فکر کے ساتھ اپنی زندگیاں گذارتے ہوں گے اور یہ امتیاز بھی کوئی معمولی نہیں ہے کہ ان کو دیکھ کر دارالعلوم کی ۱۲۰؍سالہ تاریخ کی ہر بڑی شخصیت کا پرتو ہمیں تنہا ان ہی میں نظر آجائے حکیم الاسلامؒ کی بلند مرتبہ ہستی کو صفحات کے صفحات سیاہ کرنے کے باوجود بھی خراج تحسین نہیں پیش کیا جاسکتا جس کی ہر ادا طیب ہو، ہر بات طیب ہو، ہر انداز طیب ہو، پوری کی پوری زندگی طیب ہو، اس کے ذکر طیب کے لیے کیسے کہہ دیا جائے کہ چند صفحات میں ہم نے ان کی پوری شخصیت کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے یا ان کے بارے میں ہم کچھ کہہ سکے ہیں، زمانہ جوں جوں کروٹ بدلے گا، وقت کی رفتار جس طرح تیز ہوگی، صبح وشام کی گردشوں میں جو برق رفتاری پیدا ہوگی، رات اور دن کے معمولات کا جب تک یہ سلسلہ چلے گا، تب تک آپ کا ذکر خیر ہوتا رہے گا۔ آپ کی خدمات کو سراہا جاتا رہے گا آپ کی بے لوث اور بے ضرر زندگی کے انوکھے، دلچسپ اور محیر العقول واقعات سامنے آتے رہیں گے۔

جس وقت یہ مضمون سپرد قلم کر رہا ہوں حضرت حکیم الاسلامؒ کے انتقال کو ۲۱؍دن گذر چکے ہیں اور دل ودماغ ابھی تک یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ حضرت مہتمم صاحبؒ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں مگر یہ ایک ایسی سخت حقیقت ہے کہ جس کو ماننے

کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں آپ کو حکیم الاسلام کی زندگی، ان کے علوم وکمالات ان کی حکمت آمیز باتوں کے لیے ایک وقت کا انتظام کرنا پڑے گا، جب اصحاب علم وفضل خود آگے بڑھیں گے اور آپ کی زندگی کے ظاہر ومخفی گوشوں کو اپنے قلم اور اپنی تحریروں کے ذریعہ سے سامنے لائیں گے، ہمیں تو ان کے اٹھ جانے سے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ آج ہی قاسم نانوتویؒ کو دفن کیا گیا ہو، آج ہی شیخ الہند کے جنازے کو کاندھا دیا گیا ہو آج ہی امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا سانحہ ارتحال پیش آیا ہو۔

اے حکیم الاسلامؒ، اے شبلی دوراں، اے یکتائے زمانہ، اے معصوم صفت انسان، اے فرشتہ پیکر شخص تو ہزاروں ہزار سلام اور دعاؤں کے ساتھ رخصت ہو، تو نے جو کچھ ہمیں دیا اس کو کبھی نہ بھلائیں گے، اور اس کے بدلے ہم تجھے کچھ نہ دے سکے۔ اس کا احساس بھی تمام عمر ہمارے دلوں کو زخمی اور مجروح کرتا رہے گا۔

آپ چلے گئے ہیں، آپ نے ہماری بے عملیوں اور کوتاہیوں سے اکتا کر منھ موڑ لیا ہے مگر آپ کی باتوں اور یادوں کو ہم فراموش نہیں کر سکیں گے۔

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
کرتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

❁❁❁

دارالعلوم دیوبند

کی

ایک مظلوم شخصیت

از: مولانا ندیم الواجدی صاحب / مدیر ماہنامہ ترجمان دیوبند

آپ کسی ایسے شخص کا تصور کیجئے جس نے اپنی زندگی کے قیمتی ماہ وسال کسی ادارے کی خدمت میں صرف کردیئے ہوں، اس کو اپنے خونِ جگر سے سینچنے اور پروان چڑھانے میں جس شخص نے نہ اپنی جوانی کے خوبصورت لمحے بچا کر رکھے ہوں اور نہ بڑھاپے کے قیمتی اوقات کی پرواہ کی ہو، بلکہ ساٹھ برس کی طویل زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنے محبوب ادارے کی زلفیں سنوارنے میں لگا دیا ہو اور جب اس نے اپنی زندگی کی اس منزل پر قدم رکھا ہو جہاں پہنچ کر جسم نحیف وناتواں اور قویٰ مضمحل وکمزور ہوجاتے ہیں اور محبوب سے انسیت اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے اچانک کچھ لوگ اٹھتے ہیں اور اسے اس کے محبوب سے جدا کردیتے ہیں اس تصور کے بعد آپ اپنے ذہن کی کینوس پر جو پیکر دیکھیں گے وہ ایسے شخص کا ہوگا جسے لوگ حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے نام سے جانتے ہیں۔

میں پرانے لوگوں کی بات نہیں کرتا البتہ دارالعلوم دیوبند کے نوجوان علماء اور طلباء کے متعلق پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کے صرف نام سے واقف ہیں خدمات سے واقف نہیں ہوسکتا ہے وہ یہ جانتے ہوں کہ اس نام کی ایک شخصیت دارالعلوم دیوبند کے مسندِ اہتمام پر فائز رہی ہے، لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ دارالعلوم کو دارالعلوم بنانے میں اس شخصیت کی شبانہ روز محنت اور جد وجہد کو کتنا

دخل ہے؟ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ اس شخص کی زندگی کے ساٹھ قیمتی سال اسی شجرۂ طوبیٰ کی آبیاری کرنے میں گزرے ہیں، یہ مدت کچھ کم نہیں ہوتی۔ نصف صدی سے زیادہ کا طویل سفر، تھکا دینے والا اور مضمحل کر دینے والا...... لیکن قاری محمد طیب صاحبؒ کے دل میں جذبۂ خدمت کا جو شعلہ اس وقت بھڑکا تھا جب آتش جوان تھا، بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچ کر بھی سرد نہ ہو سکا ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ خواہ وہ سفر میں ہوں یا حضر میں دارالعلوم دیوبند کے لیے وقف تھا۔ آج ملک میں ہزاروں مدارس ہیں، ان میں بہت سے مدرسے اب ملک گیر سطح پر مشہور ہیں اور بعض کی شہرت ملک کی سرحدوں سے تجاوز کر چکی ہے لیکن شاید ہی کسی مدرسے کو ایسا مہتمم میسر آیا ہو جو ظاہر و باطن کی بے شمار خوبیوں سے مالا مال ہو، ظاہری وجاہت ایسی کہ دل خود بخود مائل ہو، دیدار کے لیے آنکھیں سراپا شوق بن جائیں، باطنی خوبیوں کا دلکش مرقع، فراست، تدبر، ہوشمندی، خیر خواہی، اخلاص، دیانت، امانت، تقویٰ، علم، فضل کونسی خوبی ایسی ہے جو ان میں نہیں تھی، بے مثال مقرر، قادر الکلام شاعر، بہترین مصنف، اکابر کے علوم خاص طور پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے علوم و معارف کے شارح اور ترجمان۔

مدارس کی تاریخ میں بے شمار مہتممین کے حالات محفوظ کیے جا چکے ہیں لیکن کیا دارالعلوم دیوبند کے علاوہ کوئی مدرسہ یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کے پاس قاری محمد طیب صاحبؒ جیسی قدر آور شخصیت موجود رہی ہے یا اب موجود ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ لفظ ''مہتمم صاحب'' اپنے وسیع معنی و مفہوم کے ساتھ صرف اسی ایک شخصیت کے لیے اچھا لگتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے منصب اہتمام صرف قاری محمد طیبؒ کے لیے تخلیق کیا گیا ہو اور لفظ مہتمم صرف اسی شخصیت کی پہچان کے لیے وضع کیا گیا ہو، سچ بات تو یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند قاری محمد طیب صاحبؒ کی ذات میں اس طرح سما گیا تھا کہ ہم اسے علاحدہ کر کے دیکھ ہی نہیں سکتے تھے، دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بن چکے تھے، دونوں ایک دوسرے کی شناخت تھے، یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ کسی ایسے دارالعلوم

کا تصور کریں جس کے مہتمم قاری محمد طیب صاحبؒ نہ ہوں، اور نہ یہ ممکن تھا کہ کسی ایسے قاری محمد طیب صاحبؒ کا تصور کیا جائے جو دارالعلوم کے مہتمم نہ ہوں، مگر یہ ناممکن ممکن ہوا، کیوں ہوا۔ کس طرح ہوا؟ ہم فی الحال اس کے جواب سے پہلو تہی کرنا چاہتے ہیں، کسی دشمن نے انھیں ان کے منصب سے معزول نہیں کیا، اپنے ہی لوگ تھے جنھوں نے نہ ان کی خدمات کی قدر کی، نہ وہ ان کے فضل وکمال سے متاثر ہوئے، نہ ان کی پیرانہ سالی اور ضعف نے ان کے دلوں کو نرم کیا، ہوسکتا ہے بحیثیت مہتمم ان کا کوئی فیصلہ غلط ہو رہا ہو، بہت ممکن ہے ان کے کسی اقدام سے کسی کی بالادستی متاثر ہوئی ہو، مگر معزولی واحد حل نہیں تھا۔ کاش یہ ناگوار صورت حال پیش نہ آتی، وہ تمام زندگی اس ادارے کے سربراہ بن کر رہے، کاش وہ اسی حالت میں دنیا سے رخصت بھی ہوتے۔

دارالعلوم دیوبند کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے پہلو سے بے شمار شخصیتوں نے جنم لیا ہے۔ ڈیڑھ سو سال کے اس سفر میں ان گنت لوگ اس سرچشمۂ علم وعمل سے سیراب ہوئے، اور آسمان رشد وہدایت پر آفتاب ماہتاب بن کر چمکے۔ آج دنیا میں جہاں کہیں بھی قرآن وسنت کی خوشبو پھیل رہی ہے اس میں دارالعلوم دیوبند کے خوبصورت پھولوں کی دل آویز مہک بھی شامل ہے، جن شخصیتوں نے دارالعلوم کی تاریخ بنائی ہے، اس کا قد اونچا کیا ہے، اس کو اعتبار اور وقار عطا کیا ہے، ان کی فہرست بڑی طویل ہے۔ حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ اسی سلسلے کی ایک سنہری کڑی تھے، انھوں نے دارالعلوم دیوبند کی صرف انتظامی سطح پر ہی خدمت نہیں کی ہے بلکہ اس کا پیغام عام کرنے کی خاطر اپنی عمر کا بڑا حصہ زمین کے فاصلے طے کرنے میں صرف کیا ہے۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی شہر یا کوئی قصبہ ایسا ہو جہاں قاری صاحبؒ نے اللہ کے بندوں تک اللہ کا دین نہ پہنچایا ہو، ہندوستان سے باہر بھی بہت سے ملکوں میں ان کی آواز گونجی ہے، نہ جانے اللہ کے کتنے بندے یہ آواز سن کر غفلت کی نیند سے بیدار ہوئے، کتنے لوگوں نے ان کی کشادہ پیشانی کی گہری لکیروں میں حق مضمر پایا اور اسے اپنا کر سچے پکے مسلمان بن گئے،

ان کی آواز کا سفر ساٹھ برس سے زیادہ عرصے تک جاری رہا۔ اس عرصے میں انھوں نے ہزاروں تقریریں کی ہوں گی، ہزاروں بار اپنی سحر طراز آواز سے سننے والوں کو مسحور کیا ہوگا کیا ماضی قریب میں اس بے مثال خدمت کی نظیر ممکن ہے؟ اگر تمام تقریریں لکھ لی جاتیں یا انھیں مرتب کرلیا جاتا تو ان کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر جاتی، اور بے شمار ضخیم جلدیں بھی اپنی تنگ دامانی کا گلہ کرتی نظر آتیں۔

اس طویل سلسلہ سفر کے باوجود انھوں نے تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی اپنا وجود منوایا ہے، اوران کے قلم سے کچھ ایسی کتابیں معرض وجود میں آئی ہیں جو اپنے موضوع پر حرف آخر سمجھی جاتی ہیں، جیسے التشبہ فی الاسلام، فطری حکومت، دارالعلوم دیوبند کا مسلکی مزاج، اور آخری تصنیف جو انتقال کے بعد شائع ہوئی ''مقامات مقدسہ'' میرا تاثر یہ ہے کہ اگر اس آخری کتاب کے علاوہ وہ کچھ نہ لکھتے اور صرف یہی اک شاہ کار تصنیف ان کی پہلی اور آخری تصنیف ہوتی تب بھی مصنّفین کی فہرست میں ان کا نام نمایاں طور پر لکھا جاتا۔

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ قاری محمد طیب صاحبؒ نے اپنے اہتمام کے ابتدائی دور میں درس وتدریس کی خدمت بھی انجام دی ہے، دارالعلوم دیوبند میں وہ مشکوٰۃ شریف کا درس دیا کرتے تھے اور یہ درس طلباء میں بے حد مقبول تھا، علم اسرار شریعت سے طبعی مناسبت کی بناء پر انھوں نے برسہا برس تک حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مشہور کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا درس بھی دیا ہے، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا فخرالدین صاحبؒ کی وفات کے بعد مجلس شوریٰ نے بخاری شریف کے ابتدائی ابواب کی تدریس مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے سپرد کی تھی۔ راقم السطور کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے دورۂ حدیث شریف کے ایک طالب علم کی حیثیت سے آپ کے درسِ بخاری میں شرکت کی ہے، افسوس! اہتمام کی گوناگوں مصروفیات اور مسلسل اسفار کے باعث آپ درس وتدریس کی یہ ذمہ داری پوری دلجمعی کے ساتھ انجام نہ دے سکے، اور حضرت مولانا

شریف الحسنؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے ان ابواب کی تکمیل فرمائی۔

حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ کے یہاں بیعت وارشاد اور باطنی تربیت کا بھی سلسلہ تھا، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی توجہات نے قاری محمد طیب صاحبؒ کے باطنی کمالات کو آئینہ بنادیا تھا عرفان وسلوک کی پُر خار وادی میں ان کے قدم مسلسل آگے بڑھتے رہے، ہزاروں لوگوں نے ان کے دست حق پر بیعت کی، ان کے بہت سے خلفاء آج بھی ان کے اس سلسلۂ بیعت وارشاد کو دراز کرنے میں مصروف ہیں۔

قاری محمد طیب صاحبؒ نے بے شمار مواقع پر ملک وملت کی قیادت کے فرائض بھی انجام دیئے ہیں ملک کی تقسیم کے بعد جب ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک مضبوط قیادت، مؤثر رہنمائی اور معتدل فکر کی ضرورت تھی اس وقت جمعیۃ علمائے ہند کے اسٹیج سے ان کے صدارتی خطبات ملی سیاست کا رخ موڑنے اور اس کا مزاج تبدیل کرنے میں بڑے مؤثر رہے ہیں۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تاسیس اور اس کے ذریعہ ہندوستان کے مختلف الفکر علماء اور دانشوروں کی قیادت قاری محمد طیب صاحبؒ کی خدمات کا ایک روشن باب ہے، جسے ہماری ملی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

یہ سوانحی مضمون نہیں ہے اس میں قاری محمد طیب صاحبؒ کے حالات زندگی کا تعارف اور ان کے کارناموں کا تفصیلی ذکر ممکن نہیں، جو کچھ کم سے کم الفاظ میں لکھا گیا ہے وہ محض اپنے نوجوان علماء اور طلباء کو یہ بتلانے کے لیے لکھا گیا ہے کہ آپ جس ادارے میں زیر تعلیم ہیں یا آپ نے جس ادارے میں اپنی زندگی کے قیمتی ماہ وسال گزارے ہیں آج سے بیس سال پہلے یہاں ایک ایسی شخصیت مسند اہتمام پر جلوہ افروز تھی جسے ہم نے قصۂ پارینہ بنادیا ہے۔

شخصیتیں اداروں کی تاریخ کا قیمتی اثاثہ ہوتی ہیں، ان کی زندگی ایک روشن چراغ کی طرح ہوتی ہے جس کے اُجالوں میں اداروں کا سفر جاری رہتا ہے، مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کا ایک قیمتی اثاثہ تھے، اس قیمتی اثاثے کی حفاظت کرنا ہم

سب کی ذمہ داری ہے، آج سے بیس سال پہلے وہ دارالعلوم دیوبند سے علیحدہ کردیئے گئے تھے وجہ کچھ بھی رہی ہو، لیکن کیا ان کی خدمات بھی ان کی جدوجہد اور قربانی بھی ان کے ساتھ رخصت ہوگئی تھی پھر کیا وجہ ہے کہ ہم انھیں بیس سال سے مسلسل نظر انداز کرتے چلے آرہے ہیں؟

ان کا انتقال ہوا، مدارس اسلامیہ میں قرآن خوانی، اردو رسائل میں چند مضامین اور تعزیتی پیغامات کی ترسیل سے زیادہ کچھ ہوا؟ دارالعلوم دیوبند کا فرض تھا کہ وہ ان کے حالات اور خدمات پر مشتمل اپنے عربی اور اردو رسالوں کے خصوصی نمبر شائع کرتا، ان کی یاد میں بڑے پیانے پر سیمینار کیا جاتا، جس میں ملک کے اربابِ قلم اور اصحابِ فکر ونظر سے مقالات لکھوا کر پیش کئے جاتے، ان کے حالاتِ زندگی پر، ان کے افکار پر کتابیں شائع کی جاتیں، ان کی تصانیف عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرکے زیورِ طبع سے آراستہ کی جاتیں، ان کے بیشار خطوط جن میں سے بعض بڑے مفصل ہیں دارالعلوم دیوبند کے محافظ خانے میں موجود ہیں، یہ خطوط انھوں نے ملک کے مشاہیر علماء اور نامور شخصیات کو لکھے تھے۔ کتنا اچھا ہوتا دارالعلوم دیوبند یہ خطوط اپنے کسی صاحبِ قلم فاضل کے ذریعے مرتب کراتا اور ان کے مجموعے شائع کرا کے اہل علم کی نذر کرتا۔

سب سے بڑی ذمہ داری دارالعلوم (وقف) دیوبند کی تھی، جو قاری محمد طیب صاحبؒ کے نام پر معرض وجود میں آیا، اس ادارے کے کسی دروازے کا نام ''بابِ طیب'' رکھ دینے سے، یا چند کمروں کے ایک مجموعے کو ''رُواقِ طیب'' کا نام دینے سے آپ اس ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہوسکتے، ان کی شخصیت نہایت بلند قامت تھی، ان کے معیار کے مطابق کام کی ضرورت ہے، میرے خیال میں سب سے پہلے یہ ضرورت ہے کہ قاری محمد طیب صاحبؒ پر ملک کے کسی نامور صاحبِ قلم سے جو فاضل دیوبند بھی ہو اور تقسیم دارالعلوم دیوبند کے تناظر میں غیر جانبدار بھی ہو قاری صاحبؒ کی مفصل سوانح لکھوائی جائے۔ ابھی حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہ بقید حیات ہیں (اللہ

انھیں سلامت رکھے) ان کی موجودگی اور سرپرستی میں یہ کام زیادہ بہتر انداز میں انجام پاسکتا ہے، سوانح حیات سے متعلق مواد کی فراہمی ایک بڑا مسئلہ ہے جو ان کے تعاون اور رہنمائی کے بغیر حل نہیں ہوسکتا۔ ابھی وہ لوگ بھی حیات ہیں جنھوں نے حضرت قاری صاحبؒ کو قریب سے دیکھا ہے ان سے ملاقات کی ہے، ان کے ساتھ کچھ وقت گزارا ہے، ان سے استفادہ کیا ہے، ملک کے طول وعرض میں ان کے اسفار کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا ابھی وہ لوگ بڑی تعداد میں موجود ہوں گے جنھوں نے اسفار کے دوران عام جلسوں میں یا خاص مجلسوں میں ان سے کسب فیض کیا ہے، ملک سے باہر بھی ان کے مستفیدین اور مسترشدین کا ایک بڑا حلقہ تھا یہ تمام لوگ سوانح حیات کے لیے بہت کچھ معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ ابھی دار العلوم دیوبند اور دار العلوم وقف میں بہت سے مدرسین اور ملازمین ایسے موجود ہیں جنھوں نے حضرت قاری صاحبؒ کے زمانۂ اہتمام میں اندرونِ دار العلوم خدمات انجام دی ہیں، وہ لوگ اپنے سربراہ کے طرز عمل اور کارکردگی پر خاصی روشنی ڈال سکتے ہیں، وہ مضامین اور ادارتی نوٹ شاید ایک جگہ مل جائیں جن میں حضرت قاری صاحبؒ کے سانحۂ ارتحال کے بعد ان کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے، ابھی وہ تعزیتی خطوط بھی زمانے کی دست برد سے محفوظ ہوں گے جو وفات کے بعد پس ماندگان کے نام موصول ہوئے تھے، اس وقت کی مجلس شوریٰ کے بعض رکن بھی ابھی زندہ ہیں، اور وہ اس مجلس کے تئیں قاری صاحبؒ کے رویے کی وضاحت کر سکتے ہیں، اگرچہ کافی وقت گذر گیا ہے مگر اب مزید تاخیر مناسب نہیں ہے، میں بہت احتیاط کے ساتھ الفاظ استعمال کر رہا ہوں ورنہ مجھے کہنا چاہیے کہ اب ذرا سی تاخیر بھی ایک ایسے جرم کے مرادف ہوگی جسے دار العلوم دیوبند کی تاریخ کبھی معاف نہیں کر سکتی۔

قاری صاحبؒ کے حالات زندگی اور خدمات پر کسی مستند اور وقیع کتاب کی ضرورت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ زندگی کی آخری ساعتوں میں ان کی شخصیت کو جس طرح مجروح کرنے کی کوشش کی گئی، اس سے وہ ایک مظلوم انسان کی صورت اختیار کر

گئے ہیں، اب وقت آگیا ہے کہ ہم حقائق کا تجزیہ کریں، اوراپنی تاریخ کی تطہیر کا فریضہ انجام دیں، ہماری آنے والی نسل کو معلوم ہونا چاہیے کہ آخر وہ کیا اسباب تھے جوان کی سبکدوشی کا محرک بنے، دار العلوم کے متعلقین اور منتسبین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دارالعلوم کے اس افسوسناک نزاع کے ہر پہلو کو حقیقت کے زاونیے سے دیکھیں، کیا دارالعلوم (وقف) کے ذمہ دار حضرات خاص طور پر جانشین حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی کسی غیر جانب دار صاحب قلم کو دارالعلوم دیوبند کے اس مایۂ ناز فرزند، تاریخ دیوبند کی اس مظلوم شخصیت پر لکھنے کی دعوت دے کر یہ قرض ادا کرنے کی کوشش کریں گے جو قاری صاحبؒ کے حوالے سے ان پر واجب ہے؟

❁❁❁

الحاج قاری محمد طیب قاسمی

از: جمیل مہدی صاحبؒ، سابق ایڈیٹر روزنامہ عزائم لکھنؤ

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم الحاج قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ موت جس نے پیغمبروں، شہنشاہوں اور بے مثال وعظیم المرتبت عالموں کو نہیں چھوڑا۔ بالآخر ان پر بھی طاری ہوئی اور انھیں اس خالق کون ومکان کے حضور میں پہنچا دیا۔ جہاں سب کو حاضر ہونا ہے۔

ایک طویل مدت ۵۲ یا ۵۳ برسوں پر محیط عرصہ انھوں نے دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں گذارا اور اس کے اہتمام کی سربراہی انھوں نے اس عرصہ میں غیر منقطع تسلسل کے ساتھ اس طرح کی کہ دارالعلوم کے مہتمم کا لفظ ان کے نام کا جزو لاینفک بن گیا۔

جن لوگوں نے، یا ان کے جن ساتھیوں نے، ہندوستان برگزیدہ علمی اور دینی شخصیتوں نے، انھیں ناگوار الزامات کے ساتھ اہتمام سے نکالا، انھیں معزول اور برخواست کیا۔ ان میں کے تقریباً سبھی افراد ان کی معزولی اور برخاستگی کے بعد بھی اپنی گفتگو میں ان کا تذکرہ ''مہتمم صاحب'' کی عرفیت کے بغیر کردینے پر قادر نہیں تھے۔

دارالعلوم کی تاسیس میں حاجی عابد حسینؒ جیسے قطب، شیخ ذوالفقار علیؒ جیسے دینی غمگساری، شیخ نہال احمدؒ جیسے رئیس شاہ رفیع الدینؒ جیسے ولی اور مولانا قاسم نانوتویؒ جیسے عالمان بے بدل نے حصہ لیا تھا۔ اور مدرسہ عربی کی وہ عمارت کھڑی کی تھی۔ جو مولانا محمد طیب صاحبؒ کے دورِ اہتمام میں ''دارالعلوم'' دیوبند جیسے رفیع الشان نام سے ساری دنیا میں مشہور ہوئی اور انھیں کے دورِ نظامت اور دورِ اہتمام میں اس کی عمارتوں کا وہ لامتناہی سلسلہ شروع ہوا جس کے احاطہ میں آکر ساری دنیا کی وسعت وجدان پر تنگ محسوس ہونے لگتی ہے۔

دارالعلوم اب سے دو تین برس پہلے تک جیسا بھی تھا، جو بھی تھا، جتنا بھی تھا وہ

مولانا محمد طیب صاحب قاسمیؒ کی عالی حوصلگی، انتھک محنت، بے مثال انہماک اور دارالعلوم کے ساتھ وابستگی کے بے نظیر جذبہ کی بدولت ہی عالم وجود میں آیا تھا۔ وہ دارالعلوم کے متعلقین میں اس کے وابستگان میں اور اس کے متعلمین میں اور اس کے سرپرستوں میں یقینی طور پر، مسلم طور پر ایک ایسی منفرد، ممتاز اور یگانہ روزگار شخصیت تھے۔ جنھوں نے اپنی ذات پر دارالعلوم کی نسبت کو ہمیشہ فوقیت دی۔ وہ خواہ جنوبی افریقہ کے ایسے تاجروں کے اجتماع میں ہوں جو ان سے عقیدت اور ارادت کا تعلق رکھتے ہوں یا امریکہ کے ایسے مذاکرات میں ہوں۔ جہاں وہ ایک مسلک کے سب سے بڑے ترجمان کی حیثیت سے بلائے گئے ہوں یا عالموں، فاضلوں، دینی ماؤں اور ملّت کے برگزیدہ شخصیتوں کی ایسی محفل میں ہوں جہاں ان کی شخصی وجاہت مسلم طور پر سب سے زیادہ وہاں نظر آتی ہو۔ انھوں نے اپنی ذات کو پیچھے رکھا اور ہمیشہ دارالعلوم کو آگے کیا۔ وہ ہندوستان اور شاید پاکستان اور بنگلہ دیش کے موجودہ عالموں دینی شخصیتوں میں جس وقت ممتاز ترین مقرر بے نظیر خطیب، بے مثال واعظ اور سب سے بڑے عالم تھے۔ اور اس حیثیت سے دنیا کے اس کونے سے لے کر اس کونے تک سفر میں اپنی مشغولیتوں کا زیادہ حصہ گذارتے تھے لیکن جہاں کہیں ان کی شخصیت کے اظہار کا موقع آتا ہمیشہ فروتنی اور انکساری کے حیرتناک انداز میں، لیکن پوری صفائی اور وضاحت کے ساتھ وہ بات کہتے کہ ان کی اپنی شخصیت کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ جو کچھ بنے ہیں جو بھی عزت انھیں ملتی ہے وہ دارالعلوم کی نسبت اور اس کی خدمت کے طفیل میں ملتی ہے اور اس لیے ملتی ہے کہ اصل دارالعلوم ہے باقی جتنی چیزیں ہیں وہ فروعی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس سے زیادہ الم ناک واقعہ، اور حالات کا اس سے زیادہ دردناک انقلاب یقیناً کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا کہ ان جیسی شخصیت پر ان کی زندگی کی ڈھلی چھاؤں اور تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی شام کے زمانہ میں اور اس وقت کہ ان کی زندگی کے گنے چنے دن باقی رہ گئے تھے۔ اور ان کے ساتھیوں ان کے حریفوں، ان کے مخلصوں اور ان کی عظمتوں معترضین

میں سے ہر کسی پر یہ حقیقت بغیر کسی شک وشبہ کے عیاں ہے اور منکشف بھی تھی۔ شخصیت پرستی، خودغرضی وراثت پسندی یہاں تک کہ بد دیانتی اور عدم ثقاہت کے ایسے الزامات لگائے گئے کہ ان کی زندگی کی آخری سانسیں ان کے لیے خوں خوار چھریوں اور ان کی زندگی کے آخری لمحات ان کے لیے زہر کے تلخ اور دلخراش گھونٹوں کی صورت اختیار کر گئے۔

مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ اب اس دنیا میں نہیں ہیں

گریگوری کلنڈر یعنی انگریزی تاریخوں کے حساب سے ۸۸ برس کی عمر میں وہ اپنے مالک حقیقی کے سامنے ایک فریادی یا ایک مجرم کی حیثیت سے حاضر ہوں گے۔ اس کا علم یہاں کے بڑے بڑے عارفِ ربانی کو بھی نہیں ہوسکتا جو لوگ اس راستہ کے بیچ میں ہیں اور انھیں بھی خدا کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ان کے تعلق سے ان کی حاضری کی نوعیت کیا ہوگی۔ بہرحال ایک تلخ ناگوار اور اضطراب انگیز اور المناک تنازعہ کا انجام اس حد تک تو سامنے آگیا ہے کہ اس کا اصل فریق، اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ لیکن اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ ان پر جو کچھ گذری ہوگی جس طرح کے دردناک مراحل سے انہیں ذہنی اور روحانی طور پر گذرنا پڑا ہوگا۔ دارالعلوم کی نسبت پر مدت العمر فخر ومباہات کا اظہار کرنے والی اس شخصیت کے احساسات کا دارالعلوم کے ساتھ اس نسبت کے بدنمائی کے ساتھ منقطع کردیے جانے کے بعد کیا عالم رہا ہوگا۔ اس کی کیفیت وکمیت کے اب روز جزا کے سوا ظاہر ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

۸۸ سال کی عمر کوئی مختصر عمر نہیں ہوتی یہ ایک زندگی کی مہلت کی طویل سے طویل مدت کہلاتی ہے۔ اور غیر معمولی حالات نہ ہوتے تو آج ان کی مفارقت کے صدمہ کے باوجود یک گونہ فخر ومباہات کے احساس کے ساتھ کہتے اور کہہ سکتے تھے کہ مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ کی طویل زندگی سرتاسر ایک کارنامہ کے سرانجام اور تکمیل کی مصروفیت خدمت اور انہماک میں بسر ہوئی لیکن آج جب وہ بظاہر اچانک اس دنیا سے منھ موڑ کر چل دیے۔ اور دردناک وشرمناک اور کرب ناک واقعات کی ایک پوری

داستان اور وہ بھی نامکمل حالت میں، باقی رہ گئی۔

ہم یہ نہیں کہیں گے کہ اس قتل عمد کے مجرم ان کے وہ ساتھی ہیں جن میں سے بعض کا ستارا اس عہد کے ثقہ ترین۔ مقدس ترین اور خدا ترس و خداشناس شخصیتوں اور یگانۂ روزگار دینی علماء و فضلاء میں ہوتا ہے کیوں کہ ایسا کہہ کر ہم خود اپنی عاقبت کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے۔ کیوں کہ ہم دعویٰ نہیں کر سکتے کہ انسانی قلوب کے اندرونی احساسات اور ذہنوں کے پردوں میں چھپی ہوئی نیتوں کا حال ہم پر روشن ہے لیکن جس خالق کا یہ خود دعوی ہے کہ ان چیزوں کا حال اسے بخوبی معلوم ہے وہ اس کو بھی جانتا ہوگا کہ ہمارے ان احساسات کی حیثیت کیا ہے۔ ہم یہ بھی کہیں گے کہ اس قتل عمد کی وارادت کے مجرم ان کے وہ اقرباء اور اہل خاندان ہیں جن کی طرف اس عہد کے بے نظیر دینی عالم اور محتاط و ممتاز خدا رسیدہ لوگ انگلیاں اٹھا کر اشارہ کرتے رہے کیوں کہ ہمیں نہیں معلوم کہ جو کچھ ان کی نظروں کے سامنے تھا وہ بدلی ہوئی نیتوں کا سراب تھا یا ایک مجرد اور واضح حقیقت تھی اس لیے اس فیصلہ کو بھی اسی منصفِ روز جزا پر چھوڑتے ہیں جس کے سامنے ذرہ ذرہ میزانِ عدل پر اسطرح تولا جائے گا کہ حقیقت کے سوا شمہ برابر بھی کوئی چیز باقی نہ رہ سکے گی۔

ہم یہ بھی نہیں کہیں گے کہ الحاج قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ کے قتل کے ذمہ دار وہ حالات ہیں جو اکثر اوقات ایسے انفجار اور ہیجان کے ساتھ ابھرتے ہیں کہ کسی کا ان پر قابو نہیں ہوتا۔ اور ان کا بہاؤ اتنا تند و تیز ہوتا ہے کہ اپنے وقت کی عہد ساز اور دانشوران ترین شخصیتیں اس میں حقیر تنکوں کی طرح بہی چلی جاتی ہے۔ کیوں کہ تنازعہ اتنا حقیر و محدود مختصر تھا اور اس کی اطناب اتنی نمایاں اور واضح تھیں اور اس کے نکات اتنے منقح اور صاف تھے۔ اور اس کے مقاصد اتنے روشن اور واشگاف تھے اور پس منظر اتنا وسیع اور محیط تھا کہ ہمیں یقین ہے کہ اس صف آرائی میں شامل کوئی رکن عدم واقفیت اور بے خبری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ دعویٰ کرتا ہے تو خدا کے سامنے جواب دہی کی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتا۔

بہت سی ایسی گتھیاں جنھیں زندگی سلجھانے میں نہ صرف عاجز و ناکام رہتی ہے،

موت اس طرح منقح اور صاف کر دیتی ہے کہ پھر کوئی اشکال اور الجھاؤ باقی نہیں رہتا اور بہت سے عقدے ایسے ہیں جن کے حل کا سارا انحصار زندگی کے بجائے موت پر ہوتا ہے۔اور وہ آکر ایسے انداز میں فیصلہ صادر کرتی ہے کہ حقیقت کے سوا منظر شہود پر کوئی دوسری چیز باقی نہیں رہتی اس اعتبار سے مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی زندگی ایک ایسے الجھاؤ، ایک ایسی گرہ، ایک ایسے بوجھ کی شکل میں ڈھل گئی تھی کہ موت کو یقیناً انھوں نے کارساز، خوش آئند وخوش خبر سمجھا ہوگا اور اس بوجھ کو دوسروں پر پھینک چلے جانے کی خوشی یقیناً ان کے لیے فرحت انگیز ثابت ہوئی ہوگی۔

وہ تو اس فانی وآنی زندگی میں اپنا مقرر و مقتدر کردار مکمل کر کے چلے گئے۔لیکن اپنے ساتھیوں، اپنے حریفوں اپنے معترضوں کو اتنی بڑی آزمائش میں مبتلا کر گئے جو دنیا سے زیادہ آخرت سے متعلق اور دنیائے عمل سے زیادہ روز جزا سے وابستہ ہے ہمیں یقین ہے کہ ان کی جیسی عظیم اور جماعت میں سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں شخصیت کی وفات کا واقعہ معمولی نہیں ہوسکتا اور زندہ مولانا محمد طیب صاحب قاسمیؒ سے زیادہ مردہ مولانا محمد طیب صاحب قاسمیؒ اپنی کثیر جماعت، عالمانِ دین متین پر مشتمل اپنے ساتھیوں اور رفیقوں کے گروہ اور اپنے ذاتی وشخصی حلقے پر مشتمل افراد کے لیے آزمائش طلب اور دانش آزما ثابت ہوں گے۔

ھم ۔ جو اندرونی احساسات اور دلوں کی پوشیدہ حالتوں کے بارے میں صرف قیاس اور گمان ہی سے کام لیتے ہیں ان کی وفات کے غیر معمولی واقعہ کی بدولت کابل سے ڈھاکہ تک قلوب کی دنیا زیروزبر ہو کر رہ گئی ہوگی اور وہ لوگ جو زندگی میں ان سے مایوس تھے۔ان کی موت سے سب سے زیادہ پریشان ہوں گے ہمیں نہیں معلوم کہ جو لوگ دس دن پہلے تک ان کی دیانت کو مشکوک ومشتبہ قرار دے رہے تھے ان کی وفات کے بعد اس احساس وخیال کو قائم رکھنے کے لیے کیا صورت اختیار کریں گے۔اور اس خیال واحساس کو قائم رکھیں گے تو ان کے ضمیر ان کے ذہن ودماغ کس طرح کی کش مکش

وہاں چل سے دوچار ہوں گے۔

ہم ایکبار پھر خیال کو دہراتے ہیں کہ مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی وفات، قتل عمد کی ایک سیدھی ورادت ہے۔ لیکن قاتلوں کی جزا وسزا کا فیصلہ اس دنیا میں نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک ایسی پُر اسرار، گہری اور تہہ در تہہ واقعات کی حامل واردات ہے کہ قاتل سامنے موجود ہیں۔ لیکن گواہ اور ثبوت ناپید ہیں۔ مدعی بھی کوئی نہیں ہے۔ اور صورت حال یہ ہے کہ تنازعہ کے فریق، خود ہی معیشت، گواہ اور منصف بن کر لینے میں مصروف ہیں اور کوئی صورت ایسی موجود نہیں کہ ان کی دردناک وفات کے واقعہ کو علمی اور قطعی طور پر مکافات عمل، یا مطلوبہ شہادت کا مظہر قرار دیا جاسکے۔

لیکن یہ بات ہمارے لیے بالکل صاف اور نمایاں اور ایک واضح حقیقت کے طور پر بالکل واشگاف ہے کہ ان کی وفات سے علمی و دینی شعبوں کو ناقابل برداشت صدمہ پہنچا ہے۔ اور بہت سی ناگزیر باتوں کی تلافی کا امکان ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا ہے۔

جب تک وہ زندہ تھے ان کی شخصیت کو متنازعہ قرار دینے والی کئی زبانیں تھیں لیکن وہ موت سے ہمکنار ہوکر بہت سی شخصیتوں کو متنازعہ بنا گئے ہیں۔

ہمیں اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ دارالعلوم دیوبند کی پرانی آب وتاب، پُرانی ساکھ اور وقار، اس معتبر وجود کا امکان ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا ہے ہم یہ جانتے ہیں کہ ان کی وفات کے بعد طبقہ عُلماء کے صدیوں سے قائم وقار اور احترام کی بازیابی کی کوئی امید باقی نہیں۔

ایک آدمی جس نے اپنی زندگی کے ۵۳ سال تک بے نظیر محنت اور بے مثال جدوجہد کے بعد جس عربی مدرسہ کو دارالعلوم دیوبند اور ثانی ازہر یونیورسٹی میں تبدیل کیا تھا۔ وہ اس حالت میں اس دنیا سے رخصت ہوا ہے کہ اس پر اسی دارالعلوم کے دروازے بند تھے۔ اور دروازوں کو اس خوف سے نہیں کھولا جاتا تھا کہ کہیں اس کے بد قماش حامی دارالعلوم کی عمارت میں داخل ہوکر فتنہ برپا نہ کریں۔ ہمارا خیال ہے کہ دینی

اور مذہبی طبقہ کی دو صدیوں کی تاریخ میں اس سے زیادہ عبرتناک، اس سے زیادہ شرمناک اور اس سے زیادہ حیرتناک کوئی دوسرا باب نہیں لکھا گیا ہے لیکن آج جب کہ وہ آدمی زبان حال سے ؎

زمانہ برسر آزار تھا مگر فانی
تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو

کہتا ہوا اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہے تو یہ دنیا پہلے سے زیادہ مکروہ پہلے سے زیادہ بدنما، پہلے سے زیادہ واضح اور نمایاں دکھائی دے رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الحاج قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ کی شخصیت نے موت کو گلے لگا کر آبِ حیات پی لیا ہے اور جس طرح ان کی زندگی دارالعلوم دیوبند کی تعمیر و تکمیل کے کام آئی تھی۔ اسی طرح ان کی موت ایسے انقلاب حال کا سبب ثابت ہوگی جس کی وضاحت سرِ دست ناممکن ہے یقیناً ان کی زندگی کا ایک باب ان کی وفات پر بند ہوا ہے لیکن جو باب ان کی موت نے کھولا ہے اس کی افتتاح کے لیے نہیں ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ذرہ ذرہ اس طرح بے قرار اور مضطرب ہو اٹھا ہے کہ پورے ماحول اور پوری فضاء پر دروازہ کی کیفیت ایک سرے سے دوسرے سرے تک محیط اور طاری دکھائی دے رہی ہے۔

ہم گناہگار ان کی مغفرت کی دعا مانگتے کیا اچھے لگتے ہیں لیکن تہہ دل سے ہماری درخواست مالکِ حقیقی سے یہ ہے کہ وہ اپنی قدرت کاملہ سے ایسی صورت پیدا کر دے کہ کسی کو شبہ نہ رہ جائے کہ دودھ کہاں تھا پانی کہاں تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

نابغۂ عصر و یگانۂ روزگار

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

از: عادل صدیقی صاحب دیوبند

علم و فضل کے گلستاں کا سدا بہار پھول، ۶۰ رسال تک ایشیا کی عظیم الشان اور بے مثال عربی ادب و فقہ و سنت کی تعلیم دینے والی یونیورسٹی کی خون جگر سے سینچائی کرنے والی شخصیت، مدبر وقت، امیر و غریب، شاہ و گدا اور زن و مرد سب کے ساتھ یکساں شفقت سے پیش آنے والا گراں قدر انسان، بلند و بالا انسانی عظمتوں کو اپنے سینۂ دل میں خاموشی سے چھپانے والا عالم بے بدل، علوم ولی اللہی کا وارث، فکر قاسمی کا ترجمان، محدث کشمیریؒ کی آخری یادگار شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کا نورِ نظر، جماعت شیخ الہند کی ناقابل فراموش نشانی، حضرت تھانوی کے مے کدے کا آخری ساقی حسین صورت، حسین سیرت کا مالک دل فریب لب و لہجہ کا ترجمان، دین حق کا پیغام دلوں تک پہنچانے میں اپنی مثال آپ، علماء و مشائخ کے چمن کی آبرو، علمی و روحانی سرگرمیوں کا مبدأ، احیائے ملت کی تحریک کا محافظ، گلستان محمدی کا شگفتہ پھول، نبوت محمدی کا رنگ و نور، اسلام کی حکمتوں اور دین کی بصیرتوں کے موتی بکھیرنے والا، نیر جمال اور خالص جمال کے رنگ میں رنگا ہوا امام، دل میں قوم کی اصلاح اور وطن کی محبت لیے ہوئے دین کا شیدائی، ہزاروں ماہ و اختر کو روشن کرنے والا چراغ، بزم فکر و دانش کا چمکتا ہوا سورج، حسن عمل کا رہبر اور فکر و نظر کا بیش قیمت دفتر، فخر زمانہ، دانائے روزگار، نابغۂ عصر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ کی ذات ستودہ صفات تھی، جنھیں واصل بحق ہوئے اب بظاہر دو سال ہو گئے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی یہ کل کا ہی واقعہ ہے، کسی نے سچ کہا ہے ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے ❁ آج وہ کل ہماری باری ہے

ایسی ہی شخصیتوں کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی شخصیت جامع کمالات تھی فراق نے ایک بار ازراہِ تعلّی اپنے بارے میں کہا تھا۔

آنے والی نسلیں تم پر فخر کریں گی ہم عصرو
جب یہ کہو گے تم ان سے کہ ہم نے فراق کو دیکھا ہے

لیکن یہ شعر حضرت قاری صاحبؒ کے لیے سو فیصد درست ہے، ان کی صفات اور کمالات کو بیان کرنا مجھ جیسے ناکارہ کے بس کی بات نہیں، فقہ کی نسبت سے نازک مسائل اور نکات کی پرکھ اور تلاش، عارف کی حیثیت سے ارباب تصوف وطریقت میں نمایاں مقام، عالم کی حیثیت سے آپ کا منصب عالی، خطیب کی حیثیت سے ان کی جادو بیانی اور حسن معانی مجاہد کی حیثیت سے آپ کے علمی اسفار، شیخ کی حیثیت سے میراثِ قاسمی کی وراثت کی سچی ترجمانی مربی کی حیثیت سے متوسلین وخدام کی روحانی تربیت آپ کی شخصیت کو اس طرح منور کررہی ہے کہ حضرت جگر کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے۔

جان کر منجملۂ خاصانِ مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ مجھے

ان کی زندگی کمالات سے اس طرح پُر تھی جس طرح انسان کا دماغ بے پناہ صلاحیتوں کو کمپیوٹر کی طرح سے اپنے اندر پیوست کیے ہوئے ہے۔ شاید بہت کم لوگ واقف ہوں کہ وہ زمانۂ طالب علمی ہی سے صنفِ شعر سے دلچسپی رکھتے تھے، اور ان کی نظموں کا ایک معقول اور قابلِ قدر ذخیرہ "عرفانِ عارف" کے نام سے موسوم ہے آپ نے ابتدائی نظموں میں عارف تخلص فرمایا ہے۔ لیکن یہ اشعار دل کی پکار ہیں اور حقیقی تاثرات اور جذبات کی

ترجمانی کرتے ہیں۔ انھوں نے شعر گوئی کو اگرچہ مقصدِ حیات نہیں سمجھا تاہم آپ کے اشعار آپ کی شاعرانہ صلاحیتوں کے گواہ ہیں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ کو اردو وفارسی اور عربی تینوں زبانوں پر کماحقہ عبور تھا، اور آپ تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

نمونۂ کلام آپ نے اردو میں حمد الٰہی کے عنوان سے کچھ اشعار قلم بند کیے ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

خدا کی ذات میں ہے ہر بڑائی ❁ پہنچ سکتی نہیں اس تک برائی
غنا ہے اس کی شانِ کبریائی ❁ نہیں محتاجگی کو واں رسائی
کمالات اس کے سب دریوزہ گر ہیں ❁ جمالات اس کے سب زیر اثر ہیں
نبی ہوں یا ولی مجبور ہیں واں ❁ مہ ومہتاب سب مزدور ہیں واں
ہر اک ذرہ میں جلوہ اس کا پیدا ❁ ہر اک پیکر سے نور اس کا ہویدا

فارسی کی ایک نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

جہانِ ذکر اوصاف وکمالات ❁ فدائے ذکر والا ئے محمد
بیاضِ روز و مہر وماہ و انجم ❁ نثارِ زلفِ سودائے محمد
ازل سے تا ابد، ایامِ دنیا ❁ نثارِ لیل اسرائے محمد
اگر ہے سِرِ حق دنیا میں ظاہر ❁ تو مظہر ذات والائے محمد
عروجِ قاسمی کی انتہا ہے ❁ کہ ہے خاکِ کفِ پائے محمد

انھوں نے اگرچہ اپنا تخلص عارف ہی کیا تاہم کہیں کہیں خانوادۂ قاسمی کی نسبت سے قاسمی بھی تخلص کے طور پر استعمال کیا ہے۔

انقلابِ دہر کے عنوان سے یہ فارسی اشعار ان کی آمد اور زود بیانی کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔

چہ غم! من زندہ وجانم تہِ خاک ❁ چہ غم! تن سالم و در سینہ صد چاک
چہ غم! بے چادری وابر باراں ❁ چہ غم! بے مادری وشیر خواراں

چہ غم! با بے نوائی ساز کردن ❁ چہ غم! فریاد بے آواز کردن
چہ غم! ماہی وریگ گرم وگرما ❁ چہ غم! مفلوج وآب سرد سرما
چہ غم جام تہی ازبادۂ وغم ❁ چہ غم! را ہم در ازو زادرہ کم
چہ غم! روپوشی ایمان وجانم ❁ چہ غم! بربادگی خان ومانم
چہ غم! بے توجہاں پُر نالہ وشور ❁ چہ غم! بے توہزاراں زندہ درگور
تواے مولائیم آخر کجائی
زما روپوش بے چون وچرائی

انکی شاعری لطیف، پاکیزہ، ادبی چاشنی سے بھر پور، نیز عارفانہ، ناصحانہ اور صوفیانہ طرز کی مظہر، اخلاق اور علوے خیال کی منہ بولتی تصویر اور مختلف کیفیات وحالات کی واضح تاریخ ہے۔

ان کا کلام، ان کی تقریریں، ان کی تحریریں، ان کی وسعتِ نظر، وسعتِ مطالعہ، حقیقت پسندی، ذہنی توازن، ملی درد، تفکر، دوراندیشی کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں حدیث، تفسیر، فقہ، کلام، تاریخ وسیر اور ادب وانشاء پردازی میں آپ ید طولیٰ رکھتے تھے۔

قرآن مجید کے پختہ حافظ اور جید قاری تھے، ذکاوت وذہانت میں اپنی نظیر آپ تھے۔ قدرت نے آپ کو دل درد آشنا، قلب پرسوز اور شیریں زبانی اور صدق مقالی سے کچھ اس طرح نوازا تھا کہ عصر حاضر میں آپ کا ثانی پیش کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے ۸۶/سال کی عمر میں وفات پائی ان کی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں ہوئی۔ جب اس عظیم ہستی کی بسم اللہ کرانے والے شیخ الہند کے والد بزرگوار فاضل وقت، ادیب شہر مولانا ذوالفقار علی صاحب ہوں جس کی مکتب نشینی کی تقریب میں وقت کے بڑے بڑے بزرگ اور شیخ موجود ہوں یعنی حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن، شیخ طریقت مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب (والد ماجد مولانا عثمانی) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور ان کے والد محترم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب، اس کی دل ربائی،

عظمت، اور فیض رسانی میں کسے شبہ ہو سکتا ہے۔

حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے اس مبارک مجلس کی تاریخ ذیل کے قطعے سے نکالی ہے ؎

حبذا مکتب طیب کی مبارک تقریب ❁ کہ نئی طرح کا جلسہ تھا نئی طرح کی سیر

رَبِّ یَسِّرْ جو کہا اس نے تو بیرو ئے ابا ❁ فضل تاریخ میں بول اٹھا کہ تَمِّمْ بِالْخَیْرْ

۱۳۲۲ھ

حکیم الاسلام ماہ جون ۱۸۹۷ء مطابق ماہ محرم ۱۳۱۵ھ یک شنبہ کو اس عالم وجود میں تشریف لائے۔ آپ کا اسم گرامی ''محمد طیب'' تجویز ہوا۔ آپ کا تاریخی نام ''مظفر الدین'' تھا سات سال تک آغوش مادر اور والد ماجد کے زیر عاطفت پرورش پائی اس کے بعد ان کو دار العلوم دیوبند میں تحصیل علم کی غرض سے داخل کیا گیا۔ دو سال کی مدت میں آپ نے کلام پاک حفظ کیا اور اس کے ساتھ قراءت و تجوید میں مہارت حاصل کی، اس کے بعد درجہ فارسی کی سند حاصل کی اور شعبہ عربی میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے داخل کیے گئے۔ ان کی قوت حافظہ شروع ہی سے قابل رشک تھی ان کی نسبت روحانی سے ان کی مخفی صلاحیتوں کی اصلاح و تربیت ہوتی رہی۔ ۱۳۳۷ھ میں انھوں نے دار العلوم دیوبند کے نصاب سے فراغت پائی۔ حدیث میں وہ علامۃ العصر محدث اعظم حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ کے خصوصی شاگرد تھے اس موقع پر یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ وہ نابغہ روزگار تھے جن کے زیر عاطفت بڑی بڑی شخصیتوں کی پرورش ہوئی ان میں سے چند نام یہ ہیں، مفتی عتیق الرحمٰن، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا منظور نعمانی ایڈیٹر الفرقان لکھنؤ، مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مکیؒ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، امیر شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا مناظر حسن گیلانی، مولانا حامد الانصاری غازی بمبئی، وغیرہ وغیرہ۔

زندگی کے تین اہم ستون اس کے بعد ان زندگی تین اہم ستونوں کے گرد گھومتی نظر آتی ہے یعنی مسند درس وتدریس، مسند اہتمام اور مسند رشد وہدایت، اپنی خداداد صلایت اور علوم وفنون پر دسترس کے سبب علمی حلقوں میں ان کا مقام بہت جلد بلند ہوگیا حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ اکثر تبلیغی اسفار میں آپ کو ساتھ رکھتے اور بڑے بڑے نازک موقعہ پر مختلف موضوعات پر ان سے تقریر کراتے اور اظہار مسرت فرماتے انھوں نے فقہ، منطق، فلسفہ صرف ونحو اور دیگر بہت سی کتابیں بڑے وثوق اور یقین کے ساتھ پڑھائیں، حجۃ اللہ البالغہ بھی خصوصیت سے ان کے درس میں رہتی اس کے علاوہ ابن ماجہ شریف اور مشکوٰۃ شریف بھی آپ کے درس میں رہتی شمائل ترمذی کا بھی کئی سال تک درس دیا۔

۱۳۴۰ھ میں وہ دارالعلوم کے نائب مہتمم بنے اور انتظامی معاملات حسن وخوبی سے نبھائے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے انتقال کے بعد مہتمم کا اعلیٰ منصب ان کو سونپا گیا اور انھوں نے یہ ذمہ داریاں کچھ ایسی توجہ اور غیر معمولی صلاحیت سے نبھائیں کہ دارالعلوم دیوبند اور ان کے اسم گرامی ایک طرح سے ایک ہی سکے کے دو رخ کہلائے۔ آپ کی خدماتِ جلیلہ دارالعلوم کی بے پناہ مقبولیت اس کی بین الاقوامیت اور اس کی ترقی وکامیابی کی ضامن قرار پائیں۔

مصلح ورہنما حضرت مہتمم صاحب نے مصلح اور رہنما کے فرائض بھی اس طرح ادا کیے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کو ان سے اس دنیا میں یہی عظیم کام لینا تھا۔ مخلوق خدا کی ظاہری وباطنی اصلاح کو انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا۔ ضلالت وگمراہی کی راہوں میں رشد وہدایت کی شمع روشن کی اس کے لئے انھوں نے تصوف وسلوک، قلم کی سحر طرازی اور جادو بیانی اور پھر تقریر کے ذریعے دعوت وتبلیغ تینوں طریقے اپنائے۔

ان کا سلسلۂ بیعت ۱۳۳۹ھ میں شیخ وقت حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن سے

قائم ہوا۔ حضرت شیخ الہند کے وصال کے بعد قطب العالم حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طرف رجوع کیا اور آپ کے آستانے سے خلافت کا خلعت فاخرہ حاصل کیا۔ ان کے مریدین نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں ان کی تعداد ہزاروں سے زیادہ ہے۔

تصانیف قاری محمد طیبؒ اگرچہ دن رات کی گوناگوں مصروفیات کے سبب تصنیف وتالیف کے لیے زیادہ وقت نہ نکال سکے لیکن جو کتابیں انھوں نے تحریر کیں ان کا ہر عنوان اور ان کا ہر لفظ بھاری اور ضخیم کتابوں پر فائق ہے مولانا احمد سعید صاحب کے ترجمہ کشف الرحمٰن پر حضرت کا مقدمہ کتاب وسنت کے باہمی تعلق پر پُر مغز مقالہ ہے مولانا شبیر احمد عثمانی کی تقریر بخاری میں حدیثِ نبوی کے تعارف اور حجتِ شرعی ہونے کی تحقیق اگرچہ صرف ۲۱ صفحات پر مشتمل ہے لیکن اپنی جگہ ایک مکمل کتاب ہے ان کی چند تصانیف یہ ہیں:

۱-فطری حکومت	۲-اسلام اور فرقہ واریت
۳-سائنس اور اسلام	۴-مشاہیر امت
۵-شرعی پردہ	۶-التشبہ فی الاسلام
۷-فلسفۂ نماز	۸-شرعی پردہ
۹-داڑھی کی شرعی حیثیت	۱۰-مسئلۂ تقدیر
۱۱-اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام	۱۲-علم غیب
۱۳-خاتم النبیین ﷺ	۱۴-اسلام اور مغربی تہذیب
۱۵-تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام	۱۶-اصول دعوتِ اسلام
۱۷-عالمی مذہب	۱۸-نظریۂ دو قرآن پر ایک نظر
۱۹-کلمۂ طیبہ کی حقیقت وغیرہ	

ہندوستان وپاکستان کے مقتدر رسائل میں آپ کے جو علمی مقالات چھپے ان کی

تعداد بہت زیادہ ہے۔

خطیب ہمارے اکثر علماء اپنی تقریروں میں دین کی بحث عقائد کے راستے سے کرتے ہیں جس کی وجہ سے اکثر تقریریں اس عقیدے کے ماننے والوں کے لیے تو نافع ہوتی ہیں تاہم ان تمام انسانوں کو مطمئن نہیں کر سکتیں۔ جو تجسس و تفحص یا مختلف شبہات کا شکار ہوتے ہیں۔ حضرت والا میں خاص صفت یہ تھی کہ وہ تقریر کرتے وقت سامع اور ان کے مزاج اور ذہن کی رسائی کا ضرور وانداز ہ لگا لیتے تھے چنانچہ عورتوں سے خطاب ہے تو انھیں کے محاوروں اور انھیں کے تجربوں سے دین کی دعوت دی جاتی اور اصلاح کی کوشش کی جاتی اگر سامعین میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو ملک کے سبھی طبقوں سے تعلق رکھنے والے ہیں تو پھر وہ اسلام کی حقانیت کو جدید علوم کی روشنی میں پیش کرتے۔ آپ کی تقریر سننے والوں میں دیہات کے سیدھے سادے کسانوں سے لے کر یونیورسٹی کے لیکچرار، دانشور اور وزرائے حکومت وغیرہ شامل ہوتے۔ مثال کے طور پر آپ نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں "سائنس اور اسلام پر جو تقریر کی اور قرآن وحدیث سے سائنس کے بنیادی اصولوں کو جس بلیغ اور دل نشین انداز میں بیان فرمایا اس کی اہمیت وافادیت کے سبھی معترف تھے۔ حتی کہ سائنس کے موضوع کے ماہرین نے یہاں تک کہا کہ ہمیں ان اصولوں کی ہوا بھی نہیں لگ سکتی تھی۔

تعلیمات انہوں نے نبی کریم ﷺ کی جن پاکیزہ سنتوں اور طریقوں پر چلنے میں نفس یا معاشرہ مزاحمت نہیں کرتا ان پر عمل میں تاخیر نہ کرو جیسے کھانے پینے سونے، جاگنے، ملنے جلنے، وغیرہ کی سنتیں۔ اس سے بڑی سنتوں پر عمل کرنے میں آسانی رہے گی۔ ارشاد فرمایا کہ اپنی صحیح تدبیر پر کبھی بھروسہ نہ کر لینا آپ نے مثال دی کہ ہری بتی ریل گاڑی کو نہیں چلاتی بلکہ اس کے پیچھے ایک کلی نظام کی حمایت ہوتی ہے۔

ارشاد فرمایا کہ کسی مدرسے کے استاذ پر جب غصہ غالب ہو تو بچوں کی تادیب سے خطرناک نتائج تو پیدا ہو سکتے ہیں، اصلاح نہیں ہو سکتی۔

ارشاد فرمایا کہ جب کار نہیں چلتی تو بیٹری چارج کراتے ہیں اسی طرح جب ہمت قلبی کم ہونے لگے اور کام نہ چلے تو کسی اللہ والے سے اپنے دل کی بیٹری چارج کرالو پھر دینی کام آسان ہو جائے گا۔

ارشاد فرمایا کہ بدگمانی سے بڑے فتنے پیدا ہوتے ہیں حسن ظن سے تعلقات مضبوط ہوتے ہیں اور بدگمانی سے افتراق پیدا ہوتا ہے۔

ارشاد فرمایا کہ کسی بڑے کی بھی مجلس میں غیبت ہونے لگے تو فوراً اٹھ جانا چاہیے کیوں کہ بارانِ رحمت بہت عمدہ چیز ہے اس میں نہانا بھی مفید ہے لیکن اگر اولے برسنے لگیں تو پھر بھاگ ہی جانا چاہیے، فرمایا کہ ہماری زندگیوں میں شرعی برائیاں اور منکرات داخل ہیں جو مکھی اور مچھر سے زیادہ گندے اور کوئلے سے زیادہ کالے ہیں۔ لیکن ہمیں کوئی فکر نہیں وغیرہ وغیرہ۔

مختصراً یہ کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی زندگی پر سرسری نظر دوڑانے کے لیے بھی ایک عمر چاہیے۔ بقول شاعر ؎

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق ❁ رکھی ہے آج لذتِ زخم جگر کہاں

لحن داؤدی کے نمائندے

مہر و وفا کے پیکر، دنیا کی تمام اچھائیوں کے گوہر یکتا، چمنستانِ قاسم کی یادگار، ملتِ اسلامیہ اور عالم اسلام کے دلوں کی دھڑکن، ساٹھ سالہ قربانیوں کی منھ بولتی تصویر اور مجسم تاریخ، علم و عرفان کے دلدادگان کے لیے تازگی اور حیاتِ نو کا پیغام، لحنِ داؤدی کے نمائندہ اور ترجمان اپنے تمام مداحوں، فیض پانے والوں اور محبت کرنے والوں کو روتا بلکتا ہوا چھوڑ کر ۷ ار جولائی ۱۹۸۳ء کو دو سال قبل اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے ”کل من علیها فان“ سچ ہے کہ عالم کی موت، عالم کی موت ہے، طاہر لائل پوری کا یہ شعر فوراً زبان پر آجاتا ہے ؎

یہ سیلِ فنا کس قدر تیز رو ہے ❁ ابھی کا وقوعہ، ابھی کا فسانہ

خراجِ عقیدت دنیا کے کونے کونے سے ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ خراجِ عقیدت پیش کرنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے مگر ان میں سے چند نام یہ ہیں:

صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ، سابق وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی، سیدنا برہان داؤدی، ڈاکٹر یوسف نجم الدین، اسلامی یونیورسٹی سورت، مولانا قاضی سجاد حسین صاحب فتح پوری دہلی، مولانا منت اللہ مونگیر، مولانا نظام الدین ناظم امارتِ شرعیہ بہار، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی (مرحوم) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ احمد سعید صاحب ملیح آبادی، ایڈیٹر آزاد ہند کلکتہ۔ اور بہت سے دیگر حضرات جن کے اسمائے گرامی وقت اور جگہ کی قلت کے باعث احاطۂ تحریر میں نہیں آسکے۔

دُرِّ یکتا حضرت قاری طیب صاحب کی جامع کمالات شخصیت پر قلم اٹھانے کے لیے کئی دفتر درکار ہیں۔ آپ کی ہر خوبی اپنی جگہ ایک مستقل عنوان ہے۔ وہ فہم وبصیرت کے درِ یکتا۔ دارالعلوم دیوبند کے امین وامیر، عالم اسلام کی مقتدر ہستی، طلباء کے شفیق، علماء کے مربی، عوام کے رہنما، انسانوں کے ہمدرد اور غمگسار، بلا لحاظِ مذہب وملت سب کو یکساں فیض پہنچانے والے، اسوۂ رسول کا اتباع کرنے والے، نرم خو، نرم دل شیریں گفتار، شیریں مقال، خوش کردار، مردِ باصفا کس کس خوبی کو گنوایا جائے میرؔ نے کیا خوب کہا ہے ؂

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

مختصراً یہ کہ: خاموشی درثنائے تو حد ثنائے تست

(منقول از ہفت روزہ قومی آواز مؤرخہ ۱۴ جولائی ۱۹۸۵ء)

❁❁❁

حکیم الاسلام، فخرِ روزگار، دانائے زمانہ

(از: ابن الانور مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر، سابق مدیر ماہنامہ دار العلوم دیوبند

خونِ ناحق کہیں چھپتا ہے چھپائے سے امیر
کیوں وہ بیٹھے ہیں میری نعش پہ دامن ڈالے

موت کی پر پیچ اور ہولناک وادیوں میں اس سے پہلے خبر نہیں کتنے کروڑ انسانی وجود، بلند وبالا انسانی عظمتیں، بڑے بڑے بادشاہ، بڑے جاہ جلال کے فرماں روا، وقت کے مدبر وحکمراں، کروڑ پتی تاجر، پیل تن پہلوان، میدان جنگ کی رونق بننے والے سورما، بڑے بڑے صنعت کار، امیر وغریب، شیخ وشاب اور زن ومرد اس طرح کھو گئے کہ آج صفحۂ عالم پر ان کا کوئی ایک نشانِ قدم بھی نہیں ملتا، تاریخ کے کسی ستون پر ان کا نام کندہ نہیں، کوئی ان کا نام بھی نہیں جانتا، کسی کو ان کی یاد نہیں آتی، کسی بھی قبرستان میں جاؤ وہاں سینکڑوں اور ہزاروں انسانی لاشے زمین میں دفن ملیں گے مگر ایک ہولناک سناٹے اور کافور وکفن میں لپٹی ہوئی خوشبو کے سوا ہمیں کچھ اور نہیں ملے گا۔ حد نظر ایک بیکراں سکوت، سائیں سائیں کی خوفناک آوازیں۔

مگر ۷؍ جولائی کو دن کے ۱۱ بجے وہ ایک شخصیت جسے خود اپنی اولاد نے قتل کیا، علم وفضل کے جس گلستانِ بے مثال کو اس نے ۶۰ سال تک اپنے خون جگر سے سینچا اسی گلستاں کے نوکیلے خاروں نے اس کے حسین جسم کو لہولہان کر دیا یہ شخصیت تھی حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ کی۔

مجھے مت سناؤ کہ ۶؍ مہینے سے اپنے ساتھیوں، اپنے شاگردوں، اپنی معنوی اولاد کے ہاتھوں قتل شدہ یہ شخصیت اپنے آستانۂ علمی کے ایک کمرے میں اپنے مجبور عقیدتمندوں کے ساتھ مقیم تھی، کبھی کبھی انتہائی حسرت کے ساتھ یہ معصوم صفت حسین وجود بے ساختہ اپنے

خدام سے پوچھتا تھا کہ ”میاں! تم سب کب دارالعلوم میں جاؤ گے“۔

موت کا ہر کارہ اس کے سرہانے کھڑا تھا چاہتا تھا کہ ایک نظر اپنے مرکز علمی پر ڈال آؤں۔ قریبی خدام بے بس تھے ماحول میں صداقتوں اور عظمتوں کا سودا ہو چکا تھا حقیقتیں سرمایہ داری کے نوک دار خنجر سے قتل کر دی گئی تھیں، سچائیوں کا تانہ بانہ بکھر چکا تھا۔ خدام یہ کہہ کر اسے تسلی دیتے تھے کہ بس حضرت! اب حالات درست ہونے والے ہیں ان شاء اللہ ہم سب اپنے محبوب مرکز اور اپنے گھر میں ضرور پہنچیں گے۔ موت کے قدموں کی چاپ اور تیز ہوگئی۔ خود حکیم الاسلامؒ اپنی زندگی اور دارالعلوم کی زیارت کی خواہش سے مایوس ہوگئے۔ تو انتہائی مایوسی کے عالم میں آپ نے آخری وصیت فرمائی کہ میری نماز جنازہ دارالعلوم میں پڑھانا۔ پھر، دارالعلوم میں پڑھنے پڑھانے کے صرف آدھ گھنٹے میں جو تلخیاں پیش آئیں ان کا ذکر آج نہیں تو کل ہوگا اور ضرور ہوگا۔ یہ کسی طبقہ، کسی فرد، کسی سیاست اور کسی سیاسی لیڈر کی مخالفت نہیں ہماری اپنی نامردی کی داستان ہے کہ حکیم الاسلامؒ نے مسلک دارالعلوم کی حفاظت اور ہم ۸۸ر متعلقین دارالعلوم کے لیے اپنی جان قربان کردی۔ ہم ۸۸ کفن برداروں اور غلامان بارگاہ قاسمی نے اپنی چالیس، چالیس سال کی ملازمتوں، اپنے واحد ذریعۂ معاش، اپنے اہل وعیال کی ضرورتوں کو حضرت کے قدموں پر نچھاور کر دیا۔ اور اے خداوند برتر بہتر! تیری بارگاہِ عالی میں ہم فریاد لے کر آتے ہیں کہ ہمارے محسن کے پاس ہمارے روزگار اور ہماری معیشت کو بحال کرنے کا اب کوئی ذریعہ نہیں تھا مگر اس نے شرطِ وفاداری نبھائی اور اپنی لاکھوں، کروڑوں روپے کی زندگی کو ہم پر قربان کر دیا!

آج وہ شخصیت ہمارے درمیان سے اٹھ گئی جو قدم قدم پر ہمیں صبر وخاموشی کی تلقین کرتی تھی۔ اس کی موت نے ہمارے صبر کے بندھنوں کو توڑ دیا ہے۔ ہم روئیں گے، اتنا روئیں گے کہ ہمارے سیلاب اشک سے سیاسی اقتدار کے یہ سب محل بہہ پڑیں گے، ہم چیخیں گے اتنا چیخیں گے کہ پورا ملک ہمارے نالہ وشیون سے لرز اٹھے گا۔

حکیم الاسلام محمد طیب قاسمی نور اللہ مرقدہ کی رحلت نے ہمیں ایک ہی سبق دیا ہے کہ ناجائز مصلحتوں سے ہم کوئی سمجھوتہ نہ کریں اور دار العلوم کے علمی روحانی مسلک کی حفاظت کے لیے جس طرح امیرِ کارواں نے اپنی جان دی ہے۔ اسی طرح ہم ۱۸۸اس کے کفش بردار اس کے مزار کے سامنے اپنی لاشوں کے انبار لگا دیں۔

کٹتے بھی چلو، مرتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
بڑھتے ہی چلو، کہ اب ڈیرے منزل پہ ہی ڈالے جائیں گے

❁❁❁

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ

اکابرِ دیوبند کی آخری یادگار

(از: حضرت مولانا شمس تبریز صاحب قاسمی ندوۃ العلماء لکھنو

عالم اسلام خصوصاً ہندوستانی مسلمان ایک عرصہ سے قحط الرجال کی ایسی آزمائش سے دوچار ہیں کہ ہر سال ان کی دینی وثقافتی، علمی وسیاسی صفوں میں کوئی نہ کوئی کمی محسوس ہوتی ہے اور نمایاں خلا پیدا ہوجاتا ہے جو عرصے تک پُر ہوتا نظر نہیں آتا۔

خصوصاً کسی ممتاز عالم ربانی شخصیت کا اٹھ جانا ہماری ملت کو داغ یتیمی ومحرومی دے جاتا ہے رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے علماء کو انبیاء کا وارث وجانشیں بتایا ہے اور ان کی موت کو علم دین کا ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔

عن عبد الله بن عمر بن العاص رضی الله عنهم قال: سمعتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ان الله لا يقبض العلم انتزاعاً ينتزعه من العبادولكن يقبض العلم بقبض العلماء حتى اذا لم يبق عالما اتخذ الناس روؤساس جهالا فافتوا بغير علم فضلوا واضلو. (صحیح بخاری کتاب العلم)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ علم کو یکبارگی نہیں اٹھالے گا کہ اسے لوگوں کے دلوں سے نکال لے، بلکہ علم کو علماء کی موت کے ذریعہ اٹھائے گا، یہاں تک کہ جب کوئی عالم نہیں رہ جائیگا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے چنانچہ وہ سوال کئے جائیں گے تو بغیر علم کے فتویٰ دیں گے اس طرح خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔

گذشتہ شوال ۱۴۰۳ھ (۱۷رجولائی ۱۹۸۳ء) کو بھی ایک ایسا ہی حادثہ پیش آیا

جب اکابر دیوبند کی آخری یادگار حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قاسمی نے اس دارِ فانی کو الوداع کہا رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

حضرت مولانا مرحوم کی ہشت پہل شخصیت کا نمایاں وصف ان کی جامعیت وہمہ گیری، علم وثقافت کے مختلف پہلوؤں میں ان کی نظر عالمانہ کی گہرائی اور فکر کی وسعت وگیرائی تھی جو دار العلوم دیوبند کے اکابر کا فیضان تھی۔

علوم اسلامیہ کی تقریباً تمام ہی شاخوں پر انکی نظر۔ منقولات کے ساتھ معقولات، بنیادی اسلامی علوم (فقہ وحدیث وتفسیر) کے پہلو بہ پہلو تصوف وکلام ومناظرہ اوران کے ساتھ شعروادب بھی آپ کے گلشن فضل وکمال کے غنچہ وگل تھے۔ جن کے رنگ وبو سے ان کی دلکش ولنواز شخصیت عبارت تھی۔

بہار عالمِ حسنش دل وجاہ وجاں تازہ می دارد
برنگ اصحابِ صورت رابہ بوارباب معنیٰ را

اسی جامعیت کے ساتھ انھوں نے علوم اسلامیہ کی دیرینہ روایت کا تسلسل قائم رکھا اوراس ثقافتی امانت وسرمایہ کو جو حضرت شاہ ولی اللہ تک پہنچی تھی اسے اپنے اکابر کے ہاتھوں سے لے کر نئی نسلوں کے حوالے کیا اور عصر حاضر میں اس کی معنویت واہمیت کو مزید اُجاگر کیا اور نئے مسائل وحالات کے پیش نظر اسلامی تعلیمات کے استحکام وبقا اور نشوونما کا ماحول پیدا کرنے اور اسلام اور مسلمانوں کے حق میں علمی ومعاشرتی فضا کو سازگار بنانے اور عوام وخواص کو اسلامی پیغام واحکام کی حکمت ومصلحت سے آگاہ کرنے کا فرض بخوبی انجام دیا۔

اپنی اسی جامعیت کے سبب انھوں نے اسلاف واکابر دیوبند کے طرز پر تمام علوم اسلامیہ کی طرف توجہ مرکوز رکھی اور برصغیر کے مسلمانوں اوران کے علمی وثقافتی مرکزوں کو اپنی تقریر دلپذیر اور عالمانہ تحریر سے فیضیاب کیا۔ آپ کی تقریروں میں شاید اللہ تعالیٰ نے وہی تاثیر ودلکشی رکھدی تھی جو کبھی ان کے نامور داداحجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم

صاحبؒ کی تقریروں میں ہوتی تھی جس کے ذریعے انھوں نے مباحثہ شاہجہانپور اور میلہ خداشناسی کے معرکے سر کیے۔ اور آریہ سماجی پنڈتوں کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔

عالمانہ، حکیمانہ اور متکلمانہ تقریروں میں شاید ان کا کوئی دوسرا معاصر ان کا ہم سر و ہم چشم نہ تھا، کتاب و سنت اور علمائے امت کے علمی ذخیرے سے برجستہ و برمحل استفادہ، منطقی استدلال، داعیانہ جذبہ، مجتہدانہ نظر حکیمانہ اسلوب، اور خطیبانہ حاضر دماغی، ونفسیات شناسی اور شستہ زبانی وشگفتہ بیانی نے مل جل کر ان کی تقریروں کو ایسا حسن قبول بخشا تھا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسی توفیق ومقبولیت سے نوازہ تھا کہ وہ موافق ومخالف سب کے دل موہ لیتے اور اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ ان کی تقریروں کی یہی کشش تھی جس کے سبب وہ ہمیشہ ہند و بیرون ہند کے سفر پر رہتے تھے اور ہندوستان کا شاید ہی کوئی شہر ان کی تقریر سے محروم رہا ہو۔

تقریروں کی طرح ان کی تحریریں اور کتابیں بھی (جن کی تعداد قریب ڈیڑھ سو ہے) ان کے رنگ تقریر کی حامل ہیں اور ان کے اندر علمیت وروحانیت اور مواد اسلوب کی بہت سی خوبیاں موجود ہیں اور ان میں اکثر کتابیں بہت اہم موضوعات پر ہیں اور انھوں نے عصر حاضر میں اسلام کی تفہیم وترجمانی میں اپنا خاص کردار ادا کیا ہے اور عوام وخواص کی دینی تربیت ورہنمائی میں بڑا اہم حصہ لیا ہے۔ ادارہ ''تاج المعارف'' دیوبند کے ذریعے ان کی بہت سی کتابیں پابندی کے ساتھ شائع ہوئیں اور انھوں نے اسلامیات کے اردو ذخیرے میں مقدار ومعیار کے لحاظ سے بیش قیمت اضافہ کیا۔

ان کی سب سے بڑی، قابل قدر، اور لائق تقلید خصوصیات میں مسلک اہل سنت والجماعت میں ان کی وفاداری ووابستگی، علمائے سلف کی قدردانی اور ان کے لیے عذر خواہی، اکابر امت سے استناد، اور ان پر اعتماد اور مشاہیر اسلام کے علمی وعملی کارناموں کی روشنی میں اجتہاد اور ان کے علمی وثقافتی ورثہ سے فراخ دلی اور وسیع النظری کے ساتھ استفادہ، اسلام کے ماضی سے خوش گمانی اور حال ومستقبل کی طرف سے امید پروری کے

ساتھ فکر مندی، فکرولی اللہی اور اس کے حامل و امین اکابر دیوبند خصوصاً حضرت مولانا محمد قاسمؒ کے گہرے اسلامی افکار پر عبور اور ان سے عقیدت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس دور میں (مولانا سندھیؒ کے بعد) وہ مسلک دیوبند اور مولانا نانوتویؒ کے متکلمانہ و مجتہدانہ سلسلے کے سب سے بڑے مفکر و حکیم اور شارح و ترجمان اور اپنے طرز پر حکمت قاسمیہ کے آخری حامل و امین اور علم کلام کے دیوبندی دبستاں کے عقائد و مقاصد کے سب سے بڑے نمائندہ تھے۔

میں کہ میری نوا ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام زندگی کھوئے ہوؤں کی جستجو

اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے دوسرے مکاتب خیال کی خدمات کی قدر و تحسین اور ان کے بارے میں ہمدردانہ رویہ اور معتدل و متوازن رائے رکھنا۔ تلخ کلامی، بہتان طرازی اور افترا پردازی و عدم رواداری سے اجتناب، اپنے مخالفوں کے ساتھ عفو و تحمل، نرمی و خوش مزاجی کا برتاؤ، ان کے فکر و شخصیت دونوں کا امتیاز خاص تھا اور وہ حافظ کے اس شعر کے بہترین مصداق تھے کہ ؎

آسائشِ دوگیتی تفسیر ایں دو حرف است
بادوستاں تلطف بادشمناں مدارا

ان کی یہی وسیع النظری، بلند نظری اور خوش اخلاقی تھی جس کے سبب سے دیوبندی مسلک کے مخالفین یا غیر جانبداری حلقے بھی ان پر اعتماد کرتے تھے اور ان کی رائے و مشورہ سے مستفید ہوتے تھے اس طرح وہ ہندوستانی مسلمانوں کے ان چند اکابر کی صف میں شامل تھے جن کی اکثریت کو اعتماد و اطمینان تھا اور ان کو وہ اپنا متفق علیہ عالم سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے جب ان کے ایما پر دیوبند میں ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' کا اجتماع ہوا تو علمائے ہند کی اس اہم مجلس کے وہ صدر بنائے گئے اور اس معزز عہدے پر تاحیات فائز رہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اہم علمی و ثقافتی اداروں ندوۃ العلماء مظاہر علوم،

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ میں وہ یکساں احترام کے ساتھ مدعو کیئے جاتے تھے۔

وہ ایک بلند پایہ عالم اور ممتاز خطیب اور فاضل اہل قلم ہی نہ تھے بلکہ اسلافِ دیوبند کے طرز پر احسان وعرفان اور اخلاص وایقان کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ تھے اور ہند وپاک میں ان کے مریدوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے۔ ایک گہری روحانیت ان کی زندگی کے ہر دور میں نمایا رہی۔

دارالعلوم کے اجلاسِ صد سالہ ۱۹۸۰ء میں اپنے اندر فرحت وندامت کے گوناگوں پہلو لے کر آیا اور تنظیم ابنائے قدیم کے نام سے وہ اختلاف اور خانہ جنگی شروع ہوئی جس سے دارالعلوم اور اس کے دوستوں اور فرزندوں کا وقار مجروح ہوگیا اور برصغیر کے اس عظیم علمی وثقافتی اور روحانی ادارے میں دنیوی سیاسیات کے مظاہرے سامنے آنے لگے۔ اس کا علمی وتعلیمی معیار پست ہوا۔ اس کے فرزندوں کا کردار متاثر ہوا اور دیوبند کی دیرینہ روایات وخدمات کے تسلسل میں بہت سی رکاوٹیں پیدا ہوگئیں۔ مقدمات کا سلسلہ اور باہمی بداعتمادی کی فضا اب تک قائم ہے۔ بیرونی عناصر اور دارالعلوم کے دوست نما دشمنوں کی مداخلت اور بالآخر دارالعلوم کی پامالی وبدحالی کے خطرات وخدشات اب تک برقرار ہیں۔

اخیر میں چند ذاتی تاثراتی واقعات کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے ۱۹۵۵ء کے بعد اپنے وطن بھوجپور کے مدرسہ اشرفیہ کے سالانہ جلسوں میں آپ کی زیارت کا شرف اور آپ کے مواعظ حسنہ کی سماعت کی سعادت حاصل ہوئی۔ ۱۹۶۱ء میں دارالعلوم دیوبند میں اپنی طالبِ علمی کے بعد سے ان کی مجلسوں میں اکثر حاضری کی عزت حاصل ہوئی بہت سے ملفوظات میرے پاس قلمبند ہیں۔ ان مجلسوں میں سوالات کی پرچی بڑھا دیتا اور حضرت مولانا ان کے شافی جواب عنایت کرتے۔

رئیس احمد جعفری کی فرمائش پر میں نے مولانا مرحوم سے مولانا محمد علی اور علمائے

دیوبند کے تعلق پر کچھ لکھنے کی درخواست کی تو مولانا مرحوم نے ایک مختصر مضمون سپرد قلم کر کے میرے سپرد کیا وہ مضمون جعفری صاحب کی مرتبہ "علی برادران" میں لاہور سے اور ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کے ۱۹۶۴ء کے کسی شمارے میں شائع ہوا۔ دیوبند کے ایام طالب علمی کی ایک خوش قسمتی حضرت مولانا کے ہفتہ وار درس "حجۃ اللہ البالغہ" میں شرکت بھی ہے جس کا سلسلہ حضرت کے اسفار کے سبب قائم نہیں رہتا تھا انھیں ایام طلب میں مفتی ظفیر الدین صاحب (مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند) کے ساتھ حضرت مولانا کے قیمتی کتب خانہ کی ترتیب جدید میں شرکت کا موقع بھی ملا

۱۹۶۴ء کے آس پاس محدث جلیل شیخ عبدالفتاح ابوغدہ اپنے تبلیغی دورے پر دیوبند بھی تشریف لائے اور دارالعلوم کی زیارت سے بہت مسرور ہوئے دارالحدیث کی تقریر میں انھوں نے فرمایا کہ ہندوستانی اہل علم اور علمائے دیوبند کی اہم تصنیفات کا عربی میں ترجمہ ہو تو یہ بڑی علمی خدمت ہوگی اور اس سے عالم اسلام میں استفادے کی راہ کھل جائے گی اس سلسلے میں انھوں نے مولانا گیلانیؒ کی "تدوین حدیث" وغیرہ کا خصوصی تذکرہ کیا تھا۔ طلبۂ دارالعلوم سے شیخ ابوغدہ کے خطاب کے اکثر جملے مرصع اور مقفے تھے ان کا ایک جملہ اب تک کانوں میں گونج رہا ہے "نقد الجاهل في الكيس، نقد العالم في الكراريس"۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ندوۃ العلماء کے جشن تعلیمی ۱۹۷۵ء میں آپ کی زیارت ہوئی اور تقریر بھی سنی پھر مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس رانچی ۷۸یا۷۹ء میں پھر آپ کی زیارت ہوئی اور یکجائی کا موقعہ ملا۔ رانچی ہوائی اڈے پر حضرت مولانا علی میاں ندوی صاحب مدظلہ اور حضرت قاری صاحبؒ کو رخصت کرنے حاضر ہوا تو اس موقعہ پر مولانا علی میاں صاحب مدظلہ العالی نے حضرت قاری صاحبؒ سے میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ "یہ آپ کے مولوی شمس صاحب عرصہ سے میرے ساتھ ہیں، اس پر حضرت مولانا مرحوم نے اپنے معنی خیز اور خاص انداز میں فرمایا ہم سب آپ ہی کے ہیں اس میں

اس طرف اشارہ تھا کہ بھی اکابر دیوبند ''حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک سے وابستہ یا اس کے بہی خواہ ہیں۔

اس کے بعد مارچ ۱۹۸۰ء میں اجلاس صد سالہ کے موقعہ پر دیوبند کے اس عظیم یادگار اجتماع میں آپ کی زیارت اور خطاب سے مشرف ہونے کا موقعہ ملا اور آپ کی اقتداء میں اس نماز جمعہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی جس کے نمازیوں کی تعداد میدان عرفات کے حاضرین کے غالباً برابر تھی۔

حضرت مولانا طیب صاحب کی مغتنم اور یادگار شخصیت اور فقید المثال ہستی کے بارے میں مختصراً لکھ کر اس کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا، اس کے لیے ان کی مفصل سوانح عمری کی ضرورت ہے۔ خصوصاً ان کی علمی خدمات پر مفصل تبصرے کی بھی ضرورت ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے طور پر اکابر دیوبند کی آخری یادگار اور اپنی مثال آپ تھے ان کے علم سے حکمت قاسمیہ اور دبستانِ دیوبند کی دیرینہ روایت قائم تھی اور اس کا تسلسل کسی نہ کسی طرح برقرار تھا۔ اس دور قحط الرجال میں دور دور آپ کا ثانی تو در کنار آپ کا بدل بھی نظر نہیں آتا جس کی شخصیت کے آئینے میں اکابر و اسلاف کی کچھ جھلکیاں دیکھی جا سکیں، افسوس صد افسوس کہ ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

❁❁❁

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

ایک آفاقی شخصیت

از: حکیم محمد الیاس صاحبؒ میرٹھی

ایشیاء کی عظیم ترین اسلامی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ نور اللہ مرقدہ۔ایک ہمہ گیر اور آفاقی شخصیت کے مالک تھے۔مولانا طیب صاحب حسب ونسب کے اعتبار سے بلند پایہ۔فضل وکمال کے اعتبار سے گوہر گراں مایہ اور علم وفن، کردار وگفتار، اور تقویٰ وپاکیزگی دنیا میں مانند آفتابِ عالم ثابت تھے۔جدامجد بانی دارالعلوم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے استعماری اور فرنگی طاقت سے ٹکر لی اسلام اور ملت اسلامیہ کے بقاء واستحکام کے لیے خلوص وللّٰہیت کے جذبہ سے سرشار ہوکر سرفروشانہ جدوجہد فرمائی۔والد ماجد حضرت مولانا احمد صاحبؒ نے منصب اہتمام پر فائز ہوکر دارالعلوم کی تعمیر وترقی میں سردھڑ کی بازی لگائی اور مسند افتاء وفقہ پر متمکن ہوکر علوم شرعیہ کی ترویج واشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔

مولانا محمد طیب صاحب اپنی خاندانی اقدار وروایات کے امین کی حیثیت سے عالی ظرفی فراخ وحوصلگی اور وسعت نظری کے علم بردار تھے۔دارالعلوم دیوبند کے انتظام وانصرام کے لیے ایسے ہی کشادہ دل صاحب بصیرت اور خداترس بزرگ کی ضرورت حضرت مولانا نے اپنے ذاتی اور خاندانی اوصاف وخصائل کو جو سیرت طیبہ اور اسلامی اخلاق وآداب کا عکس جمیل ہیں، دارالعلوم کے نظم تعلیم وتربیت سے ہم رشتہ کیا،تو دارالعلوم کو ایک عالمی اور آفاقی ادارہ بنادیا،حضرت حکیم الاسلام نے مسلک دیوبند کو اصل ،اور دیگر افکار ونظریات کو لایعبادھا کی حیثیت سے روشناس کرایا،مختلف فکر ونظر کے

اربابِ فضل وکمال کو وحدتِ مسلک کی بنیاد پر متحد کیا۔

اور مجلس شوریٰ اور حلقہ اساتذہ وکارکنان میں ان سب کو متحد یک دل ہوکر کام کرنے کا موقع عنایت فرمایا، اس صدی کے منتظمین اور اربابِ بست وکشاد میں یہ امتیازی شان صرف حضرت حکیم الاسلام کو ملی دارالعلوم میں مختلف شعبہ جات کا قیام اور مختلف علوم وفنون کی ترویج اس وصف عظیم کی کھلی مثال ہے۔

قرآن وحدیث ، افتاء وفقہ، تفسیر وادب ،فلسفہ اور معقولات طب اور سائنس کی تدریس نے مدرسہ اسلامی عربی دیوبند کو دارالعلوم والفنون سے بدل کر جامعہ اور ازہر الہند بنادیا تھا اس موقع پر اس واقعہ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جس سے حضرت حکیم الاسلام کی بلندیٔ فکر وعمل اور ان کے دردمندِ عوام ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ میرے والد مولانا حکیم محمد اسحاق صاحب کٹھوری خلیفہ حضرت گنگوہی قدس سرہ سے حضرت کے دیرینہ روابط تھے۔ اکثر وبیشتر ان کے ساتھ ظرافت ومزاح اور خوش طبعی کا اظہار فرمایا کرتے تھے جب حضرت حکیم الاسلام نے جامعہ طبیہ قائم کرنے کا عزم فرمایا تو حضرت حکیم صاحب کو جو دارالعلوم کی شوریٰ کے رکن ورکین بھی تھے، دیوبند بلوایا اور فرمایا کہ حضرت حکیم صاحبؒ آپ نے اپنے فیضانِ علم وحکمت سے ہمیں تو بہت فائدہ پہنچایا لیکن ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے واسطے سے خلق خدا کو فیضیاب کریں۔ اور شعبہ طب کے قیام میں مدد دیں۔ حضرت حکیم صاحب نے اپنے مخلصانہ تعاون اور گرانقدر صلاح ومشوروں سے شعبہ طب کے قیام میں بڑا تعاون فرماتے رہے۔

خادم راقم الحروف کو بھی بحیثیت سکریٹری جامعہ طبیہ دارالعلوم دیوبند کی خدمت انجام دیتا رہا ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کو اپنی انفرادی ترقی اور خوشحالی کی کبھی فکر نہ ہوئی ،پوری زندگی اپنے دادا مرحوم کے مکان میں گزاردی حضرت کا مشرب اور مسلک دارالعلوم کی بقاء ارتقاء جماعتِ دیوبند کا اتحاد ملت اسلامیہ کی دینی معاشرتی وفلاح کے علاوہ کچھ نہ تھا اور دارالعلوم کا یہ عظیم حادثہ حضرت حکیم الاسلام کے لیے نہ صرف باعث

اذیت بنا بلکہ لمحات زندگی کو اس قدر جلد سمیٹا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اسی کے ساتھ حضرتؒ کی زندگی کے ایک اہم پہلو صبر و استقلال کا عوام کے سامنے ظاہر ہوا یعنی سب کچھ ملنے پر بھی شکر تھا اور سب کچھ چھین جانے پر بھی صبر و استقلال تھا جہاں حضرتؒ نزاکت و نفاست مزاج میں اپنی مثال آپ تھے اقتدار جانے کے بعد مصائب کی برداشت پر صبر و قناعت پر بھی اپنے استقامت کا بیّن ثبوت فرمایا عوام الناس میں ثابت قدم کی مثال قائم فرمادی۔

وما توفیقی الا باللہ

❁❁❁

حضرت قاری صاحبؒ کچھ نقوش وتاثرات

(از: قاری منظور احمد صاحب گھوسوی

استاذ جامعہ مظہر العلوم بنارس

بیسوی صدی عیسوی کے ہندوستان کی جن مایۂ ناز شخصیتوں کا ذکر جمیل عالم اسلام کی تاریخ میں مثبت ہوگا ان میں حضرت قاری صاحبؒ کے نام نامی کو نمایاں مقام حاصل ہوگا۔ بلکہ جب تک قاری صاحب کا نام شامل نہ ہو تاریخ ناقص رہ جائے گی آپ تاریخ اسلامی کا چمکتا ہوا عنوان ہیں۔ ایک مستقل باب ہیں۔ ایک اہم دور ہیں دارالعلوم دیوبند کو جو قبول عام حاصل ہے یقیناً اس کے پیچھے حاجی عابد حسین صاحب اور حضرت قاسم نانوتوی ودیگر اکابر کی قربانیاں اور پُر خلوص دعائیں، لیکن آل انڈیا بلکہ عالمی پیمانے پر دارالعلوم دیوبند کے تعارف کا سہرا قاری صاحب کے سر بندھتا ہے۔ ملیشیا، انڈونیشیا، سنگاپور، برما، لنکا، افغانستان، پاکستان، افریقہ، برطانیہ اور دیگر ممالک سے تشنگان علوم نبویہ قاری صاحب کے دور اہتمام میں ہی زیادہ آئے قاری صاحب کی خصوصیات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ان کا دور سابق مہتممین کی بہ نسبت سب سے زیادہ طویل رہا۔ پچاس سال سے بھی زائد عرصے تک آپ مہتمم رہے گویا دارالعلوم دیوبند سو سال سے زائد عمر کا نصف حصہ قاری صاحبؒ کی سرپرستی واہتمام میں گزرا۔ برصغیر ہند میں جہاں قدم قدم پر اختلاف بلکہ مخالفت وعناد سے سابقہ پڑتا رہتا ہے اسی اہم ذمہ داری کو عرصہ دراز تک انجام دیتے جانا کرامت ہی کہی جائیگی جہاں ان کی سوجھ بوجھ پر یہ بات دلالت کرتی ہے وہیں یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ آپ پر ملت اسلامیہ ہند کو پورا بھروسہ تھا یہ اعزاز بھی قاری صاحبؒ کو حاصل ہے کہ مشائخ حدیث کی جلیل القدر ہستیاں، جیسے حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مدنیؒ، حضرت مولانا فخر الدین

صاحبؒ ان کے دور اہتمام سے گزریں۔ حضرت قاری صاحبؒ کے لیے یہ بات بھی باعث افتخار ہوگی کہ قیام دارالعلوم سے لے کر اب تک جس قدر فضلاء ہوئے ان میں زیادہ تعداد ان کی ہے جو قاری صاحبؒ کے دور اہتمام میں فارغ ہوئے اس شرف میں مشکل سے کوئی ان کا شریک سہیم ہوگا۔

قاری صاحبؒ کی چھاپ دارالعلوم پر اور دارالعلوم کا عکس قاری صاحبؒ کی شخصیت پر کچھ اس طرح پڑ رہا ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کر کے تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ دارالعلوم دیوبند کا تصور قاری صاحبؒ کے بغیر اور قاری صاحبؒ کا تصور دیوبند کے بغیر محال نہیں تو سخت مشکل ہے۔

قاری صاحب کو اللہ تعالیٰ نے بڑی مقبولیت اور ہر دلعزیزی عطا فرمائی تھی اور مقبول عام ہونے میں آپ کی شیریں مقالی اور خوش خصالی کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا، مرنجان مرنج طبیعت میں بھی آپ منفرد تھے، حلم و بردباری میں آپ سلف کا نمونہ تھے۔ شدید تناؤ اور اشتعال کی فضا میں جہاں بڑے بڑے لوگ بشری تقاضے سے مجبور ہو کر بے قابو ہو جاتے ہیں، قاری صاحبؒ کو مسکراتے دیکھا گیا حلم کے اس بلند مقام پر تو بس خاصان خدا ہی فائز ہوتے ہیں ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

درس نظامیہ کے قدیم فضلاء کے بارے میں (باستثنائے چند) عام طور پر یہ گمان رہا ہے کہ وہ لوگ سیدھی سادی اور سلیس اردو بولنے والے اور لکھنے پر قادر نہیں یا آسان اردو بولنا خلاف شان سمجھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نصابی کتب کو انتہائی انہماک سے پڑھنے پڑھانے کی وجہ سے وہ تمام علمی وفنی اصطلاحات اظہر ہو کر گویا تکیہ کلام بن جاتی تھیں، (یہ دراصل ان کا کمال تھا) جس کی وجہ سے تقریر و تحریر مشکل ہو جاتی تھی یہ بات قاری صاحبؒ کے ہم عصر بہت سے فضلاء میں بھی موجود تھی مگر خود قاری صاحبؒ باوجود علمی انہماک اور علوم غامضہ کے مطالعہ کی سلاست و تقریر میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔

آپکی تقریر نہایت شستہ و برجستہ اور ادبیت کی لطیف چاشنی لئے ہوئے ہوتی تھی۔

علم وکلام وفلسفہ وحکمت جو بہت خشک مضمون سمجھا جاتا ہے اور جس کے نام سے عوام تو عوام موجودہ زمانے میں طلباء بھی بھاگتے ہیں مگر قاری صاحبؒ کو زبان وبیان پر اس قدر قدرت حاصل تھی کہ فلسفہ وحکمت سے بھرپور تقریریں بھی نہایت دلچسپ معلوم ہوتی تھیں ہر آدمی اپنے ظرف کے مطابق قاری صاحبؒ کی تقریروں کی لذت سے مستفید ہوتا اور زبان حال سے کہتا۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

قاری صاحبؒ کی اسی حسن تقریر کی لذت سے محظوظ ہونے کے لیے جلسوں میں سامعین کا ہجوم بہت ہوتا تھا اگر ابتدائے تقریر میں حاضرین کی تعداد مثلاً پانچ ہزار ہے تو اختتام تقریر تک یہ تعداد ڈیڑھ گنی ضرور ہوجاتی اور سامعین کا یہ حال ہوتا کہ کوئی کہیں سے اٹھتا نظر نہ آتا۔

قاری صاحبؒ کی تقریر وخطابت کا انداز بھی انوکھا تھا عام مقررین کی طرح لب ولہجہ میں اٹھا پٹک اور اکھاڑ پچھاڑ بالکل نہیں تھی نہ بہت چیخ کر بولتے تھے نہ بہت فراٹے کے ساتھ تقریر کرتے اور نہ آواز میں جذباتی اتار چڑھاؤ تھا تین تین چار چار گھنٹے کی تقریریں شروع سے آخر تک یکساں اور پروقار ٹھہرے ہوئے لہجے میں ہوتی تھی۔ چوں کہ مجھ کو قاری صاحبؒ کی زیارت کا اتفاق بھی جلسوں ہی کی تقریب سے ہوا ہے اس لیے اس موقع پر اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

تقریباً ۱۹۶۵ء کی بات ہے کہ ہمارے قصبہ گھوسی میں خالص توحید وسنت کے شیدائیوں کی کوششوں سے ایک جلسہ سیرت کا اہتمام کیا گیا گھوسی کی سرزمین پر ایک طویل عرصہ کے بعد اس نوعیت کا جلسہ منعقد ہورہا تھا اس لیے اطراف وجوانب کے مسلمان بہت مسرور ومشتاق تھے۔ اس میں چوٹی کے مقررین شریک ہورہے تھے جیسے

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی، حضرت مولانا ابوالوفا صاحب شاہجہانپوری اور دیگر اکابر علماء (افسوس کہ یہ سارے اکابر اس دنیا سے رخصت ہو چکے) انھیں میں حضرت مولانا قاری طیب صاحبؒ کا نام نامی سرفہرست تھا۔

اس جلسہ کی ایک خاص بات یہ ہوئی کہ اصل میں جلسہ سہ روزہ تھا لیکن چہار روزہ ہو گیا حضرت قاری صاحبؒ کسی اتفاقیہ عذر کی بنا پر جلسہ کی تین روزہ مقررہ تاریخوں میں تشریف نہ لا سکے جلسہ کے تینوں ایام گزار کر مزید ایک دن کے وقفے کے بعد تشریف لائے اس وقت کا منظر آج بھی آنکھوں میں تازہ ہے۔ قاری صاحبؒ کی آمد کی خبر گرم ہے اہل قصبہ سڑک کے کنارے دیدہ دل فرش راہ کئے کھڑے ہیں پر شوق نگاہیں بار بار تاحد نگاہ غور سے دیکھ رہی ہیں اسی اشتیاق اور انتظام کے عالم میں قاری صاحبؒ بذریعہ کار گھوسی پہنچے۔ گیارہ بجے دن کا وقت رہا ہوگا اور قصبہ کے مشہور عالم مولانا وقار احمد صاحبؒ کے دولت کدہ پر سیدھے تشریف لے گئے اور غالباً ایک آدھ گھنٹہ وہیں ٹھہرے، اور وہیں پر قاری صاحبؒ کو قریب سے دیکھنے اور سلام ومصافحہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی پیرانہ سالی کے باوجود وجاہت وخوبصورتی ٹپک رہی تھی نہایت باوقار وحیا بار دیکھنے کو جی چاہے مگر جمال کی تابنا کی نگاہ خیرہ کئے دے رہی تھی۔ نظر پھیر کر دیکھنا مشکل تھا۔ قاری صاحبؒ کا اپنے مخصوص انداز میں نظر نیچی کئے ہوئے کرسی پر جلوہ افروز ہونا اور آنے والوں کے سلام کا شیریں انداز میں جواب دینا اور مصافحہ کرنا وہ منظر پردۂ خیال پر ایسا نقش ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو، قصبہ میں قاری صاحبؒ کی تقریر ہوئی۔ بڑا اژدہام رہا، اطراف وجوانب سے بالخصوص، مئو، کوپاگنج، پورہ معروف محمد آباد، مبارک پور وغیرہ سے شائقین کثیر تعداد میں گھوسی پہنچ کر شریک جلسہ ہوئے۔ میرا لڑکپن کا زمانہ تھا۔ اور اس عمر میں جلسے وجلوس میں شریک ہونے کا جیسا کہ شوق ہوا کرتا ہے مجھے بھی تھا پابندی کے ساتھ جلسہ میں شریک ہوتا رہا، کس عنوان پر کس نے تقریر کی اس سے کوئی بحث نہیں تھی، اور ہوتی بھی کیسے، اس عمر میں جب اپنے پلے کچھ پڑتا تب تو ہاں جلسے سے واپسی کے بعد جو باتیں

ذہن میں باقی رہ جاتی تھیں اور جس کا تذکرہ اپنے ساتھیوں سے فخریہ انداز میں کرتا تھا وہ کچھ اس قسم کا ہوتا کہ بہت بڑا تھا (مراد اس سے مجمع کی زیادتی ہوتی تھی) اور جلسہ کی سجاوٹ یوں تھی، دکانیں، فلاں فلاں چیز کی تھیں وغیرہ وغیرہ اس روز کی ایک خاص بات جو اطراف سے آنے والے کئی لوگوں کی زبانی سنا وہ یہ تھی کہ آج فلاں فلاں اسٹیشن (ریلوے بکنگ آفس) سے گھوسی کا ٹکٹ ختم ہوگیا۔ اور خود گھوسی ریلوے اسٹیشن کا بھی یہی حال تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قاری صاحب کو عجیب و محبوبیت اور کشش عطاء فرمائی تھی۔

دوسری مرتبہ قاری صاحبؒ کی زیارت احمد آباد میں ہوئی ۱۹۷۳ء کی بات ہے اس وقت میرا قیام ضیاء العلوم مجلس دعوۃ الحق کڑی میں تھا (قصبہ کڑی احمد آباد کے شمال مغرب میں تقریباً بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے) ایک روز یہ مسرت انگیز خبر سننے میں آئی کہ قاری محمد طیب صاحبؒ احمد آباد تشریف لا رہے ہیں اور بواہر ہال میں ان کی تقریر کا پروگرام ہے چناں چہ مقررہ تاریخ میں شوق دیدار مجھے بھی احمد آباد کھینچ لے گیا پروگرام کے سلسلے میں معلوم ہوا کہ ملک احمد کی مسجد میں قاری صاحبؒ نماز مغرب ادا فرمائیں گے اور نماز کے بعد ہی میں تقریر کریں گے۔ ہم لوگ بھی وہاں پہنچے مغرب کی نماز قاری صاحبؒ کی امامت میں ادا کی گئی نماز سے فارغ ہوکر قاری صاحبؒ بواہر ہال تشریف لائے اور حاضرین کو خطاب فرمایا۔ قاری صاحبؒ کے قویٰ پر پیرانہ سالی کے اثرات نمایاں تھے پھر بھی ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کی۔ اس قدر سامعین پر محویت رہی کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا مجمع ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا کہ حضرت نے تقریر کے اختتام کا اعلان فرمایا تو دل یہ چاہتا کہ ؎

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

یوں تو قاری صاحبؒ کے قدرت بیان اور دلچسپ تعبیرات کی مثالیں ان کی مطبوعہ تقریروں اور تحریروں میں بخوبی دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس موقعہ پر احمد آباد کی تقریر کے حوالہ سے ایک نمونہ ہدیۂ ناظرین ہے

دوران تقریر اسلام میں میزبان و مہمان کی حیثیت اور ان کی ذمہ داری پر گفتگو چل

پڑی اور اس سلسلہ میں ایک حدیث ''من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ'' اور برجستہ اس کا مفہوم اردو میں یوں پیش کیا کہ ''جو شخص خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کے فرائض میں سے ہے کہ مہمان کا اکرام کرے۔

عام طور پر فلیکرم کا ترجمہ یہ کیا جائے گا ''چاہئے کہ اکرام کرے'' اور ترجمہ غلط نہیں کہا جا سکتا لیکن چاہئے کے بجائے لفظ ''فرائض'' نے مفہوم کو جس قدر چست اور بلیغ بنا دیا نکتہ داں بلاغت سے پوشیدہ نہیں ہے۔ چاہئے کہ اکرام کرے کہنے پر پھر یہ وضاحت کرنی پڑتی کہ امر وجوب کے لیے آتا ہے لہٰذا اس حدیث کی رو سے مہمان کا اکرام واحترام بہت ضروری ہے اب اس طوالت میں پڑے بغیر ایسا پیرایہ اختیار کیا گیا کہ جو لفظی ترجمہ نہ ہونے کے باوجود ارشاد نبوی کے ترغیبی وتاکیدی منشاء کو سمیٹے ہوئے ہے اور ایک خاص لطف دے رہا ہے۔ مورخہ ۶ رشوال ۱۴۰۲ھ کے دن کا وہ لمحہ بڑا تکلیف دہ تھا جس وقت یہ خبر سننے میں آئی کہ حضرت قاری صاحبؒ وصال فرما گئے۔ بیماری کی اطلاع اگرچہ پہلے سے تھی لیکن اس کے باوجود اس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن قدرت کے فیصلے ہمارے چاہنے اور نہ چاہنے کے نہیں ہوتے۔ عشاء کے وقت جب کئی مسجدوں سے قاری صاحبؒ کے انتقال کی خبر کا اعلان کیا گیا تو ماننا پڑا اور بصد افسوس یہ کہنا پڑا کہ ؎

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے۔

❁❁❁

ایک جامع صفات شخصیت

خلیفۂ مجاز جانشین حکیم الاسلام خطیب العصر حضرت مولانا سالم صاحب قاسمی
مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

قطبِ ارشاد حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی جامع الصفات وجامع النسب اور جامع الکمالات ہستی تھی کہ ایک نظر دیکھنے والے اہلِ ایمان واخلاص کا یہ وجدان حق بجانب ہوتا تھا کہ ہم نے تمام اکابر صالحین کو دیکھ لیا، شرکاء مجلس حکیم الاسلامؒ کا یہ گمان برمحل ہوتا تھا کہ ہمیں تمام اسلافِ صالحین کی مجالس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوگئی۔

علمی شکوک وشبہات پیش کر کے حضرت حکیم الاسلامؒ سے اطمینان قلب حاصل کرنے والوں کا یہ اعتراف بالکل صحیح ہوتا تھا کہ قلوب کو شفاء بخشنے والے فیضان جملۂ اکابر ہمیں حق تعالیٰ نے بہرہ مند فرمادیا۔

مسائل ومعاملات میں حضرت حکیم الاسلامؒ سے مشورہ حاصل کرنے والوں کے اس احساس قوی کو کوئی قوت صفت میں تبدیل کرنے والی نہیں ہوتی تھی کہ "المجالس بالامانة" اور "المستشار موتمن" تمام عامل تمام صلحاء امت کے انداز پر ہمیں مشورہ میں سکینت قلب میسر آ گئی۔

افراد واشخاص، اجتماعات وتنظیمات اور مدارس ومعاہد وغیرہ میں پیدا شدہ اختلافات میں عمومی طور پر فریقین حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کو جج کی حیثیت برضا ورغبت اور باعتماد کامل وہ جو فیصلہ حاصل کرتے اس کا شرعی، عقلی، اور آئینی معیار عدل وانصاف کے جملہ تقاضوں کو پورا کرتا۔ اور فریقین کو اپنے اپنے موقف پر تمام قلبی شکوک وترددات سے نجات کا باعث بن کر نہ صرف مطمئن ہی کرتا، بلکہ فیصلہ کنندہ کے حق میں شکست وفتح کے بے معنی احساس کو ختم کر کے دعاء گو بنا دیتا تھا۔

طالبین ودعائے خیر اپنے مقاصد حسنہ کے لیے دعاء خیر کی بارگاہ قطبِ ارشاد حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ میں درخواست پیش کر کے جب ان مستجاب دعاؤں کے نتیجے میں اپنی مرادات کے حصول کے لیے غیب سے سروسامان فراہم ہوتے کھلی آنکھوں دیکھتے تو ان کو بالیقین یہ یقین حاصل ہوتا کہ ہم نے حکیم الاسلام سے استدعا دعاء کر کے تمام اکابر اہل اللہ کی مستجاب دعاؤں کو اپنا شریک حال بنالیا۔

ملت اسلامیہ کے ایسے اجتماعی امور میں کہ جنھیں دینی اور سیاسی اختلاف مکاتب فکر کے باوجود "وحدت کلمہ" کی بنیاد پر جب ایسی شخصیت کی ضرورت ہوتی کہ جس کا علم وصلح تقویٰ وطہارت، فضل وکمال کتاب اخطاب فکرمند وسعت اخلاق بیجا جانب داری نفاق آمیز تہذب پسندی سے بلندوبالا اور رفیع وعظیم ہو۔ تو اعیانِ ملت کی انتخابی نگاہوں کا اول وآخر صرف قطبِ ارشاد حکیم الاسلام حضرت اقدس مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ہی کی گراں قدر ذاتِ گرامی بنتی تھی۔

ٹھیک اسی طرح شرعی، اخلاقی، تصوفی، فقہی، کلامی، تفسیری مدنی یا معاشرتی، تمدنی، تہذیبی، سیاسی اور اجتماعی دائروں میں پیدا شدہ الجھنوں کو دور کرنے والے ہمہ جہت ہمہ گیر علمی اور اصلاحی شخصیت کی ارباب بست وکشاد کو ضرورت ہوتی تو متفقہ طور پر قطب ارشاد حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی تقریر وخطاب ہی کو قرار دیا جاتا اور اس صحیح فیصلہ تک پہنچنے والے اپنے اس مبارک فیصلے پر نہ صرف خود ہی یہ اطمینان وسکون لیکر اٹھتے تھے کہ ہم نے بتوفیق الٰہی بحسن اسلوب اپنی ذمّہ داری کو ادا کر دیا ہے بلکہ اس پر مستزاد یہ کہ وہ عوام وخواص کے تمام متدین اور صحیح الفکر طبقات کی جانب سے صد ہزار تشکر وامتنان کے مستحق بھی قرار دئے جاتے۔

اور حضرت اقدس کی تقریر وخطاب سے الجھے ہوئے مسئلوں کے حل ہوجانے کے بعد امن واتحاد اور باہمی مودّت ومروّت کی پیدا شدہ فضاء ذمّہ داروں کی حیثیت عرفی میں جو ترقی واعتماد پیدا کرتی وہ بذاتِ خود سب کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ بن جاتی تھی۔

ایک تاریخی شخصیت

حضرت مولانا ابوالعرفان ندوی معتمد تعلیمات دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

آج سے ۵۰ رسال پہلے میں اپنے برادرِ معظم مولانا جمیل احمد صاحب قاسمی مرحوم کے ساتھ دیوبند گیا اور عربی کی سب سے پہلی کتاب ''میزان منشعب'' با قاعدہ داخلہ لے کر میں نے پڑھنی شروع کی اس وقت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اور حضرت مدنیؒ صدر المدرسین اور شیخ الحدیث تھے، دارالعلوم دیوبند کے ان دو بڑے منصبوں پر ان دونوں کی موجوگی قران السعدین تھی اور میں اگر چہ اس وقت دس برس کی عمر کا تھا لیکن آج جب میں اس عہدہ کو سوچتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم کی تاریخ میں وہ خیر القرون کا عہد تھا۔ دارالعلوم دیوبند میں میری مدتِ قیام تقریباً تین برس رہی اور میں نے میزان سے لے کر قطبی تصدیقات واصول الشاشی تک کی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی ہے۔ اس تین سالہ مدت میں قاری صاحبؒ کو مختلف حیثیتوں سے دیکھنے کا موقع ملا۔ پابندی سے پنج وقتہ نماز با جماعت کے لیے مکان سے دارالعلوم کی مسجد میں تشریف لانا اور وقتاً فوقتاً انتہائی معیار کی قرات کے ساتھ نماز پڑھانا آج بھی اس کا احساس وتاثر اور حلاوت حافظے میں موجود ہے۔ ان کی شیریں بیانی اور شیریں زبانی دارالعلوم کے احاطہ میں ضرب المثل تھی۔ ماشاء اللہ، اللہ تعالیٰ نے حسنِ سیرت کے ساتھ حسنِ صورت سے بھی نوازا تھا اور اس کی توجہ سے ہر جگہ محبوب اور لوگوں کی وجہ کا مرکز رہے۔ ان کی قبولیت اور ایک عالم دین کی حیثیت سے ان کی شہرت اور صاحب صلاح وتقویٰ ہونے کا اعتراف ہندوبیرون ہند کے علماء واہل بصیرت نے برملا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک بلند معیار کے عالمِ دین ہونے کی حیثیت سے ان کو جو وجاہت اور قبولیت عطا فرمائی تھی وہ ہندوستان میں کم علماء کو نصیب تھی۔ میرے دیوبند

کے زمانہ قیام میں عام طور پر طلباء صرف دو ہی شخصیتوں سے متاثر تھے اور مجلسوں میں ان دونوں کے تذکرے ہوا کرتے تھے، میری مراد حضرت مدنیؒ اور قاری صاحبؒ سے ہے، میں اپنی کم عمری کی وجہ سے براہِ راست قاری صاحبؒ کی مجلسوں سے استفادہ نہ کرسکا لیکن ان کی مجلسوں میں بیٹھنے والے اور مستفید ہونے والے جب اپنے کمروں میں آکر والہانہ انداز سے ان کے حسنِ بیان اور ان کے علمی تفوق کا تذکرہ کرتے تھے تو میں بھی اپنی عمر اور استعدادِ علمی کے مطابق لطف اندوز ہوتا تھا۔

بعض گھریلو اسباب کی وجہ سے دیوبند سے تعلیمی سلسلہ منقطع کرنا پڑا اور دو چار سال مختلف اساتذہ اور مدارس میں پڑھ کر میں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم کے لیے آیا اور یہیں میری فراغت ہوئی اور یہیں مجھے خدمت کا موقعہ ملا جو آج تک بدستور قائم ہے۔اس طویل ملاقات میں قاری صاحبؒ کو مختلف مجلسوں اور مختلف موقعوں میں قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ان کا اخلاق ان کی گفتگو ان کا علم،ان کا تقویٰ وتورع میں سے ہر ایک متاثر کرتا تھا اور یہ بات برملا زبان پر آتی تھی کہ وہ اسلاف کا نمونہ تھے اور قاسم العلوم والخیرات کے جانشیں ہیں اور بجا طور پر دارالعلوم دیوبند جیسی مرکزی دینی درسگاہ کے صدر نشیں ہیں۔آخری مرتبہ جامعہ رحمانیہ مونگیر کے جلسۂ عام میں چار سال پہلے مجھے ان کو دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی اور ان کے مواعظ حسنہ سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا۔دو ڈھائی گھنٹے تک وہ مسلسل اس طرح بیان فرماتے رہے کہ ان من البیان لسحرا کا مشاہدہ ہو رہا تھا ان کی دینی اور علمی خدمات اور دارالعلوم دیوبند کی نصف صدی سے زائد خدمتِ اہتمام اور جس عہد کو دارالعلوم دیوبند کا زرّین عہد کہا جاسکتا ہے بھلائی نہیں جاسکتی ہیں اور جو ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی و دینی خدمات کی تاریخ کا روشن باب ہیں۔

حضرت حکیم الاسلام چند نقوش

از: حضرت مولانا سید احمد صاحب ہاشمیؒ

دارالعلوم دیوبند میں میری طالبعلمی کا زمانہ غالباً ۵۵ء کا ہے۔ میں نے مدرسہ عالیہ کلکتہ سے ممتاز المحدثین کی سند حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند کا صرف اس لیے عزم کیا تھا کہ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ سے تلمذ کا شرف وانتساب حاصل کرسکوں۔ چناں چہ میرا زمانہ قیام صرف ایک سال کا بہت ہی مختصر سا عرصہ رہا۔ اس دور میں حکیم الاسلامؒ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ بعد نماز فجر حجۃ اللہ البالغہ کا مسجد میں ذہین وشوقین طلبہ کو درس دیا کرتے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی اس اہم اور نادر تصنیف سے حکیم الاسلام کو خاص مناسبت تھی۔ اسی لیے باوجود اس کے کہ درسیات کی دوسری کتابیں حکیم الاسلام سے متعلق نہیں تھیں (اور کار اہتمام کے رہتے ہوئے یہ ممکن بھی نہیں تھا) لیکن حجۃ اللہ البالغہ کے لیے فجر بعد کا وقت اہتمام سے اس کے درس کے لیے فارغ کرلیا تھا۔ اور بہت ہی دلچسپی اور ذوق کے ساتھ پابندی سے اسے پڑھاتے تھے شریک درس طلباء سے حکیم الاسلام کی حکیمانہ بصیرت کے تذکرہ سے اکثر شوق ہوا کہ میں بھی حجۃ اللہ البالغہ کے درس میں شریک ہوسکوں، مگر دورۂ حدیث کے طالب علم کے لیے خصوصاً شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے درس بخاری شریف کے نظام الاوقات کی بنا پر یہ ممکن نہیں ہوسکتا تھا۔ کیوں کہ بخاری شریف کا درس حضرت شیخ الاسلام بعد فجر ہی سے شروع فرماتے تھے۔

لیکن دارالعلوم دیوبند سے واپسی کے بعد مختلف مجالس میں گفتگو اور بعض ملی مسائل پر تبادلۂ خیال کی ضرور سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اور بہت سی دینی مجالس، مدارس

اور جمعیۃ علماء کے اجلاسوں میں حضرت موصوف کے بلیغانہ خطاب سے مستفیض ہونے کا موقعہ بھی ملا ہے۔

حضرت قاری صاحبؒ کے مزاج کی نفاست میں نرم گفتاری، سبک گوئی اور ان کی شیوہ بیانی ہی تنہا ان کی شخصیت کا حسن امتیاز نہیں تھی، اپنے چھوٹوں کو نوازنا اور اپنے سے اختلاف رائے رکھتے ہوئے اختلاف کرنے والوں سے شریفانہ شفقت ومودت، اور تعلق خاطر کا اظہار کرنا بھی ان کی سرشت اور سادگی پسند طبیعت کا ایک ضروری حصہ تھا۔ ان کی وضعداری اور بزرگانہ شفقت کے کئی واقعات خود میرے ساتھ ایسے گزرے ہیں کہ ان کا تاثر ابھی تک قلب ودماغ پر قائم وباقی ہے۔ اس کی تفصیل میں جائے بغیر اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ میں اپنے کو حکیم الاسلام کی عقیدت مندی کے دائرہ میں شامل کرنا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارتحال صرف دارالعلوم دیوبند اس کے منتسبین یا صرف ہندوستان ہی کے لیے حزینہ نہیں ہے بلکہ یہ پورے عالم اسلام کا نقصان ہے۔

❀❀❀

ایک باکمال شخصیت

از: مولانا قاضی سجاد حسین صاحبؒ

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ پر کچھ لکھنے کے لیے تو کافی وقت درکار ہے جس کا سرِ دست موقعہ نکالنا مشکل ہے بہر حال معروض ہے حضرت موصوف سے مجھے بچپن سے نیاز حاصل تھا۔ میری عمر تقریباً دس، گیارہ برس کی ہوگی اور میں اپنے وطن کرت پور ضلع بجنور میں مدرسہ عربیہ میں زیر تعلیم تھا۔ اس وقت میرے والد مرحوم قاضی شمشاد حسین مرحوم ہی اس مدرسہ کے مہتمم تھے۔ اس کے سالانہ جلسہ میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیری) صاحبؒ کی معیت میں حضرت مولانا موصوف کی آمد کرتپور ہوئی تھی۔ مولانا کا عنفوانِ شباب تھا اور موصوف کو فارغ التحصیل ہوئے کچھ عرصہ گزرا تھا، موصوف کے وعظ شہرت کی ابتدا تھی جلسہ میں تقریروں کے بارے میں منتظمین نے یہ طے کیا تھا کہ ابتداءً موصوف کا وعظ ہوتا کہ مجمع جم جائے پھر آخر میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیری صاحب کچھ فرمادیں۔ لیکن جلسہ کی ابتدائی کاروائی کے بعد جیسے ہی وعظوں کی نوبت آئی حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا پہلے میں کچھ کہہ لوں۔ حضرت شاہ صاحب کی ایک عالمانہ تقریر تھی جو عوام کے پلّے زیادہ نہ پڑی اس کے بعد حضرت موصوف کا وعظ شروع ہوا جو ایک دو گھنٹے جاری رہا اور مجمع نہایت سکون اور خاموشی سے وعظ میں محو رہا۔ یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ موصوف کے حسن صورت، شائستگی، لباس اور حسن وعظ سے میں بھی متاثر ہوا۔ اس دن سے موصوف سے ایک قلبی تعلق پیدا ہوا جو بحمد اللہ آج تک باقی ہے۔ اس کے بعد مجھے مدرسہ دار العلوم دیوبند میں داخلہ کی سعادت میسر ہوئی اور میں موصوف کے قریب تر ہو گیا یہ وہ وقت تھا کہ موصوف نائب مہتمم بنائے جا چکے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم اور موصوف کے والد حافظ محمد احمد صاحب صدر مہتمم تھے موصوف نے کچھ درس دینا بھی شروع کر دیا تھا اور ملک میں ان کے وعظ کی شہرت ہو جانے کی وجہ سے اکثر

جلسوں میں بھی بلائے جانے لگے تھے۔ایک وہ وقت آیا کہ میں نے دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم کرنے کے ساتھ ساتھ مولوی عالم الہ آباد کی تیاری شروع کی تو مجھے اس کی ضرورت یہ محسوس ہوئی کہ خارج وقت میں کسی استاد سے بیضاوی شریف کا درس حاصل کروں، میں نے تعلق اور قرب کی بنیاد پر موصوف سے عرض کیا اور موصوف نے خنداں پیشانی کے ساتھ میری درخواست قبول فرمالی۔اس طریقہ پر مجھے موصوف کی شاگردی کا بھی شرف حاصل ہوا۔میں نے موصوف کو بہت قریب سے دیکھا ہے، موصوف کو اللہ تعالیٰ نے اتنی خوبیوں سے نوازا تھا کہ بمشکل کسی ایک عالم میں اتنی خوبیاں جمع ہوتی ہیں، فنِ قرات اور خوش الحانی میں موصوف بے نظیر تھے، جس وقت مجمع میں تلاوتِ کلام پاک فرمادیتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ نور اور رحمتوں کی بارش ہو رہی ہے جب دارالعلوم کی مسجد میں کسی جہری نماز کی امامت فرماتے تھے۔تو مقتدی محو ہو جاتے۔وعظ اور تقریر میں اللہ تعالیٰ نے موصوف کو وہ کمال عطا فرمایا تھا کہ وہ تین چار گھنٹے مسلسل وعظ فرمانا اور سامعین کا ہمہ تن گوش بن جانا موصوف کی خصوصیت تھی بہت کم علماء ہیں جن کو قدرت نے قوت تقریر اور خوبی تحریر کی دونوں نعمتوں سے نوازا ہو۔موصوف میں جہاں قوت تقریر تھی خوبی تحریر بھی ایسی تھی کہ آپ ہندوستان کے مصنفین علماء کے زمرہ میں طرۂ امتیاز رکھتے تھے، دیگر رسائل و مضامین میں وکتب کے علاوہ "التشبہ فی الاسلام" آپ کی اس خوبی کا شاہد عدل ہے دور والے شاید نہ جانتے ہوں لیکن موصوف سے قریب رہنے والے جانتے ہیں کہ جس طرح موصوف کو اردو نثر پر قدرت حاصل تھی اس طرح اردو نظم پر بھی عبور حاصل تھا خدا کرے کسی وقت موصوف کا شعری مجموعہ بھی شائع ہو اور موصوف کے اس کمال سے لوگ آشنا ہو سکیں۔

علماء میں ایسے صاحب علم کم ہیں جن کو دین کے اسرار و حکم پر اس قدر عبور ہو جس قدر موصوف کو تھا۔شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے دینی اسرار پر آپ کی گہری نظر تھی پھر اپنے جد امجد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تصانیف کے گہرے مطالعے نے اس پر اور چار چاند لگائے تھے۔یہ بھی آپ ہی کی خصوصیت تھی کہ قوتِ تقریر و تحریر کے کمال کے

ساتھ آپ ایک کامیاب مدرس واستاذ بھی تھے، سفروں سے فرصت ملتی تھی تو درس گاہ میں بیٹھ کر آپ کے جوہر کھلتے تھے انکساری، حلم وبردباری آپ کا طرۂ امتیاز تھے مخالف سے مخالف کے ساتھ بھی ترشرو نہ ہوتے تھے انتظامی صلاحیت وقابلیت کے لیے مدرسہ دارالعلوم کا آپ کے دور کا عروج ایک واضح ثبوت ہے۔ یقیناً آپ علماء دیوبند ہی کی جماعت میں نہیں بلکہ علماء ہند کے زمرہ میں ایک گل سرسبد تھے۔ موصوف کی وفات حسرت آیات سے جو خلاء پیدا ہوا ہے غالباً ایک عرصہ دراز تک وہ پر نہ ہوسکے گا۔ بایں ہمہ آخری عمر میں موصوف نے صدمات کو صبر وتحمل سے برداشت کیا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ دعاء ہے کہ حضرت برحق تعالیٰ اپنی بے کنار رحمتیں ان پر نازل فرمائے اور اپنی آغوش رحمت میں لے کر ان کے صدمات وخدمات کا ان کو صلہ عطاء فرمائے۔

ملتِ اسلامیہ کی ایک یادگار شخصیت

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

(از: نبیرۂ امام العصر علامہ کشمیریؒ مولانا نسیم اختر شاہ قیصر
استاذ دارالعلوم وقف دیوبند و مہتمم الجامعۃ الانوریہ محلہ خانقاہ دیوبند

انسان کے سفر کے ساتھ ساتھ اس کی تاریخ کا سفر شروع ہوتا ہے۔ اب اس تاریخ کو اس نے کس حد تک محفوظ رکھا یہ بالکل الگ بحث ہے۔ ہاں تاریخ کے جو سرے ہمارے ہاتھ لگتے ہیں ان میں یہ پہلو نمایاں ہے کہ نامور افراد برگزیدہ انسان اور قابل ذکر شخصیتیں ہر دور میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں اور صرف احساس ہی نہیں دلاتیں بلکہ آسمان کی اونچائیوں کو چھوتے ان کے کارنامے اس تاریخ کا روشن اور تابناک پہلو ہیں۔

قریب کے زمانے میں ہماری علمی تاریخ کو زندگی بخشنے والے افراد میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا نام معتبر اور مستند ہے۔ ان کی خدمات کا دائرہ ۶۰ ربرس پر محیط ہے۔ علماء کی صف میں یہ ایک ایسا نام ہے جو بزرگوں کے علوم کا امین، اکابر کی روایات کا پاسدار اور سلف کے مجاہدانہ کارناموں کا علمبردار ہے۔ حضرت قاری صاحب کی شخصیت ہفت پہلو شخصیت تھی، وہ امام الاکبر بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے پوتے، مہتمم دارالعلوم دیوبند حافظ محمد احمد صاحبؒ کے فرزند، علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد رشید حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے خلیفہ اور وقت کے نامور انسانوں کے تربیت یافتہ تھے ذہانت، ذکاوت، علم، کمال ان کو ورثہ میں ملا تھا اور پھر ذاتی محنت وجدوجہد نے ان کی علمی صلاحیتوں اور کمالات کو سند کا درجہ عطا کر دیا تھا۔

علمائے دیوبند کی عظیم خدمات اور ان کے علمی کارنامے روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ حضرت نانوتویؒ کی خدمات جلیل، شیخ الہند کا مجاہدانہ عزم، امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا علم حدیث میں امتیاز، حضرت تھانویؒ کی اصلاح وارشاد کی کوششیں، مولانا حسین احمد مدنیؒ کی جدوجہد آزادی میں شرکت یہ سب کچھ ہماری تاریخ کا عنوان جلیل ہیں۔ پھر مجموعی طور پر اکابر دیوبند اپنے کردار وعمل، زہد وتقویٰ، علوم وکمالات، مجاہدانہ وسرفروشانہ تحریکات، اصلاحی، سیاسی وسماجی سرگرمیوں کی بناء پر ممتاز ہیں۔ حدیث وتفسیر، تحریر وتقریر اور دیگر علوم وفنون میں ان کی شبانہ روز کاوشوں کے اثرات ہندوستان کی سرحدوں سے نکل کر بلاد عرب اور ایشیاء وافریقہ بلکہ یورپ تک میں محسوس کئے جاسکتے ہیں، خداوند قدوس نے حضرت حکیم الاسلام کی ذات میں ان تمام خصوصیات اکابر کو سمودیا تھا۔ وہ اپنے علم، اپنی تحریر وتقریر کی اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے نہ صرف معروف تھے بلکہ اپنے معاصرین میں ان کا پایہ بیحد بلند تھا۔ گذشتہ ۳۰/۳۵ سال کے عرصہ میں خاص طور پر تنہا ان کی ذات مرجع خلائق رہی۔ ان کی شخصیت اس اعتبار سے قابل رشک ہے کہ اکابر کی نگاہوں میں جوان کی عزت تھی اور جو احترام انھیں حاصل تھا وہ کسی دوسرے کا حصہ نہ بن سکا۔

ایک دوسرے زاویئے سے اگر دیکھئے تو وہ ایک غیر متنازعہ شخصیت کے مالک تھے سنی، بریلوی، اور شیعہ حضرات کے یہاں ان کو یکساں عزت وعظمت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کی صدارت کے لیے سب کی نگاہیں آپ کی جانب اٹھیں اور آپ اس کے پہلے صدر قرار پائے اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تشکیل کے دن سے اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک اس منصب کو رونق بخشتے رہے۔ ان کے زمانہ صدارت میں مسلم پرسنل لاء بورڈ پوری جانفشانی، تندہی اور مستعدی سے کام کرتا رہا۔

انھوں نے بحیثیت مہتمم دارالعلوم دیوبند کی ۶۰ برس تک سربراہی کا کارنامہ انجام دیا۔ پہلے نیابت اہتمام پر جلوہ افروز ہوئے پھر مسند اہتمام پر بیٹھ کر دارالعلوم دیوبند کو ایک وقار، عظمت مقبولیت ومرجعیت اور عالمی شہرت بخشی، انکے دورِ اہتمام میں صحیح معنی

میں دارالعلوم ایک یونیورسٹی کے نام سے متعارف ہوا۔ اس یونیورسٹی نے ملت اسلامیہ اور خاص طور پر مسلمانان ہند کی دینی، علمی اور سیاسی رہنمائی میں ہمیشہ اپنا رول ادا کیا۔ تحریک آزادی کے ہر دور میں عظیم اسلامی درسگاہ اپنے نامور فرزندوں کے ذریعہ قیادت کا فرض ادا کرتی رہی۔ حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے دورِ مسعود میں اس نے ذمہ داریوں کو بدرجہ اتم پورا کیا، ہر طوفان میں حضرت کی ذات ایک چٹان ثابت ہوئی اور ہر سیلاب کے آگے سدِّ سکندری بنکر کھڑے رہے۔ دارالعلوم مختلف ادوار سے گذرا اور کچھ ناگوار واقعات کا اس کو سامنا کرنا پڑا حضرت حکیم الاسلام کے ناخنِ تدبیر سے یہ واقعات سلجھتے رہے۔

آپ تقریر کے میدان میں ایک سحر بیان مقرر اور اعلیٰ خطیب تھے۔ تقریر بڑی دلچسپ، رواں دواں جامع اور مکمل تھی، مخاطب ایک انگریزی تعلیم یافتہ ہوتا یا ایک عام آدمی ہر ایک کے لیے نافع اور کارآمد ہوتی گھنٹوں روانی اور تسلسل کے ساتھ گفتگو فرماتے سامعین اکتاہٹ کا شکار نہ ہوتے۔ دورانِ تقریر مثالوں، عام فہم محاوروں اور برجستہ واقعات سے بات کو باوزن اور اپنے موضوع کو مفید بناتے، اندرونِ ملک سیکڑوں تقریریں کیں اور بیرونی ممالک میں خطابت سے کئی نسلوں کو متاثر و فیضیاب کیا۔ ۸۵؍ برس کی زندگی میں نصف عمر اصلاح و تبلیغ کے میدان میں لگائی، انسان کے آغاز سفر اور اس کے اختتام تک آنے والی مختلف کیفیتوں صورتوں اور عالموں کا ذکر وہ اپنی اس تقریر میں یوں کرتے ہیں۔

انسان عالم الست سے چلا عالم رحم میں آیا عالم رحم سے چلا عالم دنیا میں آیا، عالم دنیا سے چلا عالم برزخ میں آیا، عالم برزخ سے منتقل ہوا عالم حشر میں آیا عالم حشر سے کوچ کیا عالم جنت میں پہنچا اور جنت میں روزانہ ترقی ہوگی نئے نئے عالم انسان پر کھلیں گے۔

انسانی زندگی کے آغاز اور پھر طرح طرح کے عالموں سے گذر کر اپنے مستقل ٹھکانے پر اس کی مستقل رہائش کو حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے مخصوص انداز میں چند

جملوں میں بیان فرمادیا ہے۔تقریر کا جو ملکہ اور خطابت کا جوجوہر آپ کو ودیعت ہوا تھا اس کو آپ کے حکیمانہ بیان نے چار چاند لگائے۔

آپ صاحبِ قلم اور کثیر التصانیف تھے، لاتعداد علمی، دینی، تحقیقی مقالات جو وقت کے موجودہ اخبارات ورسائل میں شائع ہوئے آپ کی اعلیٰ قلمی صلاحیتوں کے مظہر ہیں، تقریر اور تحریر دونوں خوبیاں پر مکمل طور پر ایک جگہ جمع ہوجائیں کم دیکھنے میں آیا ہے۔ حضرت کو قدرت نے یہ دونوں نعمتیں وافر انداز میں بخشی تھیں، مسلک دیوبند کی توضیح و تشریح پر آپ کا مقالہ حرف آخر ہے جو کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ''سائنس اور اسلام'' کے موضوع پر آپ کے مبسوط مقالہ نے خود اپنے طور پر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو دانتوں تلے انگلیاں دبانے پر مجبور کردیا تھا۔ ان کی مشہور کتابوں میں (۱) اسلام کا اخلاقی نظام (۲) خاتم النبیین (۳) فلسفۂ نماز (۴) کلمۂ طیبہ (۵) مسئلہ تقدیر (۶) اصول دعوت اسلام (۷) مسلک دیوبند (۸) شہید کربلا (۹) علم غیب (۱۰) فطری حکومت ایک وغیرہ تشنگان علم وحکمت کو سیراب کرتی رہی ہیں۔

وہ قادر الکلام شاعر تھے۔ اردو، عربی، فارسی تینوں زبانوں میں انھوں نے طبع رسا، جولانی فکر اور فصاحت وآفاقیت کے نمونے پیش کیے۔ ان کے پسندیدہ موضوعات میں نعت نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اولیت حاصل ہے۔ نظم اور دیگر اصناف سخن پر بھی انھوں نے طبع آزمائی کی اور کامیاب رہے ان کا شعری مجموعہ جس کو دراصل انتخاب ہی کہنا چاہیے ''عرفان عارف'' کے کافی عرصہ پہلے شائقین تک پہنچ چکا ہے اپنی آنکھ کے آپریشن کے موقع پر انھوں نے ایک طویل نظم کہی جو ''آنکھ کی کہانی'' کے نام سے بازار میں دستیاب ہے۔ ان کی اردو شاعری کے چند نمونے ملاحظہ کیجئے انھوں نے ایک موقع پر علم کی افادیت پر یوں روشنی ڈالی۔ ؎

زندگانی سل ہے گویا برف کی ❁ جو پگھلتی رہتی ہے لیل ونہار

ہاں دوام زندگی ہے علم سے ❁ علم ہی دنیا میں ہے دائم بہار

علم ہی پر چل رہے ہیں رات دن ❁ جہل سے ممکن نہیں یہ نظم کار

یہ ایک طویل نظم ہے جس میں علم کے اثرات اور اس کے نتائج کو بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے اکبر الہ آبادی نے ایک انگریزی نظم کا منظوم اردو ترجمہ "پانی کی روانی" کے عنوان سے کیا تھا۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے اس نظم کو پڑھ کر ایک دوسری نظم "اسلام کی روانی" کے نام سے کہی جو رسالہ القاسم میں ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی، اس نظم کو پڑھ کر اکبر الہ آبادی بیحد خوش ہوئے اور انھوں نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم دار العلوم دیوبند کے نام اپنے ایک خط میں اپنا تاثر اس طرح پیش کیا۔

"مولانا محمد طیب کی نظم روانی اسلام نظر سے گذری ماشاء اللہ صلی علیٰ جزاک اللہ نقاش نقش ثانی بہتر کشد از اول" —— "آنکھ کی کہانی" کا مطالعہ کرنے کے بعد نامور عالم دین، صاحبِ طرز انشاء پرداز اور مستند ادیب مولانا عبد الماجد دریابادی نے ایک خط کے ذریعہ اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا۔

حضرت محترم --------- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

"آنکھ کی کہانی" آں محترم کا عطیہ یہاں آتے ہی پڑھ ڈالی سبحان اللہ ماشاء اللہ مجھے علم نہ تھا کہ آپ کو شعر وادب میں اس قدر قدرت حاصل ہے۔ ذٰلك فضل اللّٰه۔

کیا کیا قافیے نکالے ہیں، کیسے کیسے مضمون باندھے ہیں کہ پیشہ ور شاعروں کے بھی چھکے چھوٹ جائیں، نہ کہیں جھول نہ اتنی طویل نظم میں کہیں آورد، بس آمد ہی آمد، خوش دماغ تو بحیثیت ایک سچے قاسم زادہ کے آپ تھے ہی اب معلوم ہوا کہ ماشاء اللہ۔ خوش فکر بھی اس درجہ میں ہیں ماشاء اللہ۔

دعا گو ودعا جو

عبد الماجد ۱۵/دسمبر ۱۹۶۴ء

"اسلام کی روانی" کے چند شعر دیکھئے۔

چلا ارض بطحا سے ایک بحر ذاخر ❁ کہ تھا جس کی موجوں کا اوّل نہ آخر

وہ توحید کی لے بجاتا ہوا ❁ سرود حجازی میں گاتا ہوا
وہ جنگل میں منگل مناتا ہوا ❁ وہ شہروں میں شادی رچاتا ہوا
پہاڑوں پہ نعرے لگاتا ہوا ❁ سمندر میں طوفاں اٹھاتا ہوا

اکبرالہ آبادی نے ایک جگہ کہا تھا کہ:

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے ❁ یعنی جینا ہے اورمرنا ہے
اب رہی بحث رنج وراحت کی ❁ وہ فقط وقت کا گذرنا ہے

حکیم الاسلان نے اسی زمین اوراسی بحر میں یوں گل افشانی کی۔

رہ گیا عز وجاہ کا جھگڑا ❁ یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے
مقصد زندگی ہے طاعت حق ❁ نہ کہ فکر جہاں میں پڑنا ہے

حضرت عارف تخلص کرتے تھےاور کبھی طیب کے نام سے بھی شعر کہتے۔ وہ حضرت اکبرالہ آبادی سے بیحد متاثر تھے، اسی وجہ سے ان کی اکثر نظمیں ایسی ہیں جو اکبر کی شاعری سے متاثر ہوکر اسی زمین اور اسی بحر میں قافیہ وردیف بدل کر کہی گئی ہیں غرضیکہ قدرت نے حضرت حکیم الاسلام کومختلف النوع کمالات سے سرفراز فرمایا تھا اور ہر کمال کچھ اس طرح آپ کی ذات کا حصہ بن گیا تھا کہ اس کے ذکر کے بغیر آگے بڑھنا مشکل ہے۔ کوئی گوشہ آپ کی شخصیت کا ایسا نہیں ہے کہ جسے چھوڑا جائے یا نظر انداز کیا جائے کمالات ظاہری کے ساتھ ساتھ قدرت نے کمالات باطنی کی دولت بھی آپ کو بخشی تھی۔ مرشد وقت مجدد زمانہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے دست حق پرست پر آپ نے بیعت کی تصوف وسلوک کے بہت سے مراحل ان کی خانقاہ میں رہ کر طے کیے تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کی تربیت وہیں آپ کو ملی کچھ وقت گذرا تو خلافت کے خلعت فاخرہ سے نوازے گئے مرشد کا رنگ آپ پر بے حد غالب تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ علمی میدان میں اپنے نامور استاذ امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے نقش قدم پر تھے تو بیعت وارشاد کی راہوں میں اپنے مرشد کی یادگار بنے۔

آپ بلند اخلاق، بلند کردار اور عظیم خیالات کے مالک تھے، مزاج میں نرمی، گفتگو میں شائستگی اور معصومیت طبیعت میں سادگی اور حیاء کا غلبہ تھا صبر وشکر آپ کا وصف خصوصی تھا، تحمل اور بردباری کی آپ نظیر تھے، اپنے اور بیگانے آپ کی ان خوبیوں کے گرویدہ تھے بدترین سے بدترین حالات میں بھی صبر وضبط کا دامن آپ نے نہ چھوڑا، شدید مخالفانہ بات کو بھی سہہ جاتے تھے، اور زبان پر شکوہ نہ ہوتا۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بیان ہے کہ کبھی مجلس شوریٰ کے جلسوں میں کوئی ناگوار صورت سامنے آتی تو حضرت قاری صاحب خاموشی اختیار کرتے اور اس قدر وضبط کا مظاہرہ کرتے کہ مجلس کے بعد کئی کئی روز بخار میں مبتلا رہتے۔ وہ کریم النفس اور شریف الطبع تھے۔ ان کی بابرکت ذات سے ہزاروں نے فائدہ اٹھایا اور ان کے در فیض سے ہزاروں نے اپنی علمی پیاس بجھائی۔ غرضیکہ وہ انسانوں کے درمیان ملکوتی صفات کے مالک ایسے شخص تھے جو اپنے علم کمال، خدمات، عبادت وریاضت کی وجہ سے علمائے دیوبند کی پہچان اور علامت بن گئے تھے۔

۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کا دن اس عالم ربانی کی جدائی کا دن تھا۔ دن کے گیارہ بجے وہ کیا رخصت ہوئے علم وکمال کی مجلسیں اجڑ گئیں علوم قاسمی کا معرفت تھانوی اور کمالات انوری کا محافظ اٹھ گیا، دارالعلوم نے اپنا ایک مشفق مہربان اور فدائی کھودیا اس کی عظمت میں چار چاند لگانے والا کوچ کر گیا، علماء کی صفوں میں ماتم چھا گیا عوام کی آنکھیں اشک بار ہوگئیں۔ گذشتہ چالیس برس کی تاریخ اور خاص طور پر اکابر دیوبند کی تاریخ ان کی حیات مبارکہ سے روشن ہے وہ زندہ تھے دیوبندیت کی علامت بن کر رہے۔ عالم باقی کا سفر اختیار کیا تو اس کی عظمت اور تقدس کو ایک روشن چراغ کر گئے جو ان کے بعد بھی ظلمت اور تاریکی میں رہبر اور رہنما بنا ہوا ہے۔

حکیم الاسلامؒ

حضرت مولانا محمد عبید اللہ صاحب، مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور

احب الصالحین ولست منھم
لعل اللہ یرزقنی صلاحاً

خانوادہ قاسمی کے چشم و چراغ۔ برصغیر کی عظیم ترین مذہبی یونیورسٹی کے مہتمم اور عالم اسلام کے ممتاز عالم دین۔ علوم عقلیہ ونقلیہ کے بحر ذخار خطیب بے بدل اور حکیم الاسلام علمی دنیا کے چراغ اور علماء کے سرتاج شیخ الہند کے ممتاز شاگرد و مرید۔ قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے پوتے۔ حافظ الحدیث والقرآن مولانا محمد احمد صاحب کے صاحب زادے۔ امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے خصوصی تلمیذ و جانشین اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے خلیفۂ اجل حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند جن کی شخصیت اظہر من الشمس ہے کے بارے میں مجھ جیسے بے بضاعت کا کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے اور لقمان کو حکمت سکھانے کے مترادف ہے تاہم حضرت حکیم الاسلامؒ کے بارے میں چند کلمات لکھنے کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے ہوئے یہ جرأت کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔ آمین!

آپ کا مختصر سوانحی خاکہ کچھ یوں ہے۔ آپ کا مولد قصبہ دیوبند ہے۔ تاریخ ولادت ۱۳۱۵ھ ۱۸۹۷ء ہے۔ تاریخی نام ''مظفر الدین'' ہے۔ سات سال کے ہوئے تو دارالعلوم میں داخل کروایا گیا۔ صرف دو سال کی قلیل مدت میں قرآن پاک قرأت و تجوید کے ساتھ حفظ کر لیا۔ پانچ سال فارسی اور ریاضی کے درجات میں تعلیم حاصل کی۔ اور پھر عربی نصاب شروع کیا۔

۱۳۳۷ھ ۱۹۱۸ء میں دار العلوم دیو بند سے فراغت اور سندِ فضیلت حاصل کی۔

آپ کے اساتذہ میں سے علامۃ العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۱۳۳۹ھ میں حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت فرمائی حضرت کی وفات کے بعد آپ نے حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی طرف رجوع کیا۔ اور ان سے تربیت باطنی وظاہری حاصل کی ۱۳۵۰ھ میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے خلافت سے سرفراز فرمایا۔ فراغت کے فوراً بعد ہی آپ نے دار العلوم دیو بند میں مسندِ تدریس کو رونق بخشی۔ ذہانت وفطانت تو آپ کو ورثے میں ملی تھی۔ جس کی بدولت آپ طلباء اور حلقہ مستفدین میں بہت جلد مقبول ہو گئے۔

۱۳۴۳ھ ۱۹۲۴ء میں نائب مہتمم کے عہدے پر آپ کا تقرر ہوا ۱۳۴۸ھ - ۱۹۲۹ء کے اوائل تک آپ اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد احمد صاحب اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کی زیر نگرانی ادارۂ اہتمام کے انتظامی امور بطریق احسن نمٹاتے رہے۔

۱۳۴۸ھ ۱۹۲۹ء کے وسط میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے انتقال کے بعد آپ کو باقاعدہ دار العلوم کا مہتمم بنا دیا گیا۔ اور پھر تادمِ آخر آپ اسی منصب جلیلہ پر فائز رہے۔

آہ! افسوس صد افسوس کہ حکیم الاسلام کی آنکھ بند ہوتے ہی وہ ساری رونقیں بھی یک سر ختم ہو گئیں۔ جن سے دار العلوم دیو بند کی ایک خاص شان نمایاں تھی۔ مختصر یہ کہ اگر حضرت قاری صاحبؒ کی حیاتِ مبارکہ پر ایک نظر دوڑائی جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کی زندگی میں اشاعت علوم کا فیض صرف طلبہ ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا۔ بلکہ آسمانِ علم کے بڑے بڑے درخشندہ ستارے بھی اس سے مستفید ہوتے تھے۔

کیسی کیسی صورتیں آنکھوں سے پنہاں ہوگئیں
کیسی کیسی صحبتیں خوابِ پریشاں ہوگئیں

حضرت قاری صاحبؒ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے وہ بیک وقت عالم بھی تھے اور صوفی بھی۔ خطیب بھی تھے اور مدرس بھی۔ واعظ بھی تھے اور مصلح بھی۔ الغرض ایک عالم

میں جتنی بھی خوبیاں اور صفات ہو سکتی ہیں وہ سب ہی اللہ تعالیٰ نے ان میں رکھی تھیں۔

لیس علی اللہ بمستنکر ۞ ان یجمع لم فی واحد

حضرت قاری صاحبؒ کا وعظ تو بہت ہی مشہور تھا جب کسی مضمون کو شروع فرماتے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کہ لڑی میں موتی پرور ہے ہیں۔ یہ حضرت قاری صاحبؒ کے وعظ ہی کی خصوصیت تھی کہ ہزاروں کے مجمع میں سے کوئی بھی اس وقت تک نہیں اٹھتا تھا جب تک کہ وعظ ختم نہ ہو جاتا عجیب محویت کا عالم ہوتا تھا

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

کتنا ہی مشکل موضوع کیوں نہ ہو، اپنے پرائے سب ہی سنتے اور حضرت قاری صاحبؒ کو ان کی حسن بیانی پر داد دیتے اور خوب دل کھول کر دیتے بعض علماء کرام کا کہنا ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ کا وعظ اور درس الہامی ہوتے ہیں۔ کیوں نہ ہو حضرت قاری صاحب مہتمم بھی تو ایک ایسے ادارے اور جامعہ کے تھے جس کی بنیاد بھی الہامی طور پر رکھی گئی تھی۔ جیسا کہ خود آپ کا فرمانا ہے کہ دارالعلوم کی بنیاد ہی الہامی نہیں بلکہ اس کے اساتذہ کا تقرر، طلباء کا استفادہ سب ہی الہامی ہے۔ جس کی تفصیل حضرت کے مختلف مواعظ اور حضرت کی بہت سی تصنیفاتِ مبارکہ میں موجود ہے۔

حضرت قاری صاحبؒ کا تعلق علماء کرام سے بھی عجیب ہی تھا۔ پاک و ہند کا شاید ہی کوئی ایسا عالم ہو جس کے دل میں حضرت قاری صاحبؒ کی خاص محبت نہ ہو۔ ہر دل قاری صاحب کی محبت سے لبریز تھا۔ آپ جب بھی پاکستان تشریف لاتے تو کوشش یہی فرماتے کہ یہاں کے تمام علماء کرام سے مل کر جائیں۔

حضرت اقدس والد صاحب کی حیاتِ مبارکہ میں جب بھی آتے تو سب سے پہلے ان ہی کی خدمت میں حاضری دیتے۔ حضرت والد صاحبؒ (حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ بانی جامعہ اشرفیہ) کے ساتھ بہت ہی گہرا تعلق تھا۔ جامعہ اشرفیہ کا سالانہ جلسہ

اس وقت تک ختم نہیں ہوتا تھا جب تک کہ حضرت قاری صاحبؒ نہ تشریف لائیں۔

جامعہ اشرفیہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ جب بھی تشریف لاتے تو جامعہ ہی میں قیام فرماتے اور دوران قیام کبھی تو جامعہ کے طلبہ کو درس دیتے اور کبھی حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے ملفوظات طیبات سناتے اور اکثر جمعہ کا وعظ بھی فرماتے تھے۔

حضرت قاری صاحبؒ جہاں بھی تشریف فرما ہوتے تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ تشنگان علوم کا سیلاب امنڈ آیا ہے۔ ہر آنے والے کی نظر حضرت قاری صاحبؒ پر ہی جا کر رکتی تھی۔ بس یوں لگتا تھا کہ اس جلسے کا چہرہ مہرہ حضرت ہی کی ذاتِ اقدس ہے:۔؎

مردِ حقانی کی پیشانی کا نور ❁ کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور

حضرت جب کسی موضوع پر گفتگو فرماتے تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ پورا کتب خانہ ہی حضرت کے سامنے کھلا پڑا ہے۔ ہر بات قرآن وحدیث اور فقہ کے حوالے سے فرماتے مجھے بہت کم یاد ہے کہ حضرت نے کبھی کوئی بات حوالے کے بغیر کی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت کی زبانِ مبارک میں بڑی کشش اور تاثیر ہوتی تھی۔

حضرت والا تو اس کے مصداق تھے۔؎

چلتا پھرتا وہ کتب خانہ تھا مثل زیلعی ❁ نکتہ دان فقہ، وحیر اذکیا و ترمذی

امام رازی وغزالی کے علوم ومعارف کے تو حافظ تھے اس کے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہ کے علوم پر بھی گرفت خوب مضبوط تھی۔ دارالعلوم دیوبند میں ایک طویل مدت تک حجۃ اللہ البالغہ کا باقاعدہ درس دیتے رہے اس درس کی شان یہ ہوتی تھی کہ اس وقت دارالعلوم کے بڑے بڑے اساتذہ کرام اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ حضرت قاری صاحب اس طرح اس کی تشریح وتوضیح فرماتے تھے کہ سبحان اللہ! بے ساختہ ہر ایک کی زبان سے نکلتا تھا۔

بوعلی وقت فخرالدین رازی زمان ❁ شہ ولی اللہ دوران وغزالیٔ زمان

اللہ رب العزت نے حضرت قاری صاحبؒ کی ذات گرامی پر یہ خاص فضل فرمایا تھا کہ

وہ جس میدان میں بھی چلے جاتے اس کے شہسوار ہوتے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ جب دارالعلوم سے فراغت حاصل کی تو حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ نے دستارِ فضیلت عطا کرنے کے لیے ایک جلسے کا اعلان فرمایا۔

حضرت تھانویؒ نے اپنے ساتھیوں سے یہ مشورہ کیا کہ اب کیا ہوگا جلسے میں بڑے علماء ہوں گے عوام ہوں گے خواص ہوں گے سب کے سامنے یہ اعلان کیا جائے گا کہ یہ حضرت فارغ التحصیل ہو چکے ہیں۔ اب لوگ ہمارے پاس آئیں گے۔ مسائل پوچھیں گے اور اگر ہمیں نہ آئے تو اساتذہ کی بدنامی ہوگی جو ہم اس کے اہل نہیں ہیں۔ تو مشورہ یہ طے پایا کہ حضرت تھانویؒ ہی حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوں اور حاضر ہو کر عرض کریں کہ جلسہ کو منسوخ کر دیا جائے۔ اس طرح دارالعلوم اور اساتذہ کرام نہ صرف بدنامی سے بچ جائیں گے بلکہ ہمیں بھی لوگوں کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔

حضرت تھانویؒ ڈرتے ڈرتے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ جلسہ کر رہے ہیں اور اس میں ہمیں دستارِ فضیلت عطا کی جائے گی۔

حضرت مولانا یعقوب صاحب نے فرمایا کہ ہاں۔ ایسا ہی ہے۔

اس پر حضرت تھانویؒ نے عرض کیا کہ حضرتؒ اگر اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں۔

حضرت مولانا نے فرمایا کہ ہاں بڑے شوق سے کہیئے کیا کہنا چاہتے ہیں۔ اس پر حضرت تھانویؒ نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔ اور بڑی منت سماجت سے عرض کیا کہ حضرت اس جلسے کو منسوخ کر دیا جائے۔ یہ نہ ہو کہ ہم جیسے نااہل اساتذہ دارالعلوم کی بدنامی کا باعث ہی بن جائیں۔

حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ نے فرمایا کہ ہاں تمہیں اپنے آپ کو اپنے اساتذہ کے سامنے یوں ہی سمجھنا چاہیئے۔ لیکن سنو:-

''خدا کی قسم میں دعویٰ سے یہ کہہ رہا ہوں کہ تم جس میدان میں بھی جاؤ گے بس تم ہی تم ہو گے۔ اور پھر فرمایا کہ اب صرف یہی نہیں ہوگا کہ تمہاری دستار فضیلت ہی

دے دی جائے گی بلکہ یہ اعلان کیا جائے گا کہ جس کا جی چاہے اور جس فن میں چاہے ان سے مناظرہ کرلے۔

یہ واقعہ حضرت قاری صاحبؒ نے خود بھی جامعہ اشرفیہ کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد پر سنایا تھا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے اس فرمانِ اقدس کا اتنا اثر ہوا کہ حضرت قاری صاحب تک جو بھی عالم وفاضل دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوکر آیا اس کی یہی شان تھی۔ جس میدان میں گیا تو اس کا شہسوار تھا، فلسفہ جدید ہو یا قدیم حضرت قاری صاحبؒ کے پاؤں چومتا تھا اور قرآن پر جو دسترس تھی وہ بھی انہی کا حصہ تھی۔ علم حدیث میں بھی آپ یدطولیٰ رکھتے تھے اور گویا کہ وہ اس کا مصداق تھے۔

فلسفی وآشنائے رمز قرآن مبیں ❁ شارح علم حدیث پاک ونکتہ آفریں

بہرحال حضرت قاری صاحبؒ نے پاک وہند کے علاوہ بیرونی دنیا میں جو تبلیغ دین کا کام انجام دیا وہ ہر شخص جانتا ہے۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ الحمدللہ ثم الحمدللہ افریقہ وغیرہ میں ہزارہا کی تعداد میں لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس حقیر کے مواعظ سے متاثر ہوکر اسلام قبول کیا ہے"۔

اندریں سلسلہ ایک عجیب وغریب واقعہ بھی بیان فرمایا جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

ایک دفعہ آپ افریقہ کے دورے پر تھے۔ وہاں چند مخلصین نے درخواست کی کہ حضرت آپ کو یہاں کے مشہور اور تاریخی مقامات دکھائے جائیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ بہت اچھا۔ چناں چہ یہ حضرات حضرت کو لے کر سب سے پہلے وہاں کی مشہور یونیورسٹی میں لے گئے۔ وہاں اتفاقاً طلباء کا جلسہ ہو رہا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب وہاں گورے اور کالے کی تفریق چل رہی تھی۔ اسی میں لڑائی جھگڑا ہو رہا تھا۔ کالے گوروں کو اور گورے کالوں کو برداشت نہیں کرتے تھے۔

حضرت کا فرمانا ہے کہ جب میں یونیورسٹی میں داخل ہوا تو وہاں استقبال کرنے والوں نے یہ سمجھ کر کہ شاید یہ بھی مدعوعین میں سے ہیں۔ ہمارا استقبال کیا اور سیدھے

وہاں پہنچادیے جہاں جلسہ ہو رہا تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو اسٹیج پر تین کرسیاں تھیں۔ ایک صدر کی۔ ایک نائب صدر کی اور ایک سکریٹری کی۔ سکرٹری خاتون تھیں۔ ہمیں دیکھ کر یہ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے اسٹیج پر لے کر پہنچ گئے سکریٹری نے اپنی کرسی چھوڑ دی اور مجھے وہاں بیٹھنے کو کہا۔ اب تعارف ہوا اور انہوں نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ ہندوستان کی مشہور یونیورسٹی دیوبند کے چانسلر آئے ہیں۔ یہ آپ کے سامنے کچھ بیان کریں گے۔

حضرت فرماتے ہیں کہ ”مجھے اس پر تشویش ہوئی کہ نہ مجھے اس جلسہ کی غرض و غایت کا علم ہے اور نہ ہی ذہن میں کچھ ہے۔ اب کیا بیان کروں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فوراً ہی دل میں یہ ڈال دیا کہ یہاں فضیلت علم بیان کی جائے۔ چناں چہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان حضرات سے سوال کیا کہ آپ کو یہاں کس چیز نے جمع کیا ہے؟ اگر آپ کہیں کہ وطن نے۔ تو میں کہوں گا یہ اس طرح ٹھیک نہیں کہ میرا وطن ہندوستان ہے۔ اور آپ کا افریقہ سینکڑوں میل کا فاصلہ ہے۔ اگر آپ کہیں کہ رنگ نے تو یہ بھی خلاف مشاہدہ ہے۔ کہ میرا رنگ کچھ گورا ہے اور آپ کا سیاہ ہے۔ اگر آپ کہیں کہ مذہب نے تو وہ بھی ایسا نہیں۔ آپ کا مذہب اور ہے اور میرا مذہب اور ہے اور پھر کس چیز نے جمع کیا۔

فرماتے ہیں کہ جب میں نے سوال کیا تو وہ سارے میرا منہ تکنے لگے کہ یہ کیسا سوال ہے اور سائل کون ہے؟ پھر میں نے خود ہی عرض کیا کہ ہمیں جمع کیا ہے علم نے۔ آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں اور کیا کہنے والا ہوں۔ اور میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کیوں اور کیسے اور کس لیے جمع ہوئے ہیں۔

حضرت فرماتے ہیں۔ پھر میں نے پہلے قرآن وحدیث سے علم کی فضیلت بیان کی اور پھر یہ عرض کیا کہ ہمارے مذہب کی یہ تعلیم ہے کہ گورے اور کالے میں کوئی فرق نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ معزز اور محترم ہے جو متقی ہو۔ پرہیزگار ہو۔

فرماتے ہیں کہ جب میرا وعظ ختم ہوا تو سینکڑوں کی تعداد میں طلباء اور سامعین رو رہے تھے۔ اس وعظ کا اثر یہ ہوا کہ گوروں نے کالوں کو اور کالوں نے گوروں کو گلے لگا

لیا اور پھر ان میں سے ایک بڑی تعداد نے اسلام بھی قبول کرلیا۔

ان کی حقانیت کا حجت و برہان رہا ❁ تھا فرشتہ اور گمان حضرت انسان رہا

باوجود اس کے کہ حضرت قاری صاحبؒ نے عرب و عجم کا شاید ہی کوئی خطہ ایسا ہو کہ سفر نہ کیا ہو اور ہر جگہ ہی حضرتؒ کے چاہنے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ مگر حضرت نے اپنی ذات کے لیے بھی کسی سے کچھ نہیں لیا۔ جمعیت آپ کے مدّ نظر دارالعلوم دیوبند کی خدمت ہوا کرتی تھی اسی مقصد کے لیے دور دراز کے سفر کیا کرتے تھے۔ ؎

بے نیاز خانہ وجاہ جلال وسیم وزر ❁ محو تھا درس و بیان وعظ میں شام وسحر

حضرت کی کس کس بات کا ذکر کروں اور کسے چھوڑوں۔ حضرت نے وعظ وارشاد کے علاوہ تقریباً ایک سو سے زائد تصنیفاتِ مبارکہ بھی ملت اسلامیہ کے لیے چھوڑی ہیں۔ حضرت ساٹھ سال تک دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے۔ اس ساٹھ سالہ دور میں دارالعلوم نے جو ترقی کی وہ ایک ریکارڈ ہے۔

اس بات کا دکھ اور افسوس ہے تاحیات ضرور رہے گا کہ آخری وقت میں بعض ناعاقبت اندیش حضرات کی وجہ سے حضرت قاری صاحب کو سخت ذہنی اور جسمانی کوفت ہوئی۔ اس پیرانہ سالی میں یہ بات قطعاً نامناسب تھی اسی وجہ سے حضرت کی صحت دن بدن گرتی گئی یہاں تک کہ وہ وقت بھی آیا کہ جس دارالعلوم کے لیے حضرت نے ساری زندگی وقف کردی تھی اس کے صحن سے حضرت کا جنازہ اٹھایا گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت قاری صاحب کا وصال ایک فرد کا نہیں بلکہ ایک قوم کی موت ہے۔

وما كان قيس هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدّما

حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب فرماتے ہیں۔ ؎

بس اتنی سی حقیقت ہے فریب خواب ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

حال دنیا را بہ پرسیدم من از فرزانہ
گفت یا خواب است یا باد است یا افسانہ

بہرکیف حضرت قاری صاحبؒ روشن دلان دیوبند کے لعل شب چراغ تھے جس سے یہ گھر تمام آفتاب ہوگیا۔

لاکھ ستارے ہر طرف ظلمت شب جہاں جہاں
ایک طلوع آفتاب دشت وچمن سحرسحر

اللہ تعالیٰ حضرت حکیم الاسلامؒ کی علمی، مذہبی اور دینی خدمات کو قبول فرمائے اور ان کے درجات جنت الفردوس میں بلند فرمائے۔ آمین

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب رح

حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی مدظلہ
مہتمم جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا، پاکستان

آپ کا شمار برصغیر پاک وہند کے مشاہیر اور نامور جید اکابر علمائے دین میں تھا۔ آپ کی شخصیت اپنے علمی کمالات کی جامعیت اور ظاہری و باطنی اوصاف کمالیہ کے اعتبار سے نہایت بلند پایہ نادرہ روزگار شخصیتوں میں ممتاز حیثیت کی حامل تھی۔ آپ علوم قرآن وسنت کے ماہر وفاضل، حافظ وقاری، بےنظیر خطیب وواعظ یگانہ روزگار بے بدل مصنف تھے۔ ساتھ ہی مسلمانوں کی تربیت واصلاح کے لیے عظیم روحانی مربی اور پیشوا۔ عارف کامل اور شیخ طریقت بھی تھے۔ اور ہمہ جہت خوبیوں سے متصف تھے۔

فضلاء دارالعلوم دیوبند میں آں محترم کا ایک خاص اور ممتاز مقام تھا۔ آپ حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے پوتے اور حضرت مولانا حافظ احمد صاحب کے بیٹے تھے۔ اوران روحانی اور جسمانی نسبتوں میں اپنے اکابر سلسلے کے علوم کے وارث وامین اور مسلک دیوبند کے حقیقی معنی میں ترجمان ومحافظ تھے۔

آپ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد احمد صاحب نے قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ اور شیخ عالم حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی حضرت مولانا احمد حسن امروہیؒ وغیرہ اکابر علماء کرام ومشائخ عظام سے ظاہری وباطنی تعلیم وتربیت کا فیض پایا تھا۔ دورۂ حدیث شریف کے درس کی سعادت بھی حضرت قطب گنگوہیؒ کی خدمت میں ہی حاصل کی تھی۔

دارالعلوم دیوبند ایسے ہی اکابرین اولیاء اللہ اور بزرگان دین کی مساعی جمیلہ اور دعاء سحرگاہی کے نتیجے میں قائم ہوا۔ اور ایسی ہی برگزیدہ شخصیتوں کی سرپرستی میں علمی

اور روحانی ترقی کے مدارج طے کرکے نہ صرف پاک وہند بلکہ دنیائے اسلام کے علمی اور روحانی پیشوائی کے قابل بنا۔ دارالعلوم کے فیض یافتہ برصغیر کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی تشنگان علوم قرآن وسنت کو سیراب کرنے میں مصروف اور اصلاح اخلاق روحانی کے کمالات کے افاضے میں مشغول ہیں۔

دورِ اول کے دارالعلوم میں ہر علم وفن کے ماہر اساتذہ کرام اور یکتائے زمانہ علمائے کرام تعلیمی اور تدریسی خدمات کی انجام دہی پر فائز تھے جو اپنی نظیر آپ تھے۔ ظاہری علوم میں کمال اور جامعیت کے ساتھ اس وقت کے دارالعلوم کے ادنی خادم سے لے کر صدر مدرس اور مہتمم تک ہر شخص شب زندہ دار تہجد گزار۔ ذکر ومشاغل بھی ہوتا تھا اور رات کے وقت دارالعلوم کا گوشہ گوشہ ذکر اللہ اور تلاوت کلام اللہ سے گونجتا ہوتا تھا۔ دارالعلوم کے نائب مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی وہ صاحب نسبت بزرگ تھے جن کی تربیت حضرت قطب گنگوہیؒ نے کی تھی۔ اور انکا ذکر اللہ کا معمول سوا لاکھ مرتبہ روزانہ کا تھا۔ مشاغل اہتمام کی کثرت کے باوجود معمولاتِ مشائخ اور اوراد وظائف کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ وفات کے دن تک بارہ ہزار اسم ذات کا وظیفہ جاری رہا۔

دارالعلوم میں جس طرح قرآن وسنت اور فقہ حنفی کی تعلیم معیاری اور اعلیٰ درجے کی تعلیم ہوتی تھی۔ نیز علوم عقلیہ کے ماہر وکامل اساتذہ کرام کے سپرد تھی۔ غرض کہ دارالعلوم تمام علوم نقلیہ اور فنون عقلیہ کا جامع تھا۔ اسی طرح وہ اعمال فاضلہ اور اخلاق حسنہ کی تربیت گاہ اور اصلاح باطن وتزکیۂ نفوس کا مرکز بھی تھا۔

علم اگر روحِ عمل اور تربیت اخلاق سے خالی ہو تو یہ بے روح علم عجیب وخود پسندی کا سبب اور موجبِ وبال ہو سکتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کا علم چوں کہ روح عمل کا حامل اور مکارمِ اخلاق کا جامع تھا اس لیے وہاں کا ماحول علم وعمل کا داعی اور مبلغ تھا اور وہاں کا ہر شخص علم وعمل کی چلتی پھرتی تصویر اور اسلام کی علمی تبلیغ تھی علم وعمل اور باطنی تربیت کے امتزاج واجتماعات سے اسلام کا جو خصوصی مزاج اور ذوق قلوب میں رسوخ پاتا تھا وہ

محض کتابی خشک علم سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس جامعیت ظاہر و باطن اور علم عمل نیز تزکیۂ باطن کی ترکیب و اجتماعیت سے حاصل شدہ مزاج اور ذوق کو دیوبندیت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دیوبندیت کی حقیقی جامع تعریف معلوم کرنے کے لیے ذیل کے شعر کا مصرعہ اول کافی وافی ہے ؎

در کفِ جام شریعت در کفِ سندان عشق ۞ ہر ہوس نا کے نہ داند جام وسنداں باختن

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب نے دارالعلوم کے علمی اور روحانی ماحول میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی۔ اور وہاں ہی اپنے زمانے کے ممتاز علماء اور فضلاء کرام اور مشائخ عظام سے شریعت و طریقت کی تعلیم و تربیت حاصل کر کے علم و معرفت میں امتیازی شان اور ممتاز مقام پر فائز ہوئے۔ آپ ان فضلائے دارالعلوم میں سے ایک ہیں جن پر دارالعلوم کو بڑا ناز ہے۔ اور وہ دارالعلوم کے لیے سرمایہ افتخار و اعزاز ہیں۔

1315ہجری میں آپ دیوبند میں ہی پیدا ہوئے۔ اور ۱۳۲۲ھ سے ۱۳۳۷ھ تک پندرہ سال کی مدت میں قرآن کریم۔ فارسی عربی کے درجات میں تمام علوم و فنون کی تکمیل کر کے سند فضیلت حاصل کی۔ دو سال میں قرآن کریم حفظ کیا پانچ سال میں فارسی، ریاضی، حساب کا نصاب مکمل کیا۔ اور آٹھ سال میں درجہ عربی کی تمام نصابی کتابوں کی تعلیم حاصل کی۔

۱۳۳۵ھ میں حضرت محدث کبیر و شہیر علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ متکلم اسلام اور والد ماجد مولانا حافظ احمد صاحب شیخ الادب وفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ۔ عارف ربانی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ حضرت مولانا اصغر حسین میاں صاحبؒ۔ معقول و فلسفے کے امام حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ۔ حضرت مولانا عبدالسمیع صاحبؒ وغیرہ آپ کے اساتذہ کرام میں شامل ہیں۔

۱۳۳۳ھ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب نور اللہ مرقدہ کو چوں کہ

سفرِ حجاز پیش آ گیا تھا اور پھر وہاں سے جزیرہ مالٹا میں قید و بند کی صعوبتوں اور آزمائشوں میں تقریباً پانچ سال کا عرصہ لگ گیا تھا۔ اس لیے حضرت شیخ سے باقاعدہ درسِ حدیث لینے اور کتابوں کے پڑھنے کا موقع میسر نہیں آ سکا۔ ویسے حضرت شیخ کی مجلسوں اور صحبتوں سے اپنی خداداد صلاحیت وقابلیت اور ذہانت وفطانت کی بدولت ہمہ وقت بھرپور استفادہ ہوتا رہا۔

۱۳۳۹ھ میں حضرت شیخ کی مالٹا سے واپسی پر باضابطہ نسبت بیعت کی سعادت حاصل ہوئی۔ مگر حضرت شیخ کی وفات جلد ہوگئی۔ واپسی مالٹا کے بعد صرف سات ماہ حضرت بقید حیات رہے۔ اس لیے حکیم الاسلام نے تزکیۂ باطنی کی تکمیل کے لیے مجدد وقت مصلح اعظم حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ کے دربار گوہر بار خانقاہ تھانہ بھون کی طرف رجوع کیا۔ تکمیل سلوک کے بعد ۱۳۵۰ھ میں دربار اشرفی سے آپ کو خلعت خلافت واجازت بیعت سے سرفراز کیا گیا۔

۱۳۳۷ھ میں تحصیل علم سے فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند میں ہی تعلیم وتدریس کا سلسلہ جاری کر دیا تھا۔ جو درجہ بدرجہ اپنے آخری نقطۂ عروج پر پہنچ گیا مشکوۃ شریف اور بخاری شریف، جلالین شریف، صحیح مسلم شریف اور منطق میں میر زاہد وغیرہ پڑھایا کرتے تھے۔ مشکوۃ شریف اور مسلم شریف حضرت حکیم الاسلام نے اپنے والد ماجد ہی سے پڑھی ہیں۔

احقر کو بھی بہ زمانہ طالب علمی مشکوۃ شریف کے سبق میں حاضری کا موقعہ ملا۔ حضرت حکیم الاسلام کا طرز بیان متکلمانہ اور انداز تفہیم حکیمانہ ہوتا تھا مشکل سے مشکل مسئلے کا حل بڑی آسانی کے ساتھ دلنشیں کرنے کا ملکہ حاصل تھا عارفانہ نکات اور لطائف کے بیان سے حلقہ درس مسرور وشگفتہ رہتا تھا تقریر رواں اور مربوط ہوتی تھی۔ آواز میٹھی، لہجہ سنجیدہ اور مشفقانہ ہوتا تھا حلم وبردباری، شگفتہ مزاجی آپ کے اوصاف اور خصائل ہیں امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔ شفقت ومحبت، تواضع اور سادگی کے آثار آپ پر ہر وقت ظاہر تھے۔

وعظ و تلقین

حکیم الاسلام کی وعظ و تلقین اور خطاب عام کے وقت بھی یہی حالت رہتی تھی۔ عام مقررین کی طرح گلا پھاڑنا اور ہاتھ پاؤں مارنا تو کجا معمولی حرکت بھی نہیں ہونے پاتی تھی۔ تقریر میں بے ساختگی، روانی اور بے تکلفی تسلسل انتہائی درجے کی آمد گویا آبِ رواں کا سیلاب ہے، جو اوپر سے نشیبی جگہ میں امڈتا چلا آرہا ہے۔ گویا سامنے کھلی کتاب ہے جس کو آپ پڑھ رہے ہیں موقع بہ موقع سبق آموز حکایات و لطائف، حقائق و معارف، متکلمانہ استدلات اور عارفانہ نکات سے بھرا ہوا خزانہ ہوتا تھا۔ بات میں سے بات نکال لینے کا وہ خداداد سلیقہ آپ کو حاصل تھا کہ سامعین محوِ حیرت رہ جاتے تھے۔ اگر کسی جلسے میں طبیعت ناساز ہوگئی اور تقریر سے معذرت کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو کئی گھنٹے معذرت ہی میں لگ جاتے۔ بجائے خود وہ معذرت ہی ایک بڑی مفید تقریر کے قائم مقام ہو جاتی۔

وعظ و خطاب کا یہ ملکہ راسخہ اور قوتِ بیانیہ اللہ تعالیٰ کی عطا اور موہبت خاص تھی جس سے آپ کو نوازا گیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جسمانی اور روحانی نسبتِ قاسمی آپ کے اندر متصرف تھی۔ اور آپ گویا چلتی پھرتی قاسمی تصویر تھے۔

پھر اس وہبی ملکہ اور طبعی قابلیت میں آیت من آیات اللہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ علوم و معارف قاسمیہ کے شارع اور ترجمان شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور ان کے برادر معظم شیخ الادبا حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی تعلیم و تربیت نے مزید جلا بخشی اور آپ کو بین الاقوامی بے نظیر واعظ و خطیب بنا دیا۔

دیوبند میں بعد نماز جمعہ عام طور پر شہر کی جامع مسجد میں حضرت حکیم الاسلام کا وعظ ہوا کرتا تھا۔ وعظ کے بعد دارالعلوم کے دارالاہتمام میں مجلس ہوتی تھی۔ جس میں حاضرین کو بہت لذیذ اور عمدہ چائے پیش کیے جانے کا معمول تھا۔

نماز جمعہ کے بعد وعظ میں عام نمازیوں کے علاوہ طلبا اور علماء بہت اشتیاق سے شرکت کیا کرتے تھے۔ اپنی تعلیم کے زمانہ میں ایک مرتبہ احقر اس وعظ میں شریک تھا اور

میرے والد ماجد مولانا سید عبدالکریم صاحب مکتھلوی اور حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ بھی اس وعظ کے سامعین میں تھے۔ حضرت حکیم الاسلام کا یہ وعظ "لاتقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات" پر ہورہا تھا۔ اپنی خاطر طرز کے مطابق اس مضمون کو خوب بسط وشرح کے ساتھ بیان کیا تھا۔ اور قیاس کی تین قسموں بالمساوات قیاس بالاعلیٰ۔ قیاس بالادنیٰ کو بیان کرنے کے بعد شہداء کی حیاتِ برزخی سے قیاس بالاولویت کے اعتبار سے انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی حیاتِ برزخیہ کو اور قیاس بالادنیٰ کے لحاظ سے اولیائے کرام کی حیات کو ثابت فرمارہے تھے۔ یہ گروہ اولیاء بھی محبت خداوندی کا مقتول ہے۔ اور ہر لحظہ فنا وبقا کا وُرود اس پر ہوتا ہے اور ہر آن موت وحیات کا مشاہدہ کرنا۔ موت کی تلخی کے بعد حیات کی لذت سے شاد کام ہوتا رہتا ہے گویا

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ❁ ہر زماں ازغیب جانے دیگر است

کا مصداق یہ گروہ ہے۔ متذکرۃ الصدور دونوں حضرات مفتیانِ کرام کا تاثر اب ذہن میں اتنا ہی محفوظ رہ گیا کہ مضمون کو بہت ہی پھیلا دیا گیا جس کا سمیٹنا مشکل ہو گیا۔ واقعی حضرت حکیم الاسلام کے مضامین وتقاریر میں بہت ہی پھیلاؤ ہوتا تھا۔

ایسا ہی واقعہ ایک مرتبہ جلسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں پیش آیا جلسہ میں حضرت حکیم الاسلام کا وعظ ہوا۔ اپنے مزاج اور مقام کے مناسب اس میں ایسا صوفیانہ اور عارفانہ مضمون بیان فرمایا جو خواص بلکہ اخص الخواص کے سمجھنے کا تھا۔ مگر روانی تقریر میں مجمع عام میں بیان فرما گئے۔ آں ممدوح کی تقریر کے بعد متصل میں حضرت شیخ الاسلام حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ کا وعظ اسی جلسے میں تھا۔

حضرت شیخ الاسلام نے ابتداء وعظ میں موضوعِ مضمون کی نزاکت اور اس کا مجمع خواص کے مناسب ہونے کا ذکر فرمایا۔ پھر اس کا تذکرہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کی مجلس مبارک میں ہوا تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کچھ ایسا ہی ارشاد فرمایا تھا۔ یہ احقر اور حضرت والد ماجدؒ اس جلسے میں شریک تھے۔

ہمارے لیے اس واقعہ میں سبق یہ ہے کہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحبؒ نے مجمع عام میں اور حکیم الاسلام کی موجودگی میں ان کی تقریر کا جو حصہ قابل اصلاح سمجھا اس کا اظہار بلا تکلف فرمایا۔ مگر الفاظ نرم اور طریقہ بیان خوشگوار تھا۔

دوسری طرف حضرت حکیم الاسلام نے بھی کسی قسم کی ناگواری اور ناخوشی کا مطلق اظہار واحساس نہیں فرمایا۔ اس زمانے میں عام طور پر یا تو اصلاحی مشورے کا اظہار ہی نہیں کیا جاتا اور اگر کیا جاتا ہے تو لہجہ عام طور پر کرخت اور طریقہ بیان سخت ہوجاتا ہے۔ جس کا اثر مخاطب پر ناگواری کی صورت میں ہوتا ہے۔ اور بجائے اصلاح کے تقابل ونزاع کی صورت میں پیدا ہوجاتی ہے۔

ریاست پٹیالہ راجپورہ اسٹیشن کے قریب عربی مدرسہ میں احقر پڑھتا تھا۔ یہ مدرسہ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا قائم کیا ہوا تھا۔ حضرت حکیم الاسلام وہاں تشریف لائے۔ شب کے وقت شہر کے اندر عام میدان میں وعظ ہوا۔ مسلمانوں کے علاوہ غیر مذاہب کے لوگ بھی شریک ہوئے۔

آپ کے انداز بیان اور تقریر کی روانی اور تسلسل سے وہ لوگ بے حد متاثر تھے۔ بعض سامعین نے کہا کہ اس تقریر میں اس قدر ربط اور بسط تھا کہ مقرر کو کسی جگہ یعنی کہہ کر تشریح کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ یعنی کے ذریعۂ کلام کو سمجھا جاتا تو اس مثل کے مصداق ہوتا ہے کہ محتاج یعنی باشد لایعنی باشد۔

پاکستان میں حکیم الاسلام کا سب سے پہلا سفر غالباً ۱۹۵۰ء میں ہوا۔ فیصل آباد بھی تشریف لائے اور دھوبی گھاٹ کے مشہور گراؤنڈ میں جلسۂ عام کا اعلان ہوا۔ حدیث بنی الاسلام علی خمس پر کئی گھنٹے علم وعرفان کی بارش ہوتی رہی۔ نماز روزہ حج وزکوۃ ارکان اربعہ اسلام کا فلسفہ عجیب وغریب طریقے سے بیان فرمایا۔

کابل میں ایک تقریر

حکیم الاسلام کو فارسی زبان میں بھی تقریر کا ملکہ حاصل تھا۔ چناں چہ اپنے افغانستان کے دوران کابل کے

ایک ہوٹل میں وہاں کی سب سے اونچی علمی سوسائٹی انجمن ادبی نے شاندار عصرانہ دیا جس میں اعلیٰ حکام۔ مدیران جرائد ورسائل۔ علماء امراء وغیرہ مدعو کیئے گئے۔

اس مجمع میں حضرت حکیم الاسلام نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کی جو علمی مہمّات مثلاً قران کریم کی امامت۔ اس کا جامع علوم ہونا۔ اسلامی مرکزیت، مسئلہ امامت وامارت، دارالعلوم کے تعارف اپنے سفر کے مقصد اور افغانستان سے متعلق چند اصلاحی نکات پر مشتمل تھی۔ یہ پوری تقریر فارسی زبان میں ہوئی۔

فاضل مدیر انیس نے اسی مجمع میں کھڑے ہوکر کہا کہ ہم اعتراف کرتے ہیں کہ افغانستان کی تاریخ میں اس نوع کی فاضلانہ تقریر اب تک نہیں ہوئی تھی جس سے علماء اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقے نے یکساں اثر قبول کیا ہو۔

جناب محمد صالح صاحب قاضی مرافعہ نے فرمایا جو ہائی کورٹ کے قاضی اور حضرت حکیم الاسلام کے والد ماجد کے ارشد تلامذہ میں سے تھے کہ اس تقریر نے نوجوانوں کو قرآن حکیم کے قدموں میں لاگرایا۔ ان اثرات کو کابل کے مؤقر جریدہ انیس نے پشتو زبان میں بھی شائع کیا۔

مجلسِ وزراء کے صدر نشیں صدر محمد ہاشم خاں صدر اعظم کی دعوت پر قصرِ صدارت عظمیٰ میں حضرت حکیم الاسلام تشریف لے گئے۔ صدر اعظم نے غایت عقیدت سے حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب بانیِ دارالعلوم دیوبند کا ذکر فرمایا اور کہا:۔

میرے والد معظم اور عمِ محترم نے حضرت مولانا کا زمانہ پایا ہے اور والدہ معظّمہ ان سے غیر معمولی عقیدت رکھتی تھیں۔ اس مجلس میں حضرت شمس العلوم مولانا حضرت گنگوہیؒ کا ذکر مبارک بھی آیا۔ اسی اثنا میں فرمایا کہ ہمارے گھر میں ان حضرات کے تبرکات بھی محفوظ ہیں۔ حضرت نانوتویؒ قدس سرہ کی ایک ٹوپی تھی جس کو ہماری والدہ معظّمہ بطور تبرک کے سال بھر میں ایک آدھ بار نکالا کرتی تھیں۔ اور ہم جب کبھی بیمار پڑ جاتے تو وہ ہمارے سروں پر رکھ دی جاتی جس سے ہم شفایاب ہو جاتے تھے۔

روئیداد سفرنامہ افغانستان قصر شاہی میں شاہِ افغانستان سے ملاقات ہوئی۔اور حضرت حکیم الاسلام بعنوان نذر عقیدت واخلاص اپنی تحریر اجازت لے کر پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو شاہِ افغانستان غایت تواضع سے خود ہی کھڑے ہوگئے۔حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ آپ تکلیف نہ فرمائیں۔ فرمایا یہ خلاف ادب ہے جتنی دیر کھڑے ہوکر یہ تحریر پڑھی جاتی رہی شاہ افغانستان برابر کھڑے سنتے رہے۔

تصانیف: تقریر کی طرح حضرت حکیم الاسلام کا فیض قابلِ قدر تصانیف اور تالیفات سے بھی ملک وبیرون ملک عام ہوا۔اور مسلمانوں کے ہر طبقے کو تعلیم یافتہ اور قدیم طلباء سب کو آپ کا فیض پہنچا۔ایک سو سے زیادہ آپ کی تصانیف کی تعداد ہے۔جن میں خصوصیت سے فطری حکومت "التشبہ فی الاسلام"۔آفتابِ نبوت کامل۔شہید کربلا اور یزید۔کلمہ طیبہ بمعہ کلمات طیبات روایات الطیب وغیرہ وغیرہ۔

املائی تقریر حکیم الاسلام نے اپنے استاذ حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کی املائی تقریر کے لیے ایک کاپی میں چھ سات کالم بنائے۔اور ہر کالم میں ایک ایک بحث کا عنوان قائم کیا۔

مباحث حدیث، مباحث تفسیر، مباحث عربیت، نحو وصرف، مباحثِ فلسفلہ ومنطق، مباحث ادبیات جن میں اشعارِ عرب اور فصاحت وبلاغت کی تحقیق آتی تھی۔ مباحث تاریخ وغیرہ نیز فنون عصریہ کے لیے ایک کالم رکھا۔اس لیے کہ موجودہ دور کے فنون جیسے سائنس فلسفہ جدید اور ہیّت جدید وغیرہ کے مباحث حضرت شاہ صاحب کے درس حدیث میں آجاتے تھے۔

ایک کالم حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے اور محاکے کا بھی تھا۔جس میں قال الاستاذ کے عنوان کے تحت بحث وتنقیح کے بعد اس نتیجے اور فیصلے کا تذکرہ کیا جاتا تھا جس کو حضرت شاہ صاحبؒ یہ کہہ کر فرمایا کرتے تھے کہ "میں کہتا ہوں" اس بیاض کو ایک طالب

علم نے حضرت حکیم الاسلام سے لے کر پھر واپس نہیں کیا۔ ورنہ تو علوم وفنون کا بڑا خزانہ اور تحقیقات عجیبہ اور غریبہ کا بہت بڑا ذخیرہ طلباء اور علماء کے ہاتھ میں ہوتا۔ اس طرز تحقیق سے طلباء میں بھی شوق مطالعہ اور ذوق تبحر پیدا ہوتا تھا۔ اور اس کے آثار زمانۂ طالب علمی ہی میں نمایاں ہونے لگتے تھے۔

چناں چہ حضرت شاہ صاحبؒ کے دورۂ حدیث کے تلامذہ میں سے بعض نے اپنے زمانۂ طالب علمی ہی میں کئی تحقیقی مقالے اور قابلِ قدر رسالے لکھے جن سے ان کے ذوق مطالعہ اور علمی تبحر کا ثبوت ملتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ ختم نبوت کے موضوع پر ختمِ نبوت فی القرآن میں سو آیات اور ختمِ نبوت فی الحدیث میں دوسو احادیث اور ختم نبوت فی الآثار میں سینکڑوں اقوالِ اکابر امت کا ذخیرہ جمع کر دیا۔ اور حضرت مولانا بدرِ عالم اور حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی نے بھی حیات عیسیٰ علیہ السلام پر رسالے لکھے۔

حضرت حکیم الاسلام نے بھی تاریخ ادب کے سلسلے میں مشاہیر امت پر قابل قدر اور معلومات افزا رسالہ لکھا۔

عربی ادب

حضرت حکیم الاسلام کو عربی ادب سے بھی خوب مناسبت تھی۔ اور عربی قصائد لکھنے کا ملکہ حاصل تھا۔ ایک عربی قصیدہ نونیۃ الآخاد۔ آپکا طبع شدہ قصیدہ ہے۔ اس میں امت کے مشاہیر علم وفن کی مختصر سوانح نظم ونثر میں جمع کی ہے۔ آپکی متعدد نظمیں مثنویاں اور قصائد رسالہ القاسم دیوبند وغیرہ میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

غرض کہ حضرت حکیم الاسلام کو اللہ تعالیٰ نے تقریر وتحریر تصنیف وتالیف کا وہ عظیم ملکہ عطا فرمایا تھا۔ جس سے عام وخاص جدید وقدیم ہر طبقہ کے لوگوں کو عظیم فائدہ پہنچا۔ اور آپ کی بہت سی تحریرات اور تالیفات مسلمانوں کی ہدایت وراہنمائی کے لیے آپ کی عمدہ یادگار باقیات صالحات میں شمار ہوں گی۔

تقریر کے سلسلے میں حضرت حکیم الاسلامؒ پاک و ہند کے تقریباً ہر گوشے میں تشریف لے جاتے تھے۔ حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے ساتھ بھی آپ نے مرزائیوں کی تردید کے لیے پنجاب کا دورہ فرمایا اور خاص قادیان بھی گئے۔ کہوٹہ ضلع راولپنڈی کے سفر میں حضرت شاہ صاحبؒ نے آپ کو فقیر صاحب کا خطاب دیا۔ واقعہ یوں ہوا کہ جلسہ گاہ شہر سے میل بھر کے فاصلے پر تھی۔ بارش زیادہ ہونے کی وجہ سے سر سے پاؤں تک کپڑے بھیگ گئے۔ جلسہ گاہ کے قریب ایک مسجد میں جا کر بھیگے ہوئے کپڑے اتارے۔ اور ایک صاحب نے کپڑے اتارنے کے لیے ایک لنگی چادر کے طور پر دی اور ایک صاحب نے لنگی اوپر اوڑھنے کے لیے دی۔ جناب حکیم الاسلام اسی ہیئت وحالت میں ننگے سر اور ننگے پاؤں جلسہ گاہ میں پہنچے۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تقریر کرنے کا حکم فرمایا۔ اور سٹیج پر کھڑے ہو کر حکیم الاسلام کا ان الفاظ میں تعارف کرایا۔

"یہ فقیر جو آپ کے سامنے جلسے میں ننگے سر اور ننگے پاؤں کھڑے ہیں فلاں کے بیٹے فلاں کے پوتے ہیں علمی مواد خاصا رکھتے ہیں۔ مجمعے میں بولنے کا ڈھنگ انہیں آ گیا ہے۔ یہ جیسے باہر سے فقیر نظر آتے ہیں ویسے ہی اندر سے بھی فقیر صاحب ہی ہیں۔ آپ ان کی تقریر سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ملتان میں بھی حضرت شیخ ذکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے احاطے میں جلسہ ہوا۔ اس جلسے میں بھی حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کو تقریر کرنے کا حکم دیا اور تقریر کے بعد اپنی تقریر میں بار بار حوصلہ افزاء کلمات فرماتے رہے۔" سیرت انور"

مسلک دیوبند

اس نام سے حکیم الاسلام کا طبع شدہ رسالہ موجود ہے اس خاص موضوع سے آپکی دل بستگی اور گہرے تعلق کا اندازہ اس رسالے کے مطالعہ سے ہوگا۔ اس رسالے میں مسلکِ دیوبند کے تمام گوشوں پر سیر حاصل بحث کر کے مسلک کو ہر طرح کے گرد وغبار اور ملاوٹ سے پاک صاف کر کے منقح صورت میں پیش کیا

ہے۔اور دیو بند کی حدود متعین کر کے اس کی جامع مانع اصولی تعریف کر دی گئی ہے۔اس کے علاوہ عملی طور پر بھی مسلکِ دیو بند کی حفاظت کے لیے حضرت حکیم الاسلام نے نہایت محنت ومشقت برداشت فرمائی۔اور خصوصیت سے مسئلہ حیات النبی ﷺ پر چار سالہ نزاع کے خاتمہ کے لیے بے حد سعی اور کوشش فرمائی۔ملتان، جہلم سرگودھا اور راولپنڈی وغیرہ میں عام وخاص مجالس میں اس مسلک کی وضاحت مسلک اکابر کے مطابق فرماتے رہے۔اور اس سلسلے میں ایک جامع اور مفصل تحریر سپردِ قلم فرما کر اس نزاع کا خاتمہ فرمایا۔

آں حضرت ﷺ کی حیات فی القبر کے بارے میں کل پاکستان اشاعت التوحید والسنۃ کے اس وقت کے صدر مولانا قاضی محمد نور صاحب مرحوم قلعہ دیدار سنگھ اور ناظم اعلیٰ مولانا غلام اللہ خاں صاحب راولپنڈی کے دستخط بھی حاصل کر لیے۔

حضرت حکیم الاسلام کا مسلکِ دیو بند کے تحفظ کے لیے یہ عظیم کارنامہ تھا۔جزاہم اللہ خیر الجزا۔

تفصیل کے لیے ماہنامہ تعلیم القرآن اگست ۱۹۶۲ء ملاحظہ کیجئے حکیم الاسلام سرگودھا تشریف لاتے ہوئے کار میں جھنگ سے اسی سڑک سے سفر ہوا جس پر اس حقیر کی رہائش گاہ قصبہ ساہیوال آباد ہے۔جب قصبہ ساہیوال کے قریب کار پہنچی تو حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں اتر کر عبد الشکور کو اطلاع کر دوں۔اس پر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سرگودھوی نے فرمایا کہ ان کو اطلاع ہوگئی ہوگی۔آپ تنہا تکلیف نہ فرمائیں۔اور واقعہ بھی یہی تھا کہ احقر پہلے ہی سرگودھا مسجد بلاک ا میں پہنچ چکا تھا۔وہاں دن میں خصوصی مجلس میں بڑی بسط اور تفصیل کے ساتھ مسئلہ حیات النبی ﷺ کی وضاحت فرمائی۔جس میں اکابر علماء اور یہ حقیر بھی شامل تھا۔رات کے وقت کمپنی باغ سرگودھا میں بہت مفصل وعظ ہوا۔جس میں ہمارے مخدوم حضرت مولانا عبد العزیز صاحب گمتھلوی مدظلہ العالی بھی تشریف فرما تھے۔سامعین بہت محفوظ اور مسرور تھے کہ تقریریں بہت سنتے آئے ہیں۔مگر علم وعرفان کی یہ بارش اور معرفت وحکمت کی یہ فراوانی

اپنی مثال آپ ہے۔ پھر طرز بیان اور فصاحت لسان اس پر مزید برآں ہے۔

اس واقعہ میں حضرت حکیم الاسلام کا ورودِ مسعود قصبہ ساہیوال میں تو نہ ہو سکا۔ اور یہ سعادت ہماری قسمت میں نہیں تھی۔ مگر اس سڑک پر آپ کا گزر ہوا اور اس مجلس میں احقر کا غائبانہ ذکر احقر کے لیے باعثِ صد مسرت اور خوشی ہے ع

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس مجلس میں ہے

حضرت حکیم الاسلام کے حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے توسط اور نسبت سے حضرت حکیم الاسلام کی بے انتہا شفقتیں اسی حقیر پر بہت کم عمری اور بچپن سے ہی مبذول رہی ہیں۔ زمانہ طالب علمی دار العلوم میں بھی آپ کے ہی دورۂ اہتمام میں دو سال تک حصولِ تعلیم کے لیے قیام رہا۔ آپ کے ہی زیر سرپرستی زیر سایہ قیام رہا۔ اور محبت وشفقت سے بھر پور آپ کا حسنِ سلوک ہمیشہ قائم رہا۔

خانقاہ تھانہ بھون میں حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کی زیارت اور مجالست کے لیے دوسرے مشاہیر اکابر و علماء کی طرح حضرت حکیم الاسلام بھی آیا کرتے تھے۔ اور یہ ناکارہ بھی اپنے والد ماجد کے ساتھ وہاں قیام پذیر رہتا تھا۔ اس لیے سبھی حضرات کی زیارت سے مشرف ہونے کا شرف حاصل رہتا تھا۔

ایک مرتبہ رمضان المبارک میں حضرت حکیم الاسلام پندرہ روز قیام کے ارادے سے تھانہ بھون تشریف لائے۔ میری بہت کم عمری کا زمانہ تھا۔ قرآن پاک بھی ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ والد ماجد وغیرہ کے مشورہ سے حضرت حکیم الاسلام نے عدالت والی مسجد میں تراویح کے اندر دو دو سیپارے روزانہ پڑھنا شروع کر دیے۔ احقر بھی والد ماجد مرحوم کے ساتھ اشتیاق میں جاتا۔

ایک دن حضرت حکیم الاسلام نے دیکھ کر پوچھا کہ تمہیں نیند نہیں آتی اور تم تھکتے بھی نہیں۔ مجھے جواب میں کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ خاموشی کے ساتھ میں نے والد صاحب سے عرض کیا جو پاس ہی کھڑے تھے کہ حضرت سے دعاء کرائیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ

قاری بنادے۔ والد صاحب کے کہنے پر حضرت نے دعاء کی اور میرا غالب گمان یہی ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی وہ دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی دعائے نیم شبی قبول ہوئی۔ اور احقر کے نام کے ساتھ قاری کا لفظ لگ گیا۔ اگرچہ معنوی حیثیت سے اس کا مصداق یہ ناکارہ نہیں بن سکا۔

دارالعلوم دیوبند کی مسجد میں نماز مغرب کے بعد نوافل میں حضرت حکیم الاسلام قرآنِ کریم کا ایک پارہ پڑھا کرتے تھے اور یہ معمول آپ کا سفر حضر میں برابر جاری رہتا تھا۔ جہاں کہیں بھی ہوتے یہ عمل آپ کا جاری رہتا۔ ان دنوں احقر کو بھی جوش اٹھا اور حضرت حکیم الاسلام کی نقالی کرنے لگ گیا۔ ایک دفعہ بڑی نادانی ہوئی کہ مسجد کے اسی حصے میں کچھ صفیں چھوڑ کر خود بھی نوافل میں قرآن کریم پڑھنے لگا۔

حضرت حکیم الاسلام بھی محراب میں حسبِ عادت اپنی منزل پڑھ رہے تھے۔ احقر کی آواز سے حضرت کے پڑھنے میں خلجان ہوا اور منازعت کی صورت پیدا ہوگئی۔ تو حضرت نے سلام پھیرنے کے بعد اس پر مناسب لہجے میں تنبیہ فرمائی۔ اس کے بعد یہ احقر مسجد کے بالائی حصے میں پڑھنے لگا اس معمولی سی ناگواری کے علاوہ عمر بھر باوجود طویل صحبت اور مجلسوں کے کبھی حضرت حکیم الاسلام کو احقر کے متعلق ناگواری کے اظہار کی نوبت نہیں آئی۔ طلباء اپنے زمانۂ طالب علمی میں عام طور پر آزادانہ روش پر چلتے ہیں۔ انجمن سازی اور کئی قسم کے دھندوں میں لگے رہتے ہیں، مگر الحمدللہ خانقاہ تھانہ بھون کی برکت سے کسی ایسی مجلس میں کبھی شرکت کا خیال نہیں ہوا۔

ایک مرتبہ پنجابی طلباء نے بہت زور لگایا اور یہ کہہ کر شرکت سے انکار کردیا کہ نئی انجمن سازی، دورِ صدارت اور نظامت کی کیا ضرورت ہے حضرت مہتمم صاحب ہمارے سب کے صدر اور سرپرست ہیں۔ بعض طلباء کے سخت اصرار پر نودرے میں بعد مغرب ایک جلسہ طلباء میں صرف ایک مرتبہ شرکت کا اتفاق ہوا۔ تو اس میں بھی ایسی ہی تقریر کی جو عام طور پر طلباء کے مزاج اور مذاق کے مناسب نہ تھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ سیاسات

عبادات کی حفاظت کا ذریعہ وسیلہ ہیں۔ اصل مقصود عبادات ہیں۔

اھتمام: حضرت حکیم الاسلام کو ۱۳۴۱ھ میں نائب مہتمم بنایا گیا اور حضرت والد ماجد مولانا محمد احمد صاحب کی وفات پر ۱۳۴۸ھ میں باقاعدہ طور پر دارالعلوم کا مہتمم مقرر کیا گیا۔ آپ کا دورِ اہتمام ساٹھ سال تک جاری رہا۔ اس دور میں دارالعلوم نے نہایت شاندار ترقی کے مدارج طے کئے اور دارالعلوم کی شہرت وعظمت میں بھی بہت اضافہ ہوا۔

درحقیقت دارالعلوم کو عربی مدرسہ سے دارالعلوم بنانے میں حضرت قاسم العلوم کے خلف حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم کی وجاہت اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے حسنِ تدبیر اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی علمی اور روحانی عظمت کا بہت بڑا حصہ ہے۔ حضرت حافظ صاحبؒ کے چالیس سالہ دورِ اہتمام میں دارالعلوم کے ہر شعبے میں جو ترقیات حاصل ہوئیں۔ اور اس کی تعمیرات میں جو شاندار اضافات ہوئے اس سے دارالعلوم کو صحیح مقام حاصل ہوا۔ پھر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری طیب صاحبؒ کے ساٹھ سالہ دور میں یہ ترقیات روز بروز بڑھتی گئیں۔ دن دونی رات چوگنی ترقی حاصل ہوئی۔ تعلیمی اور تعمیری سلسلہ کافی بڑھا۔ اساتذہ طلباء اور عملے کی تعداد بڑھ گئی اور آمدنی کی رفتار غیر معمولی طور پر ترقی پذیر ہوئی۔

دارالعلوم کے آغاز ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۴۷ھ تک چھ مہتمموں کے چونسٹھ سالہ دور اہتمام میں چودہ لاکھ اٹھاسی ہزار آٹھ سو تیئس روپے نو آنے گیارہ پائی کل آمدنی ہوئی۔ اور حضرت حکیم الاسلام کے دورۂ اہتمام ۱۳۴۸ھ تا ۱۳۸۲ھ صرف چونتیس سال کی آمدنی ترانوے لاکھ روپے بیالیس ہزار سات سو تینتالیس روپے تین آنے تین پائی ہوتی ہے۔ (از تاریخ دیوبند)

اس ترقی اور اضافے کا سلسلہ آخری دور تک برابر جاری رہا۔ دارالعلوم کے ذمہ داروں میں آپ پہلے شخص ہیں جنھوں نے بیرونی ممالک برما افغانستان، عدن، حجاز، مصر، اردن، لبنان، ساؤتھ افریقہ، روڈیشا، کینیا، ٹانگا نیکا، زنجبار، مدغاسکر، حبش اور

پاکستان وغیرہ میں جاکر دارالعلوم کا تعارف کرایا۔ اور ہر خطہ ملک میں پہنچ کر اپنی خداداد قابلیت خطابت اور وہبی طرز بیان اور فصاحت زبان کے ذریعے اسلامی مقاصد اور مسلکِ دارالعلوم کی اشاعت وتبلیغ کی اسلامی خدمات اور کارہائے نمایاں کا عظیم حصہ اور ناقابلِ فراموش بہترین یادگار ہے اس کے ساتھ ہی امت پر عموماً اور منتسبین دارالعلوم پر خصوصاً ناقابل فراموش احسان بھی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس میں ان ترقیات اور شاندار خدمات کی اجتماعی طور پر اظہار کا وقت موعود آیا۔ اور نہ صرف پاک وہند بلکہ دنیائے اسلام کے اساطین وارا کین سلطنت نے دارالعلوم کے جلال ووقار اس کی عظمت وسطوت اور عروج وکمال کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کرلیا۔ تو پھر اس باغ وبہار میں خزاں کے آثار شروع ہوئے اور اختلافات وتنازعات کا سلسلہ دراز ہوا۔ جس کے نتیجے میں حضرت حکیم الاسلام کو دارالعلوم سے ظاہری مفارقت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ **وکان امر اللہ قدرا مقدورا وللہ الامر من قبل ومن بعد.**

خاندان قاسمی کی سوسالہ خدمتِ جلیلہ اور مساعی جمیلہ کے ذریعے دارالعلوم کو جو شاندار عروج اور غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی وہ تاریخ کا ایک سنہرا باب اور اسکے مظاہر وآثار تاریخ کا ایک درخشندہ حصہ بن چکا ہے۔

حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ کی اپنے مرض وفات میں نصیحت

حضرت تھانویؒ کے مرض وفات میں حکیم الاسلام تھانہ بھون حاضر خدمتِ اقدس ہوئے۔ باوجود طولِ مرض اور ضعف شدید کے حضرت تھانویؒ نے تعلیم وتربیت کے زرین اصول اور اصلاحی آئین سے متعلق ایک مفصل تقریر فرمائی جس کا خلاصہ یہ تھا۔

"میں نے قرآن وسنت اور عمر بھر کے تجربے نیز جن بزرگوں کی خدمت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ان سب کے طرز عمل سے مدرسے (دارالعلوم) کے بارے میں جو

کچھ اصلح سمجھا وہ یہ ہے کہ مدارس اور ان کے متعلقین کو سیاست حاضرہ سے بالکل مجتنب رہنا چاہیے اور صرف سیاسیات ہی نہیں بلکہ ہر اس کام سے جو تعلیمی کام میں خلل انداز ہو۔ اگرچہ وہ کام فی نفسہ کیسا ہی محمود اور مفید کیوں نہ ہو۔ ہمارے بزرگوں نے طلباء کو بیعت کرنے اور سلوک میں مشغول ہونے سے بھی باوجود اس کے اہم سمجھنے کے طالب علمی کے زمانے میں ہمیشہ منع فرمایا ہے۔

حضرت گنگوہیؒ کسی طالب علم کو فراغت سے پہلے بیعت نہ فرماتے تھے۔ پھر کسی سیاسی یا ملکی تحریک میں شرکت کیسے گوارا کی جاسکتی ہے"۔

آخری نصیحت

۲۹ جماد الثانی ۱۳۶۲ھ کو حضرت حکیم الاسلام دوبارہ حاضر خدمت ہوئے۔ تو حضرت حکیم الامت نے ایک آخری نصیحت اس اہتمام کے ساتھ فرمائی کہ اس مجلس میں خواجہ عزیز الحسنؒ، مولانا شبیر علی تھانویؒ، مولانا مفتی جمیل احمد صاحبؒ اور ڈپٹی سجاد علی صاحب کو بھی طلب فرمایا تقریباً سوا گھنٹہ مسلسل تقریر فرماتے رہے۔ اس میں اپنی اس رائے کا اظہار فرمایا کہ مدرسہ دیوبند کو سیاسیات سے بالکل الگ رہنا چاہئے۔ اور یہی ہمارے اکابر کا طریق کار تھا۔ تعلیم کے زمانے میں کسی دوسری طرف توجہ کو سخت مضر فرماتے رہے۔ اور ظاہر ہے کہ معلّمین کے طرز عمل کا طلبہ پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ لہٰذا مدرسہ کے مدرسین کو بالخصوص طلبہ کی مصلحت سے سیاسیات سے علاحدہ رکھنا ضروری ہے۔ اور مدرسین کے دوسری طرف متوجہ ہونے سے تعلیم کا حرج بھی شاہد ہے۔ ایک ایسی جماعت کی بھی سخت ضرورت ہے جو محض علم دین کی خدمت کرے۔

حق تعالیٰ کے ارشاد والذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلوۃ (الآیۃ) سے واضح ہے کہ دیانات مقصود بالذات ہے۔ اور سیاسیات وجہاد واصل نہیں، بلکہ اقامت دین کا وسیلہ ہے، اور دیانت مقصود اصلی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیاست کسی درجے میں بھی مطلوب نہیں، بلکہ اس کا درجہ بتانا مقصود ہے۔ کہ وہ خود مقصود نہیں اور دیانت خود مقصود اصلی ہے۔ اس بناء پر میرا خیال ہے کہ ایک جماعت

ایسی بھی ہونی چاہیے جو خالص عبادت دیانت اور تعلیم دین میں مشغول رہے۔اور وہ جماعت اہل مدارس ہی کی ہوسکتی ہے۔اس لیے یہ میری پختہ رائے یہ ہے کہ طلباء کوسیاسیات میں مبتلا نہ کیا جائے۔طلباء اگر ان قصوں میں پڑ گئے تو وہ تعلیم سے بھی جاتے رہیں گے۔اور تربیت بھی ان کی نہ ہوگی۔چناں چہ جب سے طلباء کو اس سلسلے میں ڈال دیا گیا ان میں آزادی پیدا ہوگئی۔اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ ہی لوگ ہر وقت ان کی طرف سے متفکر اور خائف رہتے ہیں۔(خاتمہ السوانح)

حضرت اقدس تھانوی قدس سرہ کی مبارک رائے یہی تھی۔کہ موجودہ سیاسیات کا اشتغال خواہ فی نفسہ حق ہو یا باطل مگر دارالعلوم کے طلباء وعلماء کی اس مین شرکت بہر حال مدرسے کے مقاصد اصلیہ کو متزلزل کر دینے والی ہے۔جس کا مشاہدہ اور تجربہ بھی عرصے سے اکثر حضرات کو ہو چکا ہے۔لیکن حضرت اقدس تھانوی کی عادت مبارک ہمیشہ سے یہ تھی کہ اختلاف کے موقع پر جو بات حق سمجھیں اس کا اظہار صاف صاف کر دیا اگر قبول کرلیا گیا تو بہتر ورنہ اپنے آپ کو اس سے علیحدہ کرلیا۔اس مجلس میں بھی حضرت اقدس نے اپنا خیال صاف صاف ظاہر فرما دیا۔اور یہ بھی فرمایا کہ مدرسہ دیوبند ایسی چیز نہیں جس کے متعلق میں اپنی مختتم رائے ظاہر کئے بغیر چلاؤں۔

آج کل یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ اور ماہرین تعلیم نیز انتظامی امور کا تجربہ رکھنے والے ذمہ داروں سب کی یہی رائے ہے کہ زمانہ تعلیم میں طلباء کو عملی طور پر سیاسیات سے علاحدہ رہنا چاہیے۔کیوں کہ سیاسیات کے اشغال سے تعلیمی مقاصد کی تحصیل میں نقصان آتا اور علمی استعداد وقابلیت کمزور ہوجاتی ہے۔حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی اس تجربہ شدہ حکیمانہ رائے گرامی کے پیش نظر ارباب مدارس عربیہ کو غور وفکر کرکے مدارس عربیہ کے لیے کسی اصلاحی ضابطے کار کو وضع کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

الحاصل ہم سب کے لیے دارالعلوم دیوبند کی حفاظت اور اس کے اصل مقصد اور مسلک کو اپنانا ضروری اور اولین فرض ہے۔ان اکابر کے نام لینے والوں کے لیے اس کا

تحفظ وقت کا اہم تقاضا ہے۔

حضرت حکیم الاسلام دارالعلوم دیوبند کے محافظ اور اس کے مسلک کے منادو داعی رہے ہیں ان سے محبت رکھنے والوں کا بھی فرض ہے کہ ان کی اس متاع عزیز اور تمام عمر کی پونجی اور سرمائے کو ضائع یا کمزور نہ ہونے دیں۔

حضرت حکیم الاسلام نے تمام عمر علوم اسلامیہ کی اشاعت وتبلیغ اور اس کے پھیلانے میں صرف فرمائی ہے۔ دارالعلوم کی خدمتِ جلیلہ کے علاوہ دوسرے متعدد مدارس دینیہ کے بھی آپ بانی تھے۔ ملک میں متعدد مدارس عربیہ دینیہ آپ کے دم قدم سے قائم ہوئے۔ اور آپ کی برکات وفیوضات سے پھلے پھولے اور قائم ہیں۔

اس کے علاوہ آپ نے دنیوی تعلیم کے مرکز مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی خدمت بھی کی کہ مسلمانوں کے دنیاوی مفاد اس یونیورسٹی سے وابستہ اور متعلق تھے۔ آپ اس یونیورسٹی کی ایگزیکٹیو کونسل کے ممبر تھے اور اپنی مفید تجاویز اور مشوروں سے یونیورسٹی کو فائدہ پہنچاتے رہے۔ نیز مسلمانوں کی خدمت کے طور پر سنی سنٹرل وقف بورڈ کے بھی عرصہ دراز تک آپ ممبر رہے۔ اور مسلمانوں کے مذہبی شعار وقف کی اسلامی حیثیت سے حفاظت کرنے کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

❀❀❀

آہ! حضرت حکیم الاسلامؒ

از: شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ
مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ کھٹک، پاکستان

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ پچھلے دنوں دیوبند میں انتقال فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ وہ ایک پاک باز اور باکردار انسان تھے۔ اپنے جدامجد حضرت مولانا قاسم نانوتوی صاحبؒ کے علوم (جب کہ ان کی ہر کتاب علم ومعرفت کی ایک بحرِ ذخار ہے۔ اور ان کی تصنیفات جو علم الکلام، علم الحدیث پر لکھی گئی ہیں کو سمجھ لینا بھی کوئی آسان بات نہیں ہے۔) کے ترجمان تھے۔

الولد سرلابیہ کا مظہر تھے۔ حضرت قاری صاحبؒ اکابرین دیوبند کے علوم بالخصوص علومِ قاسمیہؒ۔ علوم شیخ الہند اور علوم تھانویؒ کا ایک عظیم خزانہ جامع ماہر اور شارح تھے۔ تحریر وتقریر میں ان کو زبردست ملکہ حاصل تھا۔ اور سب سے نئی چیز یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کو جو خدا تعالیٰ نے علمی لحاظ سے طلباء کے لحاظ سے اساتذہ اور علماء کے لحاظ سے، اقتصادیات اور تعمیرات کے لحاظ سے، غرض اور ہر لحاظ سے جو خوبیاں عطا فرمائی ہیں اور ترقیات سے نوازا ہے۔ یہ سب کچھ حضرت قاری صاحبؒ کے دورِ اہتمام اور ان کے زیر نگرانی انجام کو پہنچا ہے۔

حضرت قاری صاحبؒ کے زمانہ میں حضرت علامہ مولانا انورشاہ کشمیریؒ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس رہ چکے ہیں پھر ان کے بعد شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ۔ حضرت قاری صاحب ہی کے زمانۂ اہتمام میں تدریس کرتے رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند نے اس زمانہ میں جو عروج اور ترقی حاصل کی ہے۔ یہ تاج اور اس کا سہرا حضرت قاری صاحب مرحوم کی مساعیِ جمیلہ کے سر ہے۔ اور

یہ ان ہی کے مخلصانہ شبانہ روز مساعی کا ثمرہ ہے۔ بہر تقدیر حضرت قاری صاحب ایک پاکیزہ شخصیت جامع العلوم اور بہترین کمالات سے متصف تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے خاندان میں اور ان کے نائبین کے خاندان میں حضرت قاری صاحبؒ مرحوم والے تمام اوصاف وکمالات پیدا فرمادیئے اور اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے اس خلا کو پورا فرمادے۔ آمین۔

آج شہر شہر، بستی بستی، قریہ قریہ جو آپ کو یہ دینی علوم کے مدارس ومراکز نظر آتے ہیں، اور ہر گاؤں اور ہر بستی میں جو آپ کو دارالعلوم دیوبند کا فاضل، اکابر اساتذہ کا تلمیذ یا تلمیذ یا تلمیذ التلمیذ آپ کو نظر آتا ہے یہ سب دارالعلوم دیوبند کا فیض اور حضرت قاری صاحبؒ کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ اور یہ سب دارالعلوم کی برکات ہیں۔ ایشیا بھر میں پھیلے ہوئے مدارس ان کے اساتذہ منتظمین کا تعلق بغیر واسطہ یا بالواسطہ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہے۔ حضرت قاری صاحب مرحوم کو دیگر اساتذہ دیوبند کی طرح دارالعلوم حقانیہ سے حد سے زیادہ شفقت اور حد سے زیادہ محبت تھی جب بھی پاکستان تشریف لاتے تو دارالعلوم حقانیہ ضرور تشریف لاتے۔ جب ہم سالانہ جلسہ دستار بندی کرتے تب بھی حضرت تشریف لاتے ایک مرتبہ اس سامنے والی گیلری (دارالحدیث) کے سامنے برآمدے کے اوپر بالاخانہ میں قیام فرمایا، اور غالباً ایسے ہی ایک موقعہ پر جب آپ نے دارالعلوم حقانیہ اور اس کے مختلف شعبوں اور طلباء کی قیام گاہوں کے مختلف احاطوں کا معائنہ کیا تو فرمایا:

> ”مجھے دارالعلوم حقانیہ، دارالعلوم دیوبند سے جدا نظر نہیں آتا۔ بلکہ دارالعلوم حقانیہ نے دارالعلوم دیوبند کو اپنے ضمن میں لے رکھا ہے سارے پاکستان میں دارالعلوم دیوبند کے نمونے اور نقش قدم پر دارالعلوم حقانیہ گامزن ہے۔ اور یہ دیوبند ثانی بن چکا ہے“۔
>
> اور ایک مرتبہ تو یہاں تک فرمایا کہ میں دارالعلوم حقانیہ آکر یوں محسوس کرتا ہوں جیسے دارالعلوم دیوبند آگیا ہوں۔ اور گویا اپنے گھر میں موجود ہوں“۔

یہ تاثرات دارالعلوم کی کتاب الآرا میں بھی قلم بند فرمائے ہیں۔ بہرحال یہاں آکر حد درجہ خوشی اور محبت کا اظہار فرماتے اور جو نئے مسائل پیش آتے اس میں بھی دارالعلوم حقانیہ کی رائے کو شامل فرمالیتے۔

میں عرض کر رہا تھا کہ حضرت کو دارالعلوم حقانیہ اور خاص کر مجھ ناچیز پر حد درجہ شفقت تھی۔ دارالعلوم دیوبند میں میں نے جو زندگی کے لمحات گزارے ہیں خاص کر تدریس کا زمانہ جو تقریبا ساڑھے چار سال ہے اور اس زمانہ میں ہر فن میں تقریبا کوئی ایسی کتاب نہ ہوگی جو میں نے نہ پڑھائی ہو۔ دیگر اساتذہ کی شفقت و محبت کے باوجود چوں کہ اختیارات مہتمم صاحب کے ہوتے ہیں تو حضرت مہتمم صاحبؒ ہر معاملہ میں ترجیحی سلوک میرے ساتھ فرمایا کرتے تھے۔ اسباق اور تدریس کا مسئلہ بھی یوں تھا۔ کہ جب بعض اساتذہ حج کو تشریف لے جاتے یا کسی اور اعذار سے اسباق نہیں پڑھا سکتے تو ان کے اسباق اور کتابیں جو زیادہ تر فقہ، حدیث، فلسفہ، منطق، معانی اور تفسیر کی ہوتی تھیں کی تدریس کی ذمہ داری بھی مجھے سونپ دی جاتی اور فرماتے کہ یہ نوجوان ہے اور کام اچھا چلا سکتا ہے اور یہ محض ان کا حسن ظن تھا۔ تو حضرت مہتمم صاحب مرحوم نے بہ حیثیت مہتمم دارالعلوم دیوبند مجھ ناچیز پر جو شفقت فرمائی ہے اور خاص کر دارالعلوم حقانیہ سے۔

اور ایک موقعہ پر فرمایا کہ: ”دارالعلوم حقانیہ دارالعلوم دیوبند کی بیٹی ہے۔“

حضرت قاری صاحب دارالعلوم حقانیہ کو بہت ترجیح دیتے تھے۔ اور اس کے ذکر پر فخر فرمایا کرتے تھے۔ اور یہ خدا تعالیٰ کا اپنا فضل و کرم ہے کہ تمام اکابر و اساتذہ دارالعلوم دیوبند کو دارالعلوم حقانیہ سے ایک خاص محبت تھی اور سب فرماتے کہ یہ ہمارا اپنا دارالعلوم ہے حضرت قاری صاحبؒ کا سب سے بڑا کارنامہ دارالعلوم کو ترقی و عروج کے بلند معیار پر پہنچا دینا ہے۔ کہ آج تمام دنیا کے لیے دیوبند مشعلِ راہ ہے۔ تکثیر علماء، تکثیر طلباء، تدوین کتب اور تعمیرات ہر لحاظ سے دارالعلوم دیوبند ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ جس کی خدمات مسلّم اور شہرہ کالشمس فی نصف النہار ہے۔ آج ہم ان کے سایہ شفقت سے محروم

ہو گئے ہیں۔ یہ تمام اہل علم کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔

میں کیا عرض کروں حضرت قاری صاحب کی وفات سے ہمارے قلوب کو بہت صدمہ پہنچا۔ ہم ایک بڑے مشفق، ایک مہربان، ایک بڑے تجربہ کار، بڑے عالم، اور خاص کر دارالعلوم دیوبند اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے علوم کے حامل سے محروم ہو گئے۔ قیامت کی علامات سے من جملہ ایک علامت یہ بھی ہے کہ ''یرفع العلم'' جیسا کہ امام بخاریؒ نے اس جانب اشارہ فرمایا ہے کہ جب علم ناپید ہو جائے اور لوگ علوم دینیہ سے محروم ہو جائیں تو دین ختم ہو جائیگا۔ دین ہم کو علم ہی بتاتا ہے ہم جو یہاں مدارس میں جمع ہوتے ہیں۔ ہمارا مقصد علم حاصل کرنا ہے کہ نماز، روزہ، زکوۃ اور اللہ تعالیٰ کے دین کے احکام و مسائل سیکھ لیں۔ جب مسائل معلوم ہو جائیں تو اولاً ان پر خود عمل کریں پھر ان کی حفاظت و اشاعت کی کوشش کریں اسی تبلیغ و اشاعت کے نتیجہ میں ان شاء اللہ عالم آباد رہے گا اور اگر یہ کام چھوڑ دیا جائے تو عالم برباد ہو جائیگا۔ ہمارے اکابر اور اساتذہ اور علماء عمر طبعی کو پہنچ کر وفات پا گئے کل من علیہا فان۔ مگر الحمد اللہ کہ دین کے پودے لگاتے رہے اگر یہ سلسلہ جاری نہ رہتا تو دین کا باغ برباد ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ حضرت قاری صاحب اور جمیع اکابر اساتذہ دارالعلوم دیوبند کے درجات بلند فرمادے۔ آمین۔

❁❁❁

خاموش ہوگیا ہے چمن بولتا ہوا

(از: حضرت مولانا فاضل حبیب اللہ رشیدیؒ صاحب

ماہنامہ الرشید ساہیوال پاکستان

لو کان لانسان یدوم بقاؤهٗ
لما مات خیر المرسلین محمداً
وماکان موت طیّب مو ت واحد
ولکنه بنیان قوم تهدّ ما

بانی دارالعلوم دیو بند مولانا قاسم نانوتویؒ کے نبیرہ، حضرت شیخ الہندؒ اسیر مالٹا کے مرید اول، علامہ سید انور شاہ محدث کشمیریؒ کے تلمیذ رشید مجدد ملت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ کے خلیفۂ اطیب شیخ الاسلام پاکستان علامہ شبیر احمد عثمانی کے معتمد علیہ، اور عالم اسلام کی سب سے بڑی عربی واسلامی یونیورسٹی کے مدیر شہیر، ہزاروں علماء کے استاد، لاکھوں مسلمانوں کے مبتداء اور راہ نما، دارالعلوم دیو بند میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

حضرت قاری صاحب نور اللہ مرقدہ نے عمر طبعی تو نوّے سال کے قریب پائی، لیکن دارالعلوم کی خدمات کے لیے تقریباً ساٹھ سالہ حیاتِ علمی وعملی کی سعادت نصیب ہوئی۔ دارالعلوم کے فضلاء اگر سوا سو سال میں تقریباً بیس ہزار کے قریب ہوگئے تو نصف علما اکثر اکابر علماء کے فیض یافتہ اور تقریباً نصف علما، یعنی دس ہزار فضلاء حضرت قاری صاحب کے رہین منت ہیں:

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا وذٰلك فضل الله یؤتیه من یشاء

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حضرت قاری صاحب چند ایام قبل گو جسمانی طور پر ایک دارالعلوم سے دوسرے دارالعلوم میں منتقل ہو گئے تھے۔ جیسا کہ حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری صاب کے اختلاف سے ایک جدید دارالعلوم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل قائم ہو گیا تھا۔

ایسے جسمانی انتقال تو ثابت ہیں اور اس سے مفر نہیں اور انتظامیہ کی دنیا میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ ان کوائف کے باوجود حضرت قاری صاحب کا دارالعلوم سے روحانی وقلبی تعلق باقی تھا جیسا کہ ان کی وصیت سے معلوم ہوتا ہے۔ اسی واسطہ نماز جنازہ دارالعلوم دیوبند میں ادا ہوئی۔ اور دارالعلوم کے اکابر و مشائخ دیوبند کے قبرستان میں جگہ پائی۔ ؎

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا ۞ فرحمه الله رحمة واسعة

حضرت قاری صاحب کے وصال و انتقال پُر ملال کے بعد تمام تر اختلافات ختم ہو کر رہ گئے۔ اللهم اغفر واعف عنه وارحم عليه.

حضرت بانی دارالعلوم کے علوم و کلام تصانیف و بیانات کو علامہ شبیر احمد عثمانی خوب سمجھتے اور حضرت قاری صاحب خوب بیان فرماتے تھے اس لحاظ سے آپ واقعی قاسم العلوم والخیرات ہیں۔ اور یہ خصوصیاتِ دارالعلوم صرف دو تین شخصیات کی رہین منت ہیں۔ کہ ایک قصبے کا مدرسہ عربی اسلامی، دارالعلوم، مرکز علوم، عالم اسلام کی سب سے جلیل القدر عربی و دینی یونیورسٹی بن گیا جس کی مثال عالم اسلام میں ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتی۔ ان میں اول ذاتِ محمود شیخ الہند اسیر مالٹا کی تھی۔ دوسری عظیم البرکت ومجاہد شخصیت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی مسلمہ ذات ہے۔ جنھوں نے اٹھارہ سال مدینہ پاک کے قیام میں چودہ سال احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درس روضۂ اطہر کے سامنے دیا جن کے دورِ صدارت و نظامت تعلیمات میں دارالعلوم پروان چڑھا۔ تیسری ذات ستودہ صفات جامع کمالات والمحاسن حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم و مغفور کی تھی۔ جن کے دورِ اہتمام و ادارت و نظامت میں

دارالعلوم بین الاقوامی شہرت اختیار کرتے ہوئے بین الاقوامی یونیورسٹی بن گیا اور دنیا کے لیے قابل رشک جامعہ ثابت ہوا۔ دارالعلوم دیوبند خود ایک ایسا ادارہ ہے جہاں سے ایسے افراد پیدا ہوئے جو اپنی ذات میں خود انجمن تھے جن میں حضرت قاری صاحب کا ایک طیّب واطیب وجود مسعود ہے۔ جو خود ایک ادارہ تھے انجمن تھے۔

کشجرة طیبة اصلها ثابت وفرعها فی السماء. حضرت قاری صاحب کے دورِ اہتمام میں چودہ طبقات علمی دارالعلوم دیوبند میں پیدا کئے گئے۔

۱۔ مفسرین قرآن حکیم ومترجمین قرآن کریم۔ ۲۔ محدثین عظام ۔۳۔ مفتی وفقہاء کرام۔ ۴۔ متکلمین اسلام۔ ۵۔ معلمین اساتذہ علوم وفنون۔ ۶۔ مصنّفین ومورخین۔ ۷۔ مبلّغین دین۔ ۸۔ مناظرین اسلام۔ ۹۔ مجاہدین وقائدین ملت۔ ۱۰۔ ائمہ سلوک حضرات مشائخ عظام واولیاء کرام۔ ۱۱۔ قرا وحفاظ کرام۔ ۱۲۔ ناظمین وممتحنین ومدیران۔ ۱۳۔ صحافی واہل قلم۔ ۱۴۔ ادباء وشعراء اطباء وحکماء۔ ان طبقات کے علوم وفنون سے حضرت قاری صاحب نے اپنے ظرف عالی کے مطابق بہت کچھ حاصل کیا اور اس لحاظ سے جامع شخصیت صرف قاری صاحب کی تھی۔

ولیس علی اللہ بمستنکر ۞ ان یجمع العالم فی واحد

جامعہ رشیدیہ اور راقم کو حضرت قاری صاحبؒ سے ایک خصوصی قلبی وعملی تعلق تھا۔ اور حضرت قاری صاحب جب بھی پاکستان تشریف لاتے تو جامعہ رشیدیہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازتے۔ ایک سفرِ حج میں حضرت قاری صاحب کے ساتھ حج کی سعادت بھی نصیب ہوئی جامعہ رشیدیہ کلاں ۲ے کے دارالحدیث کا سنگِ بنیاد بھی حضرتؒ کے دست مبارک سے رکھا گیا تھا اور دارالتفسیر کا افتتاح بھی آپ ہی نے فرمایا تھا۔ صد سالہ اجلاس کی تقریب سعید پر حضرت قاری صاحب کے مکتوبات طیبات راقم خادم کے نام کثرت سے موصول ہوئے جو دفتر رشیدیہ میں باقیات صالحات کی صورت میں موجود ہیں۔ آہ باتیں ان کی یاد رہیں گی۔

جامعہ رشیدیہ میں آپ کی وفات حسرت آیات کی خبر وحشت اثر کے بعد قرأت قرآن، ایصال ثواب اور ادعیۂ مغفرت شروع کر دی گئی۔

۲۲ر جولائی جمعۃ المبارک کو ساہیوال ضلع میں یوم طیّب منایا گیا۔ جس میں حضرت کی خدمات، کمالات اور اوصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اور اسلامیان ساہیوال نے تعزیتی جلسہ کر کے قراردادِ تعزیت پاس کی۔

"جامعہ رشیدیہ، جملہ قاسمی خاندان اور علماء وفضلاء دارالعلوم دیوبند سے تعزیت کرتا ہے اور دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرتؒ کو درجات عالیہ نصیب فرمائے۔ آمین۔

موتُ العَالِم موتُ العَالَمْ

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب کا سانحہ ارتحال

حضرت مولانا محمد اشرف خاں صاحب پاکستان
ماہنامہ البیان پشاور، پاکستان

دریں اثنا آشوب غم عذرم بندگر نالہ زن گریم
جہانے را جگر خوں شد ہمیں تنہا نہ من گریم

آہ! آج قلم کو اس مسیحا نفس کا ماتم کرنا پڑ رہا ہے۔ جو تقریباً پون صدی تک ہزاروں نفوس کی مسیحائی کرتا رہا ہے۔ جس نے لاتعداد قلوب کی چارہ گری فرمائی اور اپنی شعلہ بیانی سے بے شمار دلوں میں ایمان کی حرارت پیدا کی۔ جس نے مدتوں علوم و حکمت کے چراغ روشن رکھے اور رشد و ہدایت عمل و تزکیہ کی قندیلوں کو فروغ بخشا جس نے نہ صرف پاک و ہند کے تحتی براعظم کو اپنی دینی تگ و دو اور دعوت و ارشاد کا میدان بنایا بلکہ ان کے دینی اسفار اور خدمات کا دائرہ ایشیا و افریقہ کے مختلف ممالک سے گزر کر انگلستان اور امریکہ تک پھیل گیا۔ دریغا! کہ ملت کے سب سے بڑے بین الاقوامی، ملی، دینی و تعلیمی اور روحانی ادارہ کے سابق مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیّب صاحب قدس سرہ ۶ ؍شوال ۱۴۰۳ھ کو پوری ملت کو سوگوار چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

حضرت قاری صاحب نور اللہ مرقدہ نصف صدی سے زیادہ دار العلوم دیوبند کے مہتمم رہے۔ انھوں نے اپنی ذات کو دار العلوم میں اس طرح گم کردیا تھا کہ دار العلوم اور ان کا جداگانہ تصور دشوار تھا۔ ان کی اس عالمگیر ملی ادارہ میں ''فنائیت'' کا حق یہ ہے کہ اس کے اس عظیم خادم کے حق میں پوری ملت اشکبار رہو اور ان کی خدمات کا اعتراف کرتے

ہوئے ان کے ایصال ثواب کا اہتمام اوران کارناموں کو اجاگر کرنے کی سعی کرے۔

حضرت قاری صاحبؒ نے دارالعلوم سے کیا پایا اور اسے کیا دیا۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ مختصر یوں کہئے کہ دارالعلوم دیوبند کے فیض نے حضرت قاری صاحب کے جواہر باطنی کو تابانی بخشی اور ان کی خداداد استعدادوں کو نکھارا۔ اور انہیں وہ بنایا جس سے پورے عالم اسلام میں ان کے کمالات کا اظہار ہوا۔

حضرت قاری صاحب نے دارالعلوم دیوبند کی بقاءِ زندگی شہرت و نیک نامی، ترقی و وسعت کے لیے اپنی پوری حیات طیبہ صرف فرمادی دنیا نے انھیں دارالعلوم کے مہتمم کے نام و کام سے پہچانا۔ اور انھوں نے دنیا میں اس عظیم دارالعلوم کو اس طرح روشناس فرمایا کہ وہ ایک معروف عظیم عالمی ادارہ کی حیثیت سے ابھرا۔ اور اس کی ضرورت و اہمیت افادیت اور کارنامے ہر کہہ مہہ پر روشن ہو گئے۔ اور اس کا حلقہ تعارف و اثر خواص سے نکل کر عوام تک وسیع ہو گیا۔ اور اس کی حیثیت ایک بڑے علمی و تعلیمی جامعہ، دینی و تربیت گاہ، اسلامی تہذیب و ثقافت کے مرکز اور مستقل مدرسہ فکر کی حیثیت سے نمایاں ہوگئی جسے یگانوں اور بیگانوں کو طوعاً و کرہاً تسلیم کرنا پڑا۔ ذلك فضل الله يوتيه من يشاء.

حضرت قاری صاحب کی دارالعلوم کے لیے خدمات اس قدر گوناگوں اور بے شمار ہیں کہ نہ اس کا احاطہ کرنا آسان ہے نہ اسے کوئی بھلا سکتا ہے دارالعلوم جب تک قائم ہے ان شاءاللہ۔ ان کا نام اس کے عظیم معماروں میں لیا جاتا رہے گا، انھیں دارالعلوم کے اہتمام کا طویل ترین زمانہ میسر آیا۔ اور اس دورِ اہتمام میں مالیات، تغیرات، طلبہ کی تعداد، کتب خانہ کی افزائش اور دیگر ہر شعبہ میں خوب ترقی ہوئی اور ان کا دور ہر پچھلے دور پر سبقت لے گیا۔

انسان، انسان ہے اسے اس دنیا میں جو کچھ دیا گیا ہے امتحان و آزمائش کے لیے دیا گیا ہے۔ لیبلوکم ایکم احسن عملا. تاکہ آزمائے تم کو کہ کون سا تم میں سے بہتر ہے عمل میں۔

اس آتشیں حقیقت کا قرآنی اعلان ہے، اس لیے ابتلاء کی اس گھاٹی میں بعض اوقات اس کی خوبیاں بھی کمزوری کا سبب بنادی جاتی ہے۔ لطف و ملاطفت، نرمی و لطافت

اتنی بڑی خوبی ہے کہ متمم اخلاق، صاحب خلق عظیم نبی انور ﷺ کے اخلاق وکمالات میں (نرمی) کا تذکرہ احسان وستائش کے پیرایہ میں کیا گیا ہے۔ اور اسے خاص رحمتِ ربانی کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: فبما رحمة من الله لنت لهم. ترجمہ: تو اللہ کی رحمت کے سبب تم ان کے لیے نرم دل ہوئے۔

یہ بیّن حقیقت ہے کہ جس پر اللہ تعالیٰ کا فضل ورحمت ہوتی ہے۔ اسے ہی اس نرمی والی دولت سے نواز کر اس کے اخلاق کو اس نعمت سے مزیّن کیا جاتا ہے۔ چناں چہ حدیث پاک میں ہے کہ:۔

"نرمی جس چیز میں ہو اسے زینت دیتی ہے اور جس چیز سے الگ کرلی جائے اس کو بدنما کردیتی ہے"۔

تاہم ہر دولت کے دشمن ورہزن ہوتے ہیں جو دوسروں کی نرم مزاجی سے غلط فائدہ اٹھالیتے ہیں۔ اور نرم خو اور بے ضرر افراد کو اپنے مفاد کے لیے ایسا نقصان پہنچا دیتے ہیں کہ جس کا کوئی مداوا نہیں ہوسکتا۔ انہیں اپنی حرص وآز کا شکار و آلہ کار بنا کر اپنے مقاصد پورا کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بے نیازی کہیے یا ہم جیسوں کے لیے سامانِ عبرت یا دنیا کی بے وفائی۔

حضرت قاری صاحب نور اللہ مرقدہ کے زیر اہتمام مارچ ۱۹۸۰ء میں دیوبند کا عظیم الشان جشن صد سالہ منعقد ہوا جس میں مسلم ممالک کے وزراء سفراء اور نمائندہ وفود کے علاوہ علماء وصلحاء اس کثرت سے آئے جس کی نظیر کم ملے گی۔ عامۃ الناس کا اتنا مجمع تھا جو عرفات کے بعد شاید کہیں اکٹھا ہوا ہو۔

مخدوم گرامی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب اور بعض دیگر عرب مقررین نے اسے بجا طور پر "حشر" کے نام سے پکارا۔ یہ جشن حضرت قاری صاحبؒ کے دور اہتمام کا نکتہ معراج تھا۔ اور ایک بڑی آزمائش کی ابتدا بھی۔ عین وقت جب

حضرت قاری صاحب کا رہوارِ زندگی، حسن کردار عزیمت، نیکی وفتوت، ارشاد وخدمت اورکمال وعظمت کی ۸۵ منزلیں طے کرکے اپنی آخری منزل پر پہنچنے ہی والے تھے کہ مشیت الہیہ اور حکمت تکوینیہ نے آزمائش کی ایسی صورت پیدا کردی جس پر بڑے بڑے اہل عزیمت اور عالی حوصلہ بزرگ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں ؎

ابتلایم می کنی آہ الغیاث
اے ذکور از ابتلایت چو اناث
(رومی)

جشن صد سالہ کی رونقیں اور خوشیاں ابھی ماند نہیں پڑی تھیں کہ پردۂ غیب سے ''ما می کشیم دوست'' کی صدا نے ہم سب کے لیے عبرت پذیری کا سامان پیدا کردیا۔ دارالعلوم میں یکا یک بھونچال آیا کہ حضرت قاری صاحب کے اہتمام کی عظیم وقدیم عمارت کھڑی نہ رہ سکی۔

زندگی کے آخری ایام میں انھیں دیوبند کے ''قضیہ نامرضیہ'' کے ان مراحل سے گزرنا پڑا جو ان کے شایان شان نہ تھے۔ اور آخرش اہتمام سے جدائی کا وہ زخم سہنا پڑا جو ایک حساس اور بامروت، شریف وضعیف انسان کے لیے زندگی کا سب سے بڑا صدمہ تھا۔ انھوں نے اپنے دادا کا لگایا ہوا باغ اپنے پسینہ سے سینچا تھا اور اپنی جملہ صلاحیتوں کو اس کی بقاء کے لیے تج دیا تھا۔ اس ناپائیدار اور بے وفا دنیا میں عبرت کا عجب سبق تھا کہ عین بہار میں اپنے ہمدردوں کی غلط کوشیوں سے ''باغ کا باوفا اور جاں سپار'' مالی جدا کردیا گیا۔ تلك الايام نداولها بين الناس ۔ ہم ان ایام کو ان لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار پس عبرت پکڑو اے آنکھوں والو!

کاش یہ حادثہ ان کی زندگی میں پیش نہ آتا اور حضرت قاری صاحبؒ کو اس سانحہ جانکاہ سے نہ گذرنا پڑتا لیکن:

ہوائیں اس سمت سے چلتی ہیں جسے بادبانی کشتیاں نہیں چاہتیں، اور جو اللہ تعالیٰ

نے چاہا پورا ہوگا۔اور جو نہ چاہا نہ ہوگا، اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ، قدرت قاہرہ اور مشیت نافذہ کے سامنے سب ہی بے دست وپا ہیں، جسے چاہیں جس وقت چاہیں جو چاہیں کردکھائیں۔ان کی شانِ بے نیازی سے ہر آن ترساں ولرزاں رہا جائے کہ ع

ہیچ کس رانیست زہرہ چون وچرا

نعوذباللہ من الحور بعد الکور

ترجمہ: ہم اللہ سے زیادت اور صلاح امور کے بعد نقصان وفساد سے پناہ چاہتے ہیں۔

بندہ کی حضرت قاری صاحب نوراللہ مرقدہ سے پہلی ملاقات پشاور میں قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد ہوئی۔اور آخری ملاقات حرم کعبہ میں حضرت مولانا سعید خاں احمد صاحب مہاجر مدنی امیر تبلیغی جماعت حجاز مقدس کے دسترخوان پر ہوئی۔جہاں حضرت قاری صاحب نوراللہ مرقدہ کے پہلو میں بیٹھ کر کھانے کی سعادت میسر آئی۔

یوں تو بحمداللہ تعالیٰ بارہا زیارت وملاقات کا شرف میسر ہوتا رہا لیکن اوائل جنوری ۱۹۵۶ء کی وہ ملاقات نہیں بھولتی جب بندہ ایک تبلیغی سفر میں بستی نظام الدین دہلی اور اجتماع بھوپال سے ہوتا ہوا پہلی بار بزرگوں کی زیارت کے لیے دیوبند پہنچا۔حضرت قاری صاحب کمال شفقت سے مہمان خانہ تشریف لائے۔کھانے کا خصوصی انتظام کیا۔اور اپنے ساتھ طعام کی سعادت سے نوازا۔اور تقریباً ایک گھنٹے تک اپنے ملفوظات اور پر لطف افادات سے نوازتے رہے۔

اسی دن اللہ تعالیٰ نے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ کی ضیافت، چائے اوران کی مہمانداری شفقت سے بہرہ مند فرمایا۔فللہ الحمدو الشکر۔

فقیر نے دیوبند کی آخری حاضری مارچ ۱۹۸۰ء میں صد سالہ جشن کی تقریب پر ہوئی۔اور حضرت قاری صاحبؒ کے بڑھاپے میں جواں ہمتی کے مناظر وہیں دیکھے ؎

حیف درچشم زدن صحبتِ یار آخر شد ❁ روئے گل سیر ندیدیم بہار آخر شد

حضرت قاری صاحب ایک دینی وعلمی شخصیت تھے۔ سیاست ان کا میدان نہ تھا۔ تقسیم ہند کے وقت دارالعلوم دیوبند جیسے عالمگیر وہمہ گیر ادارہ میں ذہنی طور پر مختلف سیاسی اذہان کی شخصیتیں موجود تھیں جن میں مسلمانان ہند کی بھلائی اور اجتماعی بہبود کے لیے للہ فاللہ اخلاص کے ساتھ اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ یہ ان کا اجتہاد تھا جس میں ان کا ذاتی مفاد نہ تھا۔

حضرت قاری صاحب ہماری محفل دوشیں کی چند مثالی شخصیتوں میں تھے وہ ہمارے پرانے دبستان علم کی فیروزمندیوں کا نشان ہمارے قدیم نظام تعلیم کی کامیابی اور ثمر آوری کا جیتا جاگتا ثبوت تھے۔ دارالعلوم دیوبند سے جو نابغۂ روزگار ہستیاں پیدا ہوئیں، حضرت قاری صاحبؒ انہیں کے فرد فرید تھے۔ ان کے کارنامے تقریباً ستر سال کی طویل مدت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ وہ ہمارے اسلاف اور اپنے اجداد کرام کی ایک روشن یادگار اور دیوبند کا فخر اور مسلمانوں کا وقار تھے۔ تقدیر الٰہی نے ان کو ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا اور یہی اس عالم کا دستور ہے۔ وہ گئے لیکن اپنے علم وفضل، اخلاص وبے نفسی، خدمت وعزیمت کا ایک اعلیٰ نمونہ چھوڑ گئے۔

قطب الارشاد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ذکریا کاندھلوی نوراللہ مرقدہ کے بعد ملت کا یہ سب سے بڑا سانحہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حادثہ میں امت کا حامی مددگار، حافظ وناصر ہو اور ملت کو ان کی برکات سے محروم نہ فرمائے اور انہیں ان کے شایان شان بلکہ اپنی رحمت خاصہ کے مطابق اپنے مقربین خاص میں اپنے اسلاف کرام کے ساتھ اعلیٰ علیین اور جنت الفردوس میں انتہائی اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

ادارہ اس حادثہ کبریٰ میں دارالعلوم کے تمام وابستگان حضرت مرحوم کے جملہ اعزہ واحباب اور پوری ملت سے تعزیت کرتا ہے۔

❀❀❀

آفتابِ علم وعمل غروب ہوگیا

حضرت مولانا سید عبدالقادر صاحب آزاد، پاکستان

روزنامہ نوائے وقت پاکستان

ابھی تو مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ حضرت علامہ محمد یوسف بنوریؒ حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ اور حضرت مفتی محمود صاحبؒ کی جدائی کے زخم تازہ تھے۔ آنکھیں اشکبار، دل بے قرار اور روح مضطرب ومنفعل تھی کہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے عظیم روحانی ونسبی جانشین۔ برصغیر پاک وہند کے ممتاز عالم دین اور مرکزِ علوم دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ صدیقی بھی رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہِ راجعون۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کا غم بھی ایسا نہیں ہے جو چند دنوں میں خانۂ دل سے محو ہوجائے، بلکہ آج پورا عالم اسلام سوگوار ہے۔ پاکستان وہندوستان ہی نہیں پورے عالم اسلام میں حضرت کا وجودِ مسعود علماء دیوبند کے علم وفضل تدین وتقویٰ، اخلاص وللہیت، حب الٰہی اور عشق رسول ﷺ کی آخری علامت اور یادگار تھا۔ اس مصیبتِ عظمیٰ اور حادثۂ جانکاہ پر ہر حساس مسلمان جگر فگار اور غم سے نڈھال ہے کہ اچانک آفتاب علم وعمل غروب ہوگیا۔ آج پوری علمی دنیا میں تاریکی ہی تاریکی ہے اور اس روح فرسا خبر نے علمائے امت کی بالکل ہی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ اَللّٰھم الیك المشتکی وبك المستغاث.

حضرت حکیم الاسلامؒ اس علمی خانوادے کے چشم وچراغ تھے جنھوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی اور اس خطے میں قال اللہ وقال الرسول کی تبلیغ واشاعت میں بھرپور حصہ لیا۔ حضرت کے اساتذہ میں محدث اعظم امام العصر حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے اسماء گرامی سرفہرست ہیں جنھوں نے علم حدیث

وتفسیر کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔

حضرت نے ۱۳۴۷ھ میں اپنے انہی مایۂ ناز اساتذہ سے سندِ فضیلت حاصل کی اور پھر دارالعلوم دیوبند ہی میں درس وتدریس میں مشغول ہو گئے اور تادمِ واپسیں اسی درسگاہِ عظیم سے تعلق رکھا اور اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں مصروف رہے۔

۱۳۵۰ھ میں وقت کے سب سے بڑے مجدد اعظم حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے حضرت کو اپنا خلیفہ مقرر فرمایا اور اس طرح سے حضرت رشد وہدایت کے عظیم منصب ومسند پر فائز ہوئے اور پھر اپنی علمیت وروحانیت سے لاکھوں افراد کی اصلاح کا ذریعہ بنے۔

ان علماءِ کرام نے مسلم لیگ کی تائید وحمایت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور تحریک پاکستان کے پُر جوش حامی رہے۔اور کانگریس کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ پاکستان کا وجود انہی حضرات کا مرہون منت ہے۔اگر یہ حضرات پاکستان کے قیام کے لیے جدوجہد نہ کرتے تو پاکستان کا قیام بہت مشکل تھا۔

بہر حال حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو علم وعمل میں امتیازی حیثیت رکھنے کے ساتھ ساتھ خطابت کے فن میں بھی کمال حاصل تھا۔اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بعد جن لوگوں نے شریعت کے اسرار ورموز اور بلند فکر معانی کی تشریح وتعبیر میں نام پیدا کیا ان میں حضرت حکیم الاسلامؒ کو بھی خاص مقام حاصل تھا۔حضرت کوئی ساٹھ برس تک دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اور چانسلر رہے۔اور اس دوران میں بیش بہا علمی تصانیف وتالیف کا ذخیرہ مہیا کیا۔

اللہ تعالیٰ ان کے علمی کارناموں کو شرفِ قبولیت بخشے اور ان کو جنت الفردوس میں مقامِ عالیہ نصیب فرمائے۔آمین!

دارالعلوم دیوبند

کا آخری چراغ گل ہوگیا

حضرت مولانا سمیع الحق صاحب / ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک پشاور، پاکستان

داغ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی ❁ اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

دارالعلوم دیوبند کی محفل دوشیں کا وہ چراغ سحر جو پچھلے دو سال سے حوادث وانقلاباتِ زمانہ کے جھونکوں سے بجھ بجھ کر بھی ٹمٹمار ہا تھا بالآخر شوال ۱۴۰۳ھ کے پہلے ہفتے میں ہمیشہ کے لیے خموش ہوگیا یعنی حکیم الاسلام مظہر انوارِ قاسمیہ، مسند نشین جامعہ دیوبند، ترجمانِ حقائق اسلامیہ حضرت مولانا حافظ قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور دیوبندی مکتبِ فکر کے اس میر مجلس کے بساط لپیٹ دینے سے محفلیں اجڑ گئی ہیں۔ اور ہر سو وحشت اور ویرانگی کا سا عالم ہے اب اس دور کا بالکل خاتمہ ہوگیا ہے جو شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی علامۃ العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور مجاہد اسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا یادگار تھا۔ ان کی ذات ان اکابر کی نہ صرف بقیۃ السلف نشانی تھی بلکہ ان کی ذات میں ان تمام اکابر واساطین دیوبند کی نسبتیں، جمع تھیں۔ اور وہ زندگی بھر اپنی ذاتی حسبی اور نسبی گونا گوں خصائل وکمالات کی وجہ سے ان تمام اکابر کے محبوب بن چکے تھے۔

ایک مرحلہ ایسا آیا کہ شاید آپ دارالعلوم دیوبند چھوڑ کر پاکستان سکونت اختیار کر لیتے۔ ادھر اکابر دیوبند باصرار آپ کو دوبارہ کھینچ لائے تو استقبالیہ تقریب میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ نے دیدۂ پُرنم اور گلوگیر آواز میں ان کو مخاطب کر کے فرمایا۔

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو ❁ تو کجا بہر تماشا می روی

بلاشبہ ان کی ذاتِ محبوبیت میں تماشا گاہِ عالم تھی۔ وہ اس گلشن علم و معرفت کے مالی اور شجرۂ طوبیٰ کے امین تھے۔ جس کے لیے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ۔ حاجی امداللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ اور شہدائے بالاکوٹ نے زمین ہموار کی۔ جس کی داغ بیل حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور فقیہ الاسلام مولانا رشید احمد گنگوہی نے ڈالی اور جس کی آبیاری میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ علامۃ العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور مجاہد اعظم مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسے عمائدین امت نے اپنی زندگی تج دی۔

یہ امانت جب آپ کے ہاتھوں آئی تو پون صدی کے طویل اور صبر آزما شبانہ روز جد و جہد، خداداد اہلیت و صلاحیت اخلاص و دیانت اور والہانہ جہد و عمل کے ساتھ آپ نے اس مدرسہ علم کو ایک ایسے جامعہ میں تبدیل کر دیا جس کے انوار و تجلیات سے ایک عالم جگمگا اٹھا۔ اور وہ اس امانت سے الگ ہو کر جب دنیا سے رخصت ہوئے تو دیوبند کا وہ سرچشمہ علوم نبوت کا ایک بحرِ ذخار بن کر علم و دانش کی پوری دنیا سے اپنی برتری اور فضیلت کا لوہا منوا چکا تھا۔

آپ حضرت بانی دار العلوم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پوتے اور مولانا محمد احمد مہتمم خامس کے صاحب زادے تھے۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے خصوصی تلمیذ حضرت شیخ الہند سے بیعت اور حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے خلیفہ مجاز تھے۔ پورے طبقہ کے محبوب و منظورِ نظر اور مرکز علمی کی سیادت کے لحاظ سے پوری جماعت کے سید الطائفہ تھے۔ علمی فیض کے علاوہ بیعت وارشاد کے میدان میں بھی لاکھوں مسترشدین کے روحانی رہبر و رہنما تھے۔

۱۳۳۷ھ میں درس نظامی سے فراغت پائی اور دار العلوم دیوبند میں درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ ۱۳۴۳ھ سے ۱۳۴۸ھ تک دار العلوم دیوبند کے نائب مہتمم رہے ۱۳۴۸ھ سے لے کر آخر وقت اس مرکز علم و ہدایت کی سیادت آپ کو حاصل رہی۔

نیرنگی زمانہ یا چرخ نیلگوں کی ستم ظریفی کہیے کہ زندگی بھر علم وحکمت کے جس ''تاج محل'' (دارالعلوم دیوبند) کی آرائش وتزئین میں مصروف رہے۔ جب وہ بنائے عظیم جشن صدسالہ کی شکل میں عظمت وترقی کے اوج کمال کو چھونے لگی تو اس عمارت کا یہ ''شاہجہاں'' جدائی اور ہجوری کے داغ لیے ہوئے دنیائے رنگ وبو سے الگ ہوگیا جو کچھ پیش آیا گو اس کے محرکات ان کے عہد اہتمام کی طرح دیرینہ اور قدیم تھے اور مشیت ایزدی کے سامنے کس کی چلتی ہے۔ مگر پھر بھی بے اختیار جی میں آتا ہے کہ کاش یہ صورت حال دو ایک سال مزید پیش نہ آتی۔ اور دارالعلوم دیوبند کا یہ جرنیل ان ہی عظمتوں اور رفعتوں کے ساتھ اور ان ہی قدرشناسیوں کے ساتھ ہم سے رخصت ہوا ہوتا۔ جو زندگی بھر ہم سب نے انہی کے لیے مخصوص کر رکھی تھیں۔ اور جس کے وہ سزاوار تھے کہ سالارِ کارواں کی شوکت وسطوت پوری جماعت اور قافلہ کی شان بڑھاتی ہے۔ **ولکن ماشاء اللہ کان ومالم یشاو لم یکن۔**

حکیم الاسلام نسبی اور روحانی رشتوں کے ساتھ ساتھ علم وحکمت کے لحاظ سے اپنی ذات سے بھی ایک انجمن تھے۔ ان کے علوم وتصانیف اور خطبات، حکمت ولی اللہی اور معرفت نانوتویؒ کے ابلتے ہوئے سرچشمے ہوتے تھے۔ اسرار دین کی تشریح اور شریعت کی ترجمانی میں ان کا شمار گنے چنے حکماء اسلام میں ہوسکتا ہے۔ ان کی ہر تقریر حقائق ومعارف کا ایک سمندر اور ہر تحریر اسرار ونکات کی ایک دنیا اپنے اندر لئے ہوئے تھی۔ ان کے خطبات سے نہ صرف برصغیر کا گوشہ گوشہ بلکہ عالم اسلام کے علاوہ افریقہ اور یورپ کی دور دراز بستیاں بھی مستفید ہوئیں۔ دین اور مادر علمی دیوبند کی آواز پہنچانے میں زندگی کا اکثر حصہ طویل اسفار کی نذر رہا۔

اسلام کے اہم اور عصر حاضر کے جدید مسائل پر ایک سو سے زائد تصانیف چھوڑیں۔ حدیث وتفسیر اور فن حقائق واسرار کی کتابیں اکثر زیر درس بھی رہتیں۔ دعوت وبیان کا انداز حکیمانہ تصنیف وتالیف کی شان فلسفیانہ ہونے کے باوجود شعر وسخن میں بھی اعلیٰ ذوق

اور ثقہ انداز رکھتے تھے۔ان کی مثنویاں قصائد اور فصیح و بلیغ نظمیں۔اعلیٰ ترین ذوق سخن کی غمازی کرتی ہیں۔

الغرض وہ اپنے جامع الصفات اکابر واسلاف کے کمالات ومحاسن،نجابت وسعادت،شرافت ووجاہت،فضل وکمال،اخلاق وشرافت،وقار وتمکنت،فکر واصابت، تواضع ومتانت کا ایک پیکر جمیل اور دیوبند کی اعلیٰ روایات کا ایک مرقع اور ظاہری لطافت ونظافت اور حسن وپاکیزگی کا ایک مجسمہ تھے۔ان کا ماتم ان سب صفات کا ماتم ہے۔ پوری قوم اور پوری ملت کا ماتم ہے۔دنیائے علم وفضل کا ماتم ہے۔درسگاہوں جامعات اور خانقاہوں کا ماتم ہے اور دارالعلوم حقانیہ کے لیے بھی اس لحاظ سے ایک عظیم ماتم ہے کہ دارالعلوم اور اس کے بانی مدظلہ کے ساتھ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے علائق وروابط اور خصوصی عنایات وتوجہات کی داستان تقریباً نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے۔ع

کبھی فرصت میں سن لینا بڑی ہے داستاں میری

الوداع اے فخر دین وملت۔الوداع اے خادم حصن اسلام۔الوداع اے شارح علوم قاسمیہ الوداع اے امین گلشن نبویہ ﷺ۔الوداع اے میر کارواں،الوداع تیری تربت پہ ہزاروں رحمتیں ہوں اور تو رب کریم کے بے پناہ لطف وکرم سے مالا مال ہو۔

نذر اشک بے قرار ازمن پذیر ❁ گریہ بے اختیار ازمن پذیر

❁❁❁

حکیم الاسلام کا سانحۂ ارتحال

حضرت مولانا اخلاق احمد صاحب عثمانی، ماہنامہ بینات کراچی، پاکستان

موت العالم موت العالم یعنی عالم کی موت عالم کی موت کے مصداق ہے۔ یہاں عالم سے مراد عالم ربانی ہے۔ جس عالم ربانی کے سانحۂ ارتحال پر کل عالم اسلام طبعی غم واندوہ میں مبتلا ہے وہ ہیں حکیم الاسلام غزالی دوراں جامع شریعت وطریقت، مرشد کامل۔ خطیب بے مثل، مفکر اسلام حضرت علامہ قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند جو بعمر ۸۸ سال مورخہ ۶ رشوال ۱۴۰۳ھ۔ مطابق ۱۷ ر جولائی ۱۹۸۳ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اور بقولہ تعالیٰ۔

الاان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون. اناللہ وانا الیہ راجعون.

راقم الحروف بصد عجز وخلوص دعا گو ہے کہ اللہ رحمٰن ورحیم اپنی رحمت کاملہ اور مغفرت واسعہ کے صدقہ میں حضرت حکیم الاسلامؒ کو جنت الفردوس میں داخل فرمائے۔ ع

ایں دعاء ازمن واز جملہ جہاں آمین باد!

کل نفس ذائقة الموت

ترجمہ: ہر شخص کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ ے

موت سے کس کو رستگاری ہے ❁ آج وہ کل ہماری باری ہے

فاعتبروا یا اولی الابصار. چودہویں صدی ہجری کے مجدد ملت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب قدس سرہ کے سانحۂ ارتحال کے موقعہ پر علامہ سید سلیمان ندویؒ نے حسبِ ذیل تاثرات کا اظہار فرمایا تھا۔

”اب اس دور کا بالکل خاتمہ ہوگیا جو حضرت شاہ امداداللہ مہاجر مکی مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا شیخ محمد تھانوی کی یادگار تھا۔ اور جس کی

ذات میں حضرات چشتیہ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت سید احمد بریلویؒ کی نسبتیں یک جا تھیں۔ جس کا سینہ چشتی ذوق وعشق اور مجددی سکون ومحبت کا مجمع البحرین تھا۔ جس کی زبان شریعت وطریقت کی وحدت کی ترجمان تھی۔ جس کے قلم نے فقہ وتصوف کو ایک مدت کی ہنگامہ آرائی کے بعد باہم آغوش کیا تھا۔ اور جس کے فیض نے تقریباً نصف صدی تک اللہ تعالیٰ کے فضل وتوفیق سے اپنی تعلیم وتربیت اور تزکیہ وہدایت سے ایک عالم کو مستفید کر رکھا تھا۔ اور جس نے اپنی تقریر وتحریر سے حقائق ایمانی، حقائق فہمی، اسرار احسان اور رموز وحکمت ربانی کو برملا خاموش کیا تھا۔ اور اسی لیے دنیا نے اس کو حکیم الامت کہہ کر پکارا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اس اشرف زمانہ کے لیے یہ خطاب عین حقیقت تھا''۔

بالعموم ان تاثرات کا اطلاق حکیم الاسلام حضرت علامہ قاری محمد طیّب صاحب قاسمیؒ کے سانحۂ ارتحال پر بھی بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی وفات کے بعد نصف صدی سے زائد تک حضرت حکیم الاسلام صحیح معنوں میں حضرت حکیم الامت تھانوی کی نیابت وخلافت کے فرائض احسن طور پر انجام دیتے رہے۔ جس سے پورا عالم اسلام بخوبی واقف ہے۔

آپ نے ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم دیوبند سے سندِ فضیلت حاصل کی اور دارالعلوم دیوبند ہی میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری کر دیا۔ بوجہ علم وذکاوت اور خاندانی وجاہت ونسبت کے طلباء میں جلد ہی آپ کے ساتھ گرویدگی پیدا ہوگئی۔ ۱۳۴۱ھ میں دارالعلوم کی مدرسی ہی کے زمانہ میں آپ کو دارالعلوم دیوبند کا عہدۂ نیابت اہتمام (نائب مہتمم) پیش کیا گیا جس کو آپ نے اپنے بزرگوں کا حکم اور منشاء سمجھتے ہوئے قبول کر لیا اور ۱۳۴۱ھ سے ۱۳۴۷ھ تک جب آپ کے والد ماجد بقیدِ حیات اور مہتمم دارالعلوم دیوبند رہے۔ آپ نائب مہتمم کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند کے انتظامی معاملات میں باضابطہ حصہ لیتے رہے۔ ۱۳۴۸ھ میں آپ کا باضابطہ تقرر عمل میں آیا۔ اور تادمِ واپسیں

اس جلیل القدر منصب پر فائز رہے آپ کا دورِ اہتمام ۱۳۴۱ھ سے ۱۴۰۳ھ تک تقریباً ۶۲ سال کے طویل عرصہ پر محیط ہے۔اس باسٹھ سالہ دورِ اہتمام میں دارالعلوم دیوبند ہر لحاظ سے اور ہر شعبہ میں ترقی وکمال کے بام عروج پر پہنچ گیا۔اور تمام عالم اسلام اس حقیقت کا معترف ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے اہتمام کی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دینے کے ساتھ ساتھ آپ علیہ الرحمۃ درس وتدریس تبلیغ وتلقین، تصنیف وتالیف اور مواعظ وخطبات کے ذریعے اصلاح مومنین اور تزکیہ نفوس کی گراں قدر اور مؤثر خدمات تادمِ مرگ مسلسل انجام دیتے رہے۔ چناں چہ برِاعظم پاک وہند کے گوشہ گوشہ میں آپ علیہ الرحمۃ کے بے شمار تلامذہ اور شاگرد، مریدین ومنتسبین اور خلفاء ومجازین موجود ہیں۔ بقول شاعر

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی شکل بھی سوا ہوتی ہے

حقیقت یہ ہے کہ آپ کی دلکش شخصیت کے بے شمار حسین پہلو ہیں۔شرافت وانسانیت سراپا انکسار پاک باطنی علم وفضل خطابت وتقریر وعظ وتلقین سادگی وعجز انکساری حکیمانہ گفتگو فصاحت وبلاغت غرض کہ ان کی پُر عظمت شخصیت اعمال وکردار اور جلال وجمال کا ایک حسین امتزاج تھی۔

دارالعلوم دیوبند کے جشن صد سالہ کے بعد حضرت حکیم الاسلام علیہ الرحمۃ پر غیر معمولی دورِ عزیمت وارد ہوا۔باوجود پیرانہ سالی اور کمالِ ضعف وناتوانی کے اس جواں مردِ عزیمت کے پائے استقلال میں ذرا جنبش نہ آئی اور کمال صبر واستقامت اور ہمت وعزیمت کے ساتھ اس ابتلاء عظیم کا مقابلہ کرتے رہے اور زبان پر بھی حرفِ شکایت تک نہ لائے بلکہ دوسروں کو بھی صبر وتحمل ہی کی تلقین فرماتے رہے۔یہ غیر معمولی کارنامہ عزیمت حضرت علیہ الرحمۃ کا عظیم ترین مجاہدہ ہے۔اور تاریخ دارالعلوم دیوبند میں سنہرے حروف میں قلم بند ہونے کے لائق ہے۔حضرت حکیم الاسلامؒ کی حیات طیبہ کے اس مختصر سے جائزے سے بخوبی واضح ہوگیا۔کہ حضرتؒ کی پوری زندگی، بچپن

ہو، جوانی ہو، بڑھاپا ہو غرض کہ ہر دور میں ہر حال میں خالص رضائے حق کے کاموں میں صرف ہوئی۔ اس سے زیادہ خوش قسمتی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

ایسے ہی اللہ والوں کے بارے میں ارشاد ربّانی ہے:۔

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم و لاھم یحزنون.

یاد رکھو اللہ کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ غم

ایسے ہی علماء ربّانی، عارفین حقانی اور ذاکرین سبحانی کو مرتے وقت یہ مژدہ جانفزا سنایا جاتا ہے۔

یآ ایتھا النفس المطمئنہ ارجعی الیٰ ربك راضیة مرضیة فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی.

''اے جان اطمینان والی جس کو ذکر اللہ میں چین تھا۔ آجا اپنے رب کی طرف۔ تم اللہ تعالی سے راضی، اللہ تم سے راضی، اے نفس مطمئنہ داخل ہو جا میرے خاص بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں''۔

❁❁❁

جامع الکمالات شخصیت

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی

ماہنامہ بینات کراچی، پاکستان

۶ شوال المکرم ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء بروز اتوار حضرتِ اقدس حکیم الاسلام مولانا الحاج الحافظ القاری محمد طیب قاسمی ۸۸ سال کی عمر میں عالم فنا سے عالم بقا کی طرف رحلت فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت حکیم الاسلام مرحوم کی عبقریت شخصیت گوناگوں فضائل وکمالات کا مجموعہ تھی۔ وہ اپنے دور کے بہترین قاری، جید حافظ، صاحبِ کمال عالم، قوی النسب شیخ طریقت، بے بدل خطیب، صاحبِ طرز ادیب، نامور متکلم، نکتہ رس فلسفی۔ قادر الکلام شاعر، کامیاب مدرس اور شگفتہ قلم مصنف تھے۔ حکمت قاسمی کے شارح اور روایات سلف کے امین تھے۔

حضرت مرحوم، حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاری محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کے پوتے تھے۔ ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں عالم وجود کو رونق بخشی اہل اللہ کی آغوش محبت میں پھلے پھولے۔ قاعدہ بغدادی کی بسم اللہ سے لے کر علوم عالیہ کی تکمیل تک سب کچھ دارالعلوم ہی میں پڑھا۔ دارالعلوم کے اس دور کے خضر صفت اساتذہ نے نہایت محبت وشفقت اور محنت وتوجہ سے پڑھایا۔ حدیث میں حضرت امام العصر علامہ محمد سید انور شاہ کشمیری قدس سرہ سے تلمذ تھا۔

۱۳۳۷ھ میں سند فراغت حاصل کی اور دارالعلوم ہی میں حسبۃ اللہ تدریس کی خدمات انجام دینے لگے۔ ۱۳۴۳ھ - ۱۳۴۸ھ تک اپنے اکابر کی موجودگی میں دارالعلوم کے نائب مہتمم رہے۔ اور ۱۳۴۸ھ سے اہتمام کے منصب پر فائز ہوئے۔ قدرت فیاض نے انہیں حسن وجمال اور فضل وکمال کے ساتھ ساتھ عقل ودانش، فہم وفراست، حلم ووقار،

حسن تدبیر اور نظم و نسق کی بے پناہ صلاحیتیں بھی عطا فرمائی تھیں۔

حضرت اقدس شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کی مالٹا سے تشریف آوری پر ان سے بیعت ہوئے۔ اور ان کے وصال کے بعد حضرت اقدس حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ سے سلوک کی تکمیل کی اور خلافت و اجازت سے مشرف ہوئے۔

حضرت مرحوم کا عظیم الشان کارنامہ قریباً ساٹھ سال تک مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی انتظامی خدمات ہیں۔ صرف دارالعلوم کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ دیگر اداروں میں بھی اتنی طویل مدت تک منصبِ اہتمام پر فائز رہنے کی مثالیں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔

جشن صد سالہ کے بعد بعض خفی و جلی وجوہ و اسباب کی بناء پر دارالعلوم میں خلفشار کی صورت پیدا ہوئی۔ اور حضرت مرحوم کے لیے اپنی پیرانہ سالی اور ضعف و علالت کی وجہ سے اس کا سلجھانا ممکن نہ تھا اس لیے آپ کا روحانی و قلبی تعلق دارالعلوم سے بدستور قائم رہا۔ اور ہمیشہ دارالعلوم کے لیے خیر طلب اور دعا گو رہے اور وصیت فرمائی کہ آپ کی نماز جنازہ دارالعلوم کے احاطہ میں ہو۔

حضرت کی صحت کافی عرصہ سے مخدوش چلی آ رہی تھی۔ اور ایک سال سے تو قریباً صاحبِ فراش تھے۔ بالآخر وہ وقت موعود آ پہنچا جس سے کسی فرد و بشر کو مفر نہیں ان اللہ وانا اخذ ولدہ ما اعطا، وکل عندہ باجل مسمیٰ حضرت کی وفات حسرت آیات اہل حق کے لیے عظیم سانحہ ہے۔ حق تعالیٰ شانہ مرحوم کو درجات عالیہ عطا فرمائیں۔ اور تمام متعلقین اور پس ماندگان کو صبر جمیل نصیب فرمائیں۔ آمین۔

❀❀❀

آہ! علوم قاسمی کا ترجماں نہ رہا

حضرت مولانا حکیم انیس احمد صدیقی، کراچی الرشید ساہیوال

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے جانشیں اور علوم قاسمیہ کے ترجمان عالم فانی سے عالم آخرت کی طرف تشریف لے گئے حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب مرحوم بانی دارالعلوم دیوبند کے پوتے اورانکے علمی روحانی وجسمانی وارث تھے۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی تصنیفات صرف بہت بڑے اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ مفتی اعظم پاکستان حضرت اقدس مولانا محمد شفیعؒ فرمایا کرتے تھے کہ:

> ”ہماری جماعت دیو بند میں حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے علوم و معارف کو جن حضرات نے سمجھا ہے ان میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں“۔

حضرت قاری صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے تفہیم وتقریر کا ایک خاص ملکہ عطا فرمایا تھا اور آپ بڑے سے بڑے علمی نکات اور اسرار ورموز کو نہایت آسان الفاظ میں بیان کرتے تھے۔ آپ نے لاہور میں علم دین کے متعلق تقریر فرمائی۔ ضمناً روح کا بیان بھی اس میں آگیا معلوم ہوتا تھا کہ روح کا مسئلہ نہایت آسان اور بدیہی ہے۔ آپ کی تقاریر میں حضرت نانوتویؒ کے علوم ومعارف کی تفہیم وتفسیر ہوتی تھی۔ دیو بند کی جامع مسجد میں ہر جمعہ کو کسی آیت کی تفسیر بیان کرنے کا معمول بھی رہا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ قرآن کریم کی ایک تفسیر تالیف فرمار ہے تھے لیکن دارالاہتمام کے انتظام وانصرام کی مشغولیت ومصروفیت کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کا وقت کم ملتا تھا۔ اور حضرت قاری صاحب کی یہ تفسیر

قرآن افسوس کہ مکمل نہ ہوسکی۔ یہ علم تفسیر کا ایک خزانہ تھی۔ اس کے علاوہ حضرت نانوتوی قدس سرہ کے علوم ومعارف کا بے بہا خزانہ عام فہم زبان میں پیش کرنا ایک عظیم سعادت کے علاوہ زمانہ کی بہت بڑی ضرورت کو پورا کرنا تھا۔ اور بہت بڑی علمی ضرورت تھی۔

اب حضرت قاری صاحب کے قابل فخر صاحب زادہ مولانا قاری محمد سالم صاحب اس سلسلہ میں خاص توجہ کریں اور حضرت قاری صاحب کے علمی مسوّدات کی اشاعت کا انتظام فرمائیں۔

حضرت قاری صاحب نے ایک نہایت مفصل اور جامع مقالہ "مقدمۃ القرا" کے نام سے تالیف فرمایا تھا۔ یہ مقالہ بعض تفاسیر کے ساتھ اور مستقل کتاب کی صورت میں شائع ہوچکا ہے۔ مجلس معارف القرآن اکیڈمی قرآن عظیم دارالعلوم دیوبند کا ایک تالیفی ادارہ جو حضرت قاری صاحب کی زیرنگرانی وصدارت کام کررہا تھا۔ اور حضرت کی تالیفات مستقل شائع کرتا رہا ہے۔

حضرت قاری صاحب ایک عظیم خطیب تھے اور پوری دنیا میں ان کی خطابت کی دھوم تھی۔ اور بڑے بڑے خطیب ان کے انداز بیان کے ثناخواں تھے وہ ہر خطے میں پہنچ کر دین اور دارالعلوم کے مقاصد کی تبلیغ وترویج کرتے رہے۔ متعدد مدارس کے بانی تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی کونسل کے ممبر تھے، عرصہ دراز تک سنی سنٹرل وقف بورڈ کے صدر رہے۔ پاکستان میں جامعہ اشرفیہ لاہور۔ جامعہ خیر المدارس ملتان اور دارالعلوم کراچی وغیرہ دینی مدارس کے سرپرست رہے۔ اور دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داروں میں سے آپ پہلے شخص تھے جنھوں نے بیرونی ممالک کے متعدد سفر کئے اور ہر ملک میں دارالعلوم کا تعارف کرایا۔ آپ کے زمانۂ اہتمام میں دارالعلوم نے غیر معمولی ترقی کی۔

تعلیمی اور تعمیری سلسلہ پورے عروج پر پہنچا اور ہزاروں تشنگانِ علوم ومعرفت کو اپنے چشمہ فیض سے سیراب وشاداب کیا۔ آپ کے تین صاحبزادے ہیں۔ مولانا محمد سالم صاحب قاسمی، مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی اور مولانا پروفیسر محمد اعظم قاسمی۔ ان میں

اول الذکر دونوں صاحبزادے دارالعلوم ہی میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور پروفیسر محمد اعظم قاسمی علی گڑھ یونیورسٹی میں اسلامیات کے لیکچرار کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ حضرت قاری صاحب کے درجات بلند فرمائے اور ان کے صاحب زادوں اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین۔ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

❁❁❁

آہ! حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب قریشی ماہنامہ صدائے اسلام پشاور

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اور عالم اسلام کے ممتاز یکتائے روزگار عام سیدی ومرشدی حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ نہ جانے کس دور میں ہم آگئے ہیں کہ یکے بعد دیگرے صالحین واکابرین کی جماعت اٹھتی جارہی ہے۔ حسد وبغض کینہ پروری اور دنیاوی کئی ایک امراض طبقۂ علماء میں بھی سرایت کررہے ہیں۔ مرکزی شخصیات کے نہ ہونے کی وجہ سے جماعت کا شیرازہ بکھرتا جارہا ہے۔ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی، حضرت مفتی شفیع صاحبؒ، حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانویؒ مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا مفتی محمود الحسن صاحبؒ اور مولانا غلام اللہ خاں صاحبؒ اور دیگر اکابر بزرگ رہنما اس دارِ فانی سے کوچ کرگئے ہیں۔ یہ کیا گئے کہ بہت سی برکتیں اور رحمتیں ساتھ لے گئے۔ اور آج ہم ان برکتوں اور رحمتوں سے محروم ہوچکے ہیں۔

حضرت قاری صاحبؒ کی موت پر جو صدمہ ہونا تھا وہ تو سب کو ہے دنیا کا کوئی مسلمان فرد حضرت قاری صاحب کی شخصیت سے انکار نہیں کرسکتا قاری صاحبؒ کے دشمن بھی ان کی للّٰہیت خلوص، پرہیزگاری عظمت اور بلندی کردار کے قائل تھے۔ ان کے تقویٰ اور علمی عظمت کا کبھی کسی دشمن نے بھی انکار نہیں کیا۔ لیکن افسوس کہ حضرت قاری صاحب کو اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں بلکہ بعض اپنے رفقاء اور شاگردوں کے ہاتھوں ایسے صدمات اٹھانے پڑے جن صدمات کو برداشت کی مزید تاب نہ لاتے ہوئے وہ داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔

حضرت قاری صاحب کی زندگی کے آخری ایام تاریخ دیوبند میں انتہائی دردناک

والمناک ایام ہیں۔اور تاریخ کے صفحات پر یہ انتہائی درد داغ کے ساتھ ہی لکھے جائیں گے۔ان کی تفصیلات میں جانے سے درد والم میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔لہٰذا ان کے ذکر کرنے کی اس موقع پر ضرورت نہیں۔تقدیر کا لکھا مٹ نہیں سکتا جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔

۱۹۷۴ء میں حضرت قاری صاحبؒ پاکستان کے دورے پر تشریف لائے تو وہ جامعہ اشرفیہ لاہور میں مقیم تھے۔اتفاق سے ان دنوں میں بھی لاہور میں تھا۔حضرت قاری صاحبؒ کو بہت ہی قریب سے دیکھا۔اور چند روز حضرت کی صحبت نصیب ہوئی بہت کچھ سنا اور سیکھا اس موقع پر احقر اور مولانا صاحبزادہ عبدالرحمٰن نائب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور اور مولانا سید عبدالقادر صاحب آزاد اسلامی مشن والے ہم تینوں حضرت سے بیعت ہوئے اور میں نے حضرتؒ کو جامعہ اشرفیہ پشاور آنے اور جامعہ کے دارالحدیث کا سنگ بنیاد رکھنے کی دعوت دی جس کو حضرت نے بخوشی قبول فرمایا۔اور مورخہ ۲۳/جنوری ۱۹۷۵ء کو بذریعہ ہوائی جہاز پشاور تشریف لائے۔

ہم نے ایرپورٹ پر حضرت کا شاندار استقبال کیا۔حضرت نے جامعہ میں ایک مفصل اور تاریخی خطاب فرمایا۔دارالحدیث کا سنگِ بنیاد رکھا اور جامعہ کو دیکھ کر بڑی خوشی کا اظہار فرمایا۔

اس کے بعد حضرت کی کشش احقر کو مارچ ۱۹۸۰ء میں دارالعلوم دیوبند کے جشن صدسالہ میں لے گئی۔اور تین روز یہ صد سالہ جشن جاری رہا۔اجلاس کے اختتام پر احقر، مولانا علی اصغر صاحب اور مولانا عبدالقادر آزاد حضرت سے اجازت لینے جب ان کے مکان پر حاضری ہوئے تو حضرت کو سخت بخار تھا اور پیہم تھکاوٹ کی وجہ سے بدن چور چور تھا۔مگر اللہ والوں کو اللہ تعالیٰ نے کتنی ہمت اور عزم بخش دیا ہے۔اس کا اندازہ اس آخری ملاقات سے ہوا کہ اس بیماری کی حالت میں بھی مہمانوں کا کتنا خیال تھا۔جامعہ کے دارالحدیث جس کا سنگ بنیاد حضرت نے رکھا تھا۔وہ مکمل ہو گیا تھا میں نے ایک ساتھی سے کہا کہ آپ حضرت سے کہیں کہ اس کا افتتاح بھی آپ کو فرمانا ہے اس کے لیے وقت دیں۔

حضرت فرمانے لگے کہ ”جامعہ اشرفیہ پشاور کے ساتھ میرا ایسا قلبی تعلق ہے کہ اس کے لیے ٹائم مانگنے کی ضرورت نہیں جب انھوں نے بلایا تو میں آ جاؤں گا۔

• افسوس کہ اس جشن کو ایسی نظر بد لگی کہ اس کے بعد حضرت کی پاکستان آنے کی کوئی صورت ہی نہ رہی۔ اور جلد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے اس صدمۂ عظیم میں ادارہ جامعہ اشرفیہ پشاور۔ ادارہ صدائے اسلام...... مؤتمر المؤلفین اور جامعہ کے تمام علماء وطلباء حضرت کے فرزند باکمال مولانا قاری سالم صاحب و دیگر پسماندگان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔

اللہ تعالیٰ حضرت کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ اور ان کے جملہ پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ آمین

دارالعلوم دیوبند

اور

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ

جرنلسٹ سید زاہد حسین صاحب

جب دار لعلوم کی تاریخ صفحہ قرطاس پر آئے گی تو دار لعلوم اور حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہ کی قد آور اور بلند ترین شخصیت لازم ملزوم قرار دی جائے گی اور دار لعلوم کی تاریخ و تذکرہ اس عبقری شخصیت کا نام لیے بغیر تشنہ نامکمل اور نا تمام ہی تصور کیا جائے گا۔ اس نا قابل تسخیر شخصیت کے بعد دار لعلوم دیوبند کے لیے خاندان قاسمی کی ہمہ جہت خدمات کس درجہ وقف رہی ہیں اس کا مختصر تذکرہ بھی ضروری ہے۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے مسلمانوں سے کیوں کر اقتدار چھینا تھا اس لیے انھوں نے اپنے غاصبانہ اقتدار کے لیے خاص طور پر اگر کوئی خطرہ محسوس کیا تو وہ مسلمانوں سے تھا، اس لیے اپنی شاطرانہ سیاست اور تاریخی عداوت کے تحت قتل و غارت گری کے چنگیزی پلان پر اس طرح عمل شروع کیا کہ نہ صرف ہزار ہا ہزار علمائے حق کو تختہ دار پر چڑھایا بلکہ اپنی غیر انسانی تاریخ کو لاکھوں بے گناہ مسلمانوں کے خون کی انمٹ سرخیوں سے آٹھ سال تک رنگین کرتے رہے، لیکن برسوں کی اس بے تحاشا خوں ریزی کے باوجود جب کامیابی کے آثار نظر نہیں آئے تو تمام مسلم اوقاف بحق سرکار ضبط کر کے ہزاروں مدارس کو بند کر دینے پر مجبور کر دیا جن کا مدار ہی صرف مسلم اوقاف کی آمدنی پر تھا، اس نازک ترین مرحلے پر مشیت ربانی نے اپنے دین متین کی حفاظت و اشاعت کے مبارک و مسعود عزم کے لیے قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نور اللہ مرقدہ کے قلب مخلص کو منتخب فرمایا

جنھوں نے اپنی عظیم ایمانی فراست عالمگیری علمی وسعت اور بے مثال عرفانی رفعت سے اس کا بالہام ربانی ادراک فرمایا، اور ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی اور اس کی روح اس کا وقف ہونا قرار پائی، بلاشبہ حضرت الامام کا ملت اسلامیہ پر ہی وہ عالمگیر احسان ہے کہ اس کا اعتراف اہل علم ودانش نے کیا ہے اور کرتے رہیں گے۔

حضرت بانی دارالعلوم کے صاحبزادہ گراں مرتبت شیخ الاسلام حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ نے اپنے عمیق علم وعرفان اور وقیع فضل وکمال اور معروف تقویٰ وطہارت دیانت وامانت اور بے مثال انتظامی صلاحیت سے اپنے چالیس سالہ دورِ اہتمام میں غیر منقسم ہندوستان کا ہی نہیں بلکہ ایشیا کے عظیم علمی اور دینی مرکز کے مقام عظمت تک پہنچا دیا۔

شیخ الاسلام کے بڑے صاحبزادے اور بانی دارالعلوم کے حفید رشید حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہ کی علمی گہرائی، اخلاقی گیرائی، عمیق ترین طرز تحریر وکتابت، موثر ترین تقریر وخطاب اور جملہ بزرگان جماعت دارالعلوم کی علمی اور عرفانی نسبتوں کی جامع ترین شخصیت پر بصیرت مندانہ نگاہیں ڈالیں تو متفقہ طور پر زمام اہتمام پورے انشراح واعتماد کے ساتھ آپ کے مبارک ہاتھوں میں سپرد کردی، مشیت ربانی نے عالم گیری فکر قاسمی کے حامل حضرت حکیم الاسلامؒ کی غیر معمولی صلاحیتوں سے دارالعلوم کی عظمت وافادیت کو چہار دانگ عالم میں پھیلانے کے لیے آپ کو ساٹھ سال کی طویل ترین مدت عطا فرما کر بے مثال خصوصیات سے نوازا، اس مسعود عہد طیب میں دارالعلوم کی مرجعیت اور ترقیات کی تفصیل کے لیے ایک دفتر درکار ہے، تاہم اختصار کے طور پر اس کو یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت کی اعلیٰ ترین علمی وانتظامی کارگزاریوں نے بے شمار خلل اندازیوں اور سیاسی دراندازیوں کے باوجود علمی، تعلیمی، انتظامی اور تعمیراتی میدانوں میں ناقابل بدل ترقیات کی منازل طے کی ہیں، چناں چہ عالمی عزت وشہرت کی حامل شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی نوراللہ مرقدہ نے ندوۃ العلماء

میں منعقد حضرت حکیم الاسلام کے تعزیتی اجلاس میں اسی حقیقت عظمیٰ کے اظہار کے ساتھ خراج تحسین وعقیدت پیش کیا تھا کہ یہ ایک ناقابل انکار واختلاف حقیقت ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا عالمیت اور علمی مرکز کی حیثیت سے بین الاقوامی سطح پر مقام عظمت و افادیت پر قائم ہونا حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ ہی کی بلاشرکت غیرے عظیم صلاحیتوں کے ساتھ زبردست خدمات کا نتیجہ ہے۔

حق تعالیٰ جل مجدہ نے بانی دارالعلوم دیوبند کے خاندان کو گزشتہ ایک سو چالیس سالوں میں بے شمار خود غرضانہ مخالفتوں کے باوجود علم ودیانت کے ساتھ مرکز علم ودین کی عالمی پیمانے مخلصانہ علمی، انتظامی اور توسیعی خدمات انجام دینے کی صلاحیت وتوفیق سے نوازا ہے، حضرت حکیم الاسلام کی ۱۹۸۳ء میں وفات کے بعد حضرت کے بڑے صاحبزادے علوم وامتیازات قاسمی کے امین خطیب العصر حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہ العالی کو اہل تدین اور ملک وبیرون ملک کے مشاہیر نے دارالعلوم دیوبند (وقف) کے مہتمم کی حیثیت سے قبول کیا، رئیس الاہتمام کے گزشتہ بیس سالہ دور اہتمام میں الحمد اللہ وقف دارالعلوم دیوبند نے بے مثال ترقیات کی منازل طے کی ہیں اور مسلسل علمی، تعلیمی اور تعمیراتی ترقیات کی طرف گامزن ہیں، حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مہتمم ومتولی وقف دارالعلوم دیوبند کے ساتھ دوسری قابل ذکر شخصیات حضرت مولانا نعیم صاحب شیخ الحدیث وقف دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا انظر شاہ صاحب (صدر المدرسین) صاحبزادہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد اسلم قاسمی صاحب، حضرت مولانا خورشید عالم صاحب اور حضرت کے صاحبزادے مولانا سفیان قاسمی صاحب کی بھی وقف دارالعلوم کے لیے خدمات قابل ذکر ہیں اس ادارے کی آبیاری میں سرگرم عمل ہیں۔

ہم تمام کارکنان وقف دارالعلوم دیوبند بارگاہ ایزدی میں ان تمام حضرات کے لیے دست بہ دعا ہیں۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ
شخصیت اور خدمات

مولانا عبدالرشید صاحب بستوی رناظم تعلیمات جامعہ الامام محمد انور دیوبند

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً:

''حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے پوتے، حضرت مولانا حافظ صاحبؒ کے فرزند اکبر، علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے تلمیذ رشید، حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے خلیفۂ اجل، دارالعلوم دیوبند کے مہتمم، اپنے عصر کے بے مثال خطیب اور سحرالبیان واعظ۔

''اگر انسانیت، مروت، شرافت، تواضع، فروتنی مجسم شکل اختیار کرسکتی ہیں تو پھر ان کی تلاش میں زیادہ سرگردانی کی ضرورت نہیں، وہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے حسین پیکر میں جلوہ افروز ہیں۔ مزاج اس قدر شگفتہ کہ بچوں کے ساتھ ہوں تو، ''حکایت لطیف'' نوجوانوں کو اخلاقی نصیحت کرنے پر طبیعت آمادہ ہو تو ''اخلاق محسنی'' دلچسپ و نصیحت خیز واقعات سنانے پر آئیں تو ''گلستاں'' منظوم ہدایت کا باب کھلے تو ''ہست قرآں در زبان پہلوی'' حلم و بردباری کی ان بلند روایات کے حامل کہ خاص اس وصف کی قدر انھوں نے بھی کی جو مدتوں سے ان سے سوئے ظنی میں مبتلا رہے...... طبیعت ایسی نکتہ آفریں اور نکتہ سنج کہ ان کی گفتگو مسلسل نکات کی ایک خوب صورت لڑی، زبان اتنی شیریں کہ آج تک لفظوں کی درشتگی، تعبیرات کی سختی، اسلوب کی کڑواہٹ، ان کی زبان کی مٹھاس پر غالب نہ آسکی۔''(۱)

ولادت سن ولادت قمری حساب سے ۱۳۱۵ھ ہے اور شمسی حساب سے جون ۱۸۹۷ء۔ ولادت بھی ایک مستجاب الدعوات بندہ خدا کی کرامت کا ظہور،

حضرت شیخ الہندؒ کا پیغام، حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب دیوبندیؒ کے توسط سے اس عبد صالح تک پہنچا۔ سر جھکایا، مراقبہ کیا، کچھ راز و نیاز کی باتیں کیں اور جب سر اٹھایا تو ان الفاظ میں حضرت مولانا حافظ احمد صاحب کے یہاں لڑکے کی تولد کی خوش خبری دی:

''لڑکا ہوا، قاری ہوگا، مقتدیٰ ہوگا، عالم ہوگا، حاجی ہوگا''۔(۲)

اس پریشان حال، پراگندہ بال شخص کی الہامی زبان سے جو کچھ نکلا، حق تعالیٰ نے اسے حرف بہ حرف پورا کردیا۔ اسی طرح کے بندگان خدا کے تعلق سے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں وارد ہوا ہے ''رب اغبر اشعث لو اقسم علی اللہ لأبرہ''.

تقریب بسم اللہ

چند سال کی عمر کے آس پاس بسم اللہ کی تقریب سعید ہوئی۔ یہ سعید رسم حضرت شیخ الہندؒ کے والد بزرگوار اور اپنے عہد کے ممتاز ترین عالم حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے مقدس ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس مبارک تقریب میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندی، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ جیسی قدسی صفات شخصیات رونق افروز تھیں۔ تقریب کے اختتام پر ان سب کے ہاتھ بارگاہِ ایزدی میں حضرت قاری صاحبؒ کے حق میں دعا کے لیے اٹھے اور حق تعالیٰ نے ان ہاتھوں کو خالی واپس نہ کیا۔

اساتذہ و مشائخ

حفظ و تجوید ہندوستان کے معروف صاحب فن قاری عبدالوحید صاحب الہ آبادیؒ سے کیا اور گیارہ سال کی عمر میں حفظ مع التجوید سے فارغ ہوگئے۔ اس کے بعد دینیات اور دو، فارسی اور حساب وغیرہ کی تکمیل کے بعد درجات عربی میں داخل ہوئے اور دارالعلوم دیوبند میں جلوہ افروز جن فخر روزگار اساتذہ و مشائخ کے سامنے آپ نے زانوئے تلمذ تہ کیا، ان میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری، حضرت مولانا غلام رسول خاں صاحب ہزاروی، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی، حضرت علامہ انور شاہ

کشمیریؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی، حضرت مولانا اعزاز علی صاحب امروہوی اور حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی علیہم الرحمہ جیسی عبقری ونابغہ روزگار شخصیات شامل ہیں۔

آیئے دیکھیں کہ ان ماہرفن اساتذہ اور عہد ساز ورجال ساز شخصیات سے تلمذ نے حضرت قاری صاحب کی ذات کو کس کس طرح سے نکھارا، سنوارا، بنایا اور آغوش ثریا بنایا۔

خوش الحانی یا لحن داؤدی

حضرت مولانا حکیم عبد الرشید عرف حکیم نھو میاںؒ نبیرۂ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت حکیم الاسلام کی تجوید وقرأت کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

''میرے والد صاحبؒ، علیل ہو کر شفایاب ہوئے تھے۔ دیوبند سے ایک بڑا مجمع حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ، مولانا اعزاز علی صاحبؒ، علامہ ابراہیم بلیاوی صاحبؒ، اور حضرت مولانا اصغر حسین صاحبؒ وغیرہ مزاج پرسی کو تشریف لائے مولانا طیب صاحب ۲۵ ؍سالہ بھی ساتھ تھے۔ بعد مغرب کا وقت تھا۔ حضرت حکیم صاحب (والد ماجد حکیم نھوں میاں صاحب) نے فرمایا طیب! ایک رکوع سناؤ۔ یاد ہے ''ولقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوس بہ نفسہ الخ سنایا'' سماں بندھ گیا، آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ میرے کانوں نے یہ خوش لحنی عمر میں پہلی مرتبہ سنی تھی۔ ساز بھی سوز بھی، دل گداز بھی، نغمہ ہائے دل کش سحاب اندر سحاب بھی۔ یہ پہلا نقش تھا، جو آج بھی تازہ ہے۔'' (۳)

اسی تعلق سے ایک اور شہادت حق ملاحظہ ہو:

''اللہ تعالیٰ نے حضرت قاری صاحبؒ کو جہاں جمال صورت وسیرت سے نوازا تھا، وہیں آپ کی آواز بھی بلند تھی اور اس میں لحن داؤدی بھی تھا۔ جس مجلس میں آپ قرآن کی تلاوت فرمادیتے، ایک سماں بندھ جاتا، اکابر آپ سے قرآن سنتے۔ حضرت تھانویؒ کی خدمت میں تھانہ بھون حاضر ہوتے تو حضرت جہری نماز کے

لیے آپ ہی کو آگے بڑھاتے۔ یہ صرف قاری صاحب کی خصوصیت تھی، ورنہ تھانہ بھون کی خانقاہ کی مسجد میں حضرت تھانویؒ کی موجودگی میں دوسرا امام نہ ہوتا تھا۔" (۴)

شانِ تدریس

۱۳۴۷ھ میں حضرت قاری صاحب علیہ الرحمہ نے دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی اور اس کے معاً بعد دار العلوم ہی میں اپنے فخر روزگار اساتذہ کے زیر سایہ حسبۃ اللہ تدریس کا آغاز کیا اور درس نظامی کی مختلف علوم وفنون کی کتابیں، نہایت نیک نامی کے ساتھ پڑھائیں۔ مولانا نور الحسن شاہ بخاری یکے از تلامذہ حضرت حکیم الاسلام، آپ کے انداز درس درس کی بابت رقم طراز ہیں:

"جس طرح آپ فضل وکمال میں عدیل ومثیل نہ رکھتے تھے، اسی طرح درس میں بھی آپ کی امتیازی شان تھی اور تدریس میں بڑا کمال حاصل کیا تھا۔ آپ کا درس پر وقار اور شائستہ ہوتا تھا اور حلقۂ درس کو دیکھ کر سلف صالحین اور اکابر محدثین کے حلقۂ تدریس کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا۔ زمانہ تدریس کے آغاز میں منطق وفلسفہ اور اصول فقہ وغیرہ کی کتب پڑھاتے رہے، اس کے بعد حدیث کی اعلیٰ کتب زیر درس رہیں اور ہزاروں افراد کو اپنی زندگی میں فیض یاب کیا"۔ (۵)

مولانا نور الحسن شاہ بخاری، جنھیں مشکاۃ المصابیح اور سنن ابن ماجہ میں بھی حضرت حکیم الاسلام سے شرف تلمذ حاصل ہے، لکھتے ہیں:

"مشکاۃ جس روز شروع ہوئی تو حضرت کے درس میں ابھی بسم اللہ بھی نہیں ہوئی تھی کہ فن حدیث پر تقریر شروع کی۔ سچ کہتا ہوں کہ علم وفضل کا ایک بحر بے کراں تھا، جو بڑی روانی کے ساتھ بہتا چلا آ رہا تھا، حقائق ومعارف کا ایک دریا تھا جو بے اختیار، امڈ رہا تھا، الفاظ کیا تھے حقانیت ومعارف کے موتی تھے، جو بے تحاشہ لٹائے جا رہے تھے۔ علم حدیث کی اہمیت پر استدلال، محدثین کے طبقات، اہل قرآن کے اعتراضات اور ان کے جوابات گویا کوئی موضوع ایسا نہیں تھا، جس پر تفصیل سے روشنی نہ ڈالی ہو"۔ (۶)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کی اسرار وحکم پر مشتمل شاہ کار ترین تالیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' سے حضرت قاری صاحب کو خصوصی شغف تھا۔ چناں چہ آپ کے زیر درس یہ کتاب ہمیشہ رہی۔ جس میں حضرت قاری صاحب کا ساکن وصف بحر علم ومعرفت خود بہ خود متلاطم اور موجزن ہوجایا کرتا تھا اور آپ کے حکیمانہ وعارفانہ ذوق کے جواہر واسرار کھلتے اور پڑھنے والوں کی نظر، تشریحات اسلامی کے ان مخفی گوشوں پر ایسی وسیع ہوجاتی، جو سالہا سال کی شبانہ روز محنت کے بعد بھی میسر آنا مشکل ہے۔ حکمت ولی اللہی سے نقاب کشائی کے لیے جس نگہ دقیقہ رس، فکر بلند پرواز اور سخن دل نواز کی ضرورت تھی، وہ سب بہ حصہ وافر، بلکہ بدرجہ اتم حضرت حکیم الاسلامؒ کی شخصیت میں موجود تھیں اور کیوں نہ ہوتیں کہ ایک طرف تو آپ حجۃ اللہ فی الارض قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دار العلوم دیوبند علیہ الرحمہ کے علوم ومعارف کے صحیح وارث اور ان کے گنجینۂ علم وحکمت کے ترجمان تھے تو دوسری طرف امام العصر فی الحدیث حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے خصوصی تلمذ کے حامل اور ساختہ پرداختہ تھے، اس لیے ان کے درس میں دونوں بزرگوں کے علوم ومعارف کا فیضان رہتا تھا۔

جناب مولانا عبید اللہ صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور، حضرت قاری صاحب کے درس ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''امام رازی وغزالی کے علوم ومعارف کے تو حافظ تھے۔ اس کے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہ کے علوم پر بھی گرفت خوب مضبوط تھی۔ دار العلوم دیوبند میں ایک طویل مدت تک ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا باقاعدہ درس دیتے رہے۔ اس درس کی شان یہ ہوتی تھی کہ اس وقت دار العلوم کے بڑے بڑے اساتذہ اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے''۔ (۷)

سحر انگیز خطابت

حضرت قاری صاحبؒ کے فیوض وبرکات اور فیضان علم کا نسبتاً اس سے کہیں زیادہ وسیع میدان اور آپ کے تاجِ علم وحکمت کا ایک امتیازی گوہر، آپ کا جوہر خطابت تھا۔ کیا ہندوستان، کیا پاکستان، کیا

صحرائے افریقہ، کیا سرزمین عرب اور کیا براعظم یورپ وامریکا، قاری صاحب ہر ایک مقام پر نغمہ سرا ہوئے اور اپنی سحر آفرینی سے نہ جانے کتنے گم گشتہ راہوں کی راہ یابی کا سامان فراہم کیا۔

حضرت قاری صاحبؒ، اس تعلق سے خود ہی ارقام فرماتے ہیں:

"تحریر وتقریر میں مجھے دل چسپی لڑکپن سے ہی تھی۔ اسے بڑھانے اور ترقی دینے، نیز اس لائن پر سفر کرانے میں میرے اکابر پیش پیش رہتے تھے۔ میری طالب علمی کے دور میں حضرت الاساتذہ علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ جو مجھے اپنے ساتھ پنجاب کے ایک تبلیغی دورہ میں لے گئے، بڑے بڑے شہروں میں، بڑے بڑے اجتماعات میں میری تقریریں کرائیں۔ یہ واقعہ کوئی ساٹھ پینسٹھ سال پہلے کا ہے، لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ملتان کے ایک جلسہ میں میں اس طرح شریک ہوا کہ بارش میں کپڑے بھیگ چکے تھے اور میں نے ستر پوشی کے لیے ایک بڑا سا کمبل اپنے بدن پر لپیٹ رکھا تھا۔ نہ سر پر ٹوپی تھی، نہ پیر میں جوتا، اسی ہیئت میں اس بڑے اجتماع کے سامنے آ گیا۔

حضرت علامہ کشمیری نے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے میرا تعارف ان الفاظ میں کرایا:

"یہ فقیر صاحب جو آپ کے سامنے کھڑے ہیں، مستقبل کے ایک بہت بڑے مقرر ہیں۔ ہرگز یہ خیال نہ کیجئے کہ فقیروں کی طرح کمبل پوش ہیں تو ان کے پاس کچھ نہیں بلکہ یہ سمجھئے کہ اس گدڑی میں لعل بھی مخفی ہے"۔ (۸)

حضرت علامہ کشمیریؒ کی زبان مبارک سے یہ جملہ نکلا اور بارگاہ ایزدی میں مقبولیت سے سرفراز ہوا۔

حضرت مولانا تقی صاحب عثمانی مدظلہ حضرت قاری صاحب کی خطابت کی بابت لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے حضرت قاری صاحب کو وعظ وخطابت کا ایسا عجیب وغریب ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ بہ ظاہر تقریر کی عوامی مقبولیت کے جو

اسباب آج کل ہوا کرتے ہیں، حضرت قاری صاحب کے وعظ میں وہ سب مفقود تھے۔ نہ جوش وخروش، نہ فقرے چست کرنے کا انداز، نہ پر تکلف لسانی، نہ لہجہ اور ترنم، نہ خطیبانہ ادائیں، لیکن اس کے باوجود وعظ اس قدر مؤثر دلچسپ اور مسحور کن ہوتا تھا کہ اس سے عوام اور اہل علم دونوں یکساں طور پر محظوظ اور مستفید ہوتے تھے۔ مضامین اونچے درجہ کے عالمانہ وعارفانہ، لیکن انداز بیان اتنا سہل کہ سنگلاخ مباحث بھی پانی ہو کر رہ جاتے۔ جوش وخروش تام کو نہ تھا، لیکن الفاظ ومعانی کی ایک نہر سلسبیل تھی جو یکساں روانی کے ساتھ بہتی اور قلب ودماغ کو نہال کر دیتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ منہ سے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے موتی جھڑ رہے ہیں۔ ان کی تقریر میں سمندر کی طغیانی کے بجائے ایک باوقار دریا کا ٹھہراؤ تھا، جو انسان کو زیر وزبر کرنے کے بجائے دھیرے دھیرے اپنے ساتھ بہا کر لیجاتا تھا۔" (۹)

تلاوتِ آیات کی دل نشیں تشریح

قرآن کریم نے حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے تین مقاصد ذکر کیے ہیں۔ ارشاد ہے "وهو الذى بعث فى الأمين رسولا منهم يتلو عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة" تلاوتِ آیات اور قرآن کریم کا لوگوں کے سامنے پڑھ کر سنانے کی بنیادی مقصدیت، اہمیت، افادیت اور قدر وقیمت کا صحیح احساس بہت سے اہل علم کو بھی نہیں۔ مگر جب حضرت قاری صاحبؒ نے اپنی ایک تقریر میں اردو زبان کے ایک جملہ "کیا بات ہے؟" کے لب ولہجہ کے اختلاف، طرز ادا اور انداز تکلم پر ایک گھنٹہ تک چشم کشا تقریر کی تو تلاوتِ آیات کی مقصدیت کی حقیقت واضح ہوگئی۔

حضرت مولانا یوسف صاحب لدھیانوی شہید کراچی لکھتے ہیں:

"ایک موقعہ پر یہ مضمون ارشاد فرمارہے تھے کہ مطالب وتکلم سے بھی الفاظ ہی نہیں ادا کیے جاتے، بلکہ لب ولہجہ اور انداز تکلم سے بھی الفاظ میں معنی بھرے جاتے ہیں۔ اس کی مثال میں اردو کا ایک فقرہ "کیا بات ہے" پیش کیا کہ یہ انکار کے لیے

بھی ہے اور اقرار کے لیے بھی، استفہام کے لیے بھی ہے اور اخبار کے لیے بھی، داد وتحسین کے لیے بھی ہے اور زجر و توبیخ کے لیے بھی۔

''الغرض مسلسل ایک گھنٹہ تک ''کیا بات ہے؟'' کی تشریح ہوتی رہی اور حضرت مرحوم اس کے ہر مفہوم کو لب ولہجہ کی تبدیلی سے سمجھاتے رہے اور مجمع سحر بیانی سے عش عش کر رہا تھا''۔(۱۰)

حضرت قاری صاحب جہاں جاتے ،اہل علم پروانہ وار ان پر گرے پڑتے، گھنٹوں آبشار علم رواں رہتا اور تشنگان علم وحکمت ،اپنی سیری وشادابی کا خوب خوب سامان کرتے۔کیا علماء کیا عوام، کیا طلبہ کیا اساتذہ، کیا اسکالرس اور کیا محققین۔ ہر ایک حضرت والا کی گل افشانی گفتار پر سر دھنتا،حضرت والا کی زبان مبارک سے نکلنے والے اسرار وحکم، کاپی قلم سنبھالے قید تحریر میں لانے کے لیے تیار رہتا اور لذت تقریر سے کام دہن کو شاد کام بناتے ہوئے ہمہ تن گوش برآور رہتا۔نہ کوئی حرکت، نہ ہلچل، نہ اضطراب، نہ بھگدڑ، نہ شور، نہ ہنگامہ۔یوں محسوس ہوتا ''کان علی رئوسھم الطیر''

آپ کی تقریر میں بے ساختگی، روانی، بے تکلفی اور تسلسل کے ساتھ معانی کا بحر بیکراں ٹھاٹھیں مارتا ہوا محسوس ہوتا، گویا آب رواں کا سیلاب ہے جو اوپر سے نشیبی جگہ میں امڈا چلا آرہا ہے۔مضامین اور نکتہ آفرینی ایسی، جیسے سامنے کتاب کھلی ہو، جسے آپ بغیر اٹکے، جھجکے، رُکے اور ٹھہرے روانی کے ساتھ پڑھتے چلے جارہے ہیں۔موقع بہ موقع سبق آموز حکایات ولطائف، حقائق ومعارف، متکلمانہ استدلات اور عارفانہ نکات ان سب پر مستزاد، جن سے لذت گفتار دوچند اور شیرنی بیان دوبالا ہو جاتی۔

دارالعلوم دیوبند کا انتظام وانصرام

مآثر ومفاخر سے آراستہ آپ کی حیات مستعار کا ایک امتیازی پہلو، دارالعلوم دیوبند کا انتظام واہتمام ہے ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' شرافت ونجابت کے ساتھ، حلم وبردباری، چشم پوشی، تواضع وانکساری، دیانت وامانت، دارالعلوم کے تئیں

دردمندی ودل سوزی، فتنہ وفساد سے آپ کی طبعی دوری، یکسوئی وگوشہ گیری، اساتذہ ومشائخ کے تعلق سے قابل رشک نیاز مندی، انفرادی زندگی میں سلیقہ مندی، وقت کی پابندی، علم واسباب علم سے بے پناہ دل چسپی، اہل علم کی قدردانی وحوصلہ افزائی، ذاتی محاسن محامد، کمالات وفضائل، مختلف الخیال افراد کو ساتھ لے کر چلنے کی بے نظیر صلاحیت اور اپنے فخر روزگار وقافلہ سالار دادا حضرت نانوتویؒ کے لگائے ہوئے علم دین کے پودے کو شاخ درشاخ تناور مضبوط درخت ''اصلها ثابت وفرعها فی السماء'' کا مصداق بنادینے کے جذبے سے سرشاری: یہ وہ گراں بہا خوبیاں تھیں، جن کے پیش نظر، حضرت قاری صاحبؒ کو جواں سالی میں ہی، سن رسیدہ، نرم وگرم چشیدہ اور شہرۂ آفاق اساتذہ کی موجودگی میں ۱۳۳۱ھ ـ ۱۹۲۷ء میں پہلے نائب مہتمم، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی وفات کے بعد کچھ عرصہ کے لیے قائم مقام مہتمم اور پھر ۱۲رشوال ۱۳۴۸ھ مطابق ۲۱ فروری ۱۹۳۰ء میں باضابطہ مہتمم نامزد کردیا گیا اور تادم واپسیں اس جلیل القدر منصب پر فائز اور اس کے رخ زیبا کے حسن وجمال کو دوبالا کرتے رہے۔

مدرسہ عربی دیوبند سے دارالعلوم دیوبند تک

ساٹھ سال کے اس عرصہ میں آپ نے ''مدرسہ عربی دیوبند'' کو عروج وترقی کی معراج تک پہنچایا، اسے ہم دوش ثریا بنا کر ''دارالعلوم دیوبند'' ایشیا کی عظیم ترین اسلامی درسگاہ اور جامعہ ازہر مصر کا ہم پلہ بنا کر پوری دنیا میں ''ازہر ہند'' کے نام سے متعارف کرایا۔ دارالعلوم نے اس عرصے میں ہمہ جہت ترقی کی۔ طلبہ کی تعداد میں پہلے سے کئی گنا اضافہ ہوا، ملازمین جن کی مکمل تعداد محض ۴۵ رتھی، بڑھ کر آخری دور میں ۲۵۰ رتک پہنچ گئی، تعلیمی شعبہ جات میں اضافہ ہوا، تعمیرات کہیں سے کہیں پہنچ گئیں، دارالعلوم کا تذکرہ وتعارف، جو اب تک برصغیر ہند وپاک بنگلہ دیش تک ہی محدود تھا، اس کی شہرت ونیک نامی بحر وبر، خشک وتر اور دشت وجبل کا منہ چڑاتی ہوئی، صحرائے افریقہ کے ایک

سرے سے دوسرے سرے تک، یورپ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اور روس وچین کے دارالسلطنتوں تک جا پہنچی۔ اس شہرت دوام کے پیچھے حضرت قاری صاحب کی شخصیت کا کمال علم اور جمال حلم کا جادو تھا، آپ کے دعوتی و تبلیغی اسفار تھے، علمی و تعلیمی سیمیناروں و کانفرسوں میں دارالعلوم کی مثالی نمائندگی تھی، عوام الناس سے لے کر اعلیٰ حکام و سربراہان ممالک سے ملاقات اور ان سے مؤثر گفتگو تھی۔

مولانا محبوب احمد رضوی مؤلف تاریخ دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں:

"دارالعلوم نے آپ کے زمانۂ اہتمام میں نمایاں ترقی حاصل کی۔ ۱۳۴۸ھ میں جب آپ نے انتظام دارالعلوم کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی تو اس کے انتظامی شعبے آٹھ تھے جن کی تعداد اب تیس تک پہنچ چکی ہے۔ اس وقت دارالعلوم دیوبند کی آمدنی کا بجٹ پچاس ہزار دو سو باسٹھ روپے سالانہ تھا۔ آپ کے زمانے میں تیس لاکھ تک پہنچ گیا۔

"اس وقت دارالعلوم کے عملے میں صرف ۴۵ر افراد تھے آپ کے زمانے میں عملے کی تعداد ۲۵۰ر تھی اور آپ کے آخری دور تک طلبہ کی تعداد دو ہزار سے زیادہ تھی، اسی طرح عمارتوں میں بھی نمایاں اضافہ ہوا۔ دارالتفسیر، دارالافتاء، دارالقرآن، مطبخ جدید، فوقانی دارالحدیث، بالائی مسجد، باب الظاہر، جامعہ طبیہ، دارالاقامہ جدید دو منزلہ، مہمان خانہ اور کتب خانہ کے دو جدید ہال وغیرہ جیسی عظیم الشان عمارتوں کی تعمیر و تکمیل حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب ہی کے دور اہتمام کی یادگار ہیں"۔ (۱۱)

یہ تو تھی اس ترقی کی مختصر داستان جو ظاہری طور پر دیکھنے میں آتی ہے۔ مگر باطنی اور معنوی لحاظ سے یہ ترقی کہاں کہاں تک پہنچی، اس کی روداد حضرت مولانا عبد الحق صاحب، بانی و شیخ الحدیث اکوڑہ خٹک پاکستان کی زبانی سنیے!

"حقیقت یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند نے اس زمانے میں جو عروج و ترقی حاصل کی، یہ تاج اور اس کا سہرا حضرت قاری صاحب مرحوم کی مساعی جمیلہ کے سر ہے اور

یہ ان ہی کی مخلصانہ شبانہ روز مساعی کا ثمرہ ہے کہ آج شہر شہر، بستی بستی اور قریہ قریہ جو دارالعلوم دیوبند کا فاضل، اکابر اساتذہ کا تلمیذ یا تلمیذ التلمیذ آپ کو نظر آتا ہے، یہ سب حضرت قاری صاحب کی اور ان کے خاندان کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے"۔ (۱۲)

جوہر تحریر حضرت حکیم الاسلام" نے وعظ وخطابت انتظام واہتمام، درس وتدریس اور ذاتی اوصاف وکمالات ہی کے سبب، دنیا سے خراج تحسین وصول نہ کیا، بلکہ تحریر وتالیف کے میدان میں بھی اپنے لازوال اور انمٹ نقوش، جریدہ عالم پر ثبت کیے ہیں۔

جناب مولانا عبداللہ صاحب جاوید ہاشمی لکھتے ہیں:

"درس وتدریس اور تبلیغ وارشاد کے علاوہ حضرت حکیم الاسلام قدس سرہ کی علمی وتصنیفی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ دارالعلوم کے اہتمام اور تبلیغی وتدریسی معروفیات کے باوجود تصنیف وتالیف ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ آپ کی مضمون نگاری اور انشاء پردازی کی ابتداء زمانہ طالب علمی سے "القاسم" کے صفحات سے شروع ہوئی، جب ہی سے آپ کے تحقیقی مقالے علمی حلقوں میں بہ نظر استحسان دیکھے جاتے تھے، انشاء پردازی میں آپ انفرادی حیثیت کے مالک تھے۔ ہندو پاکستان کے طبقہ علماء کے صف اول کے اہل قلم ومقالہ نگار تھے۔ ملک بھر کے موقر جریدے اور رسالے آپ کے مضامین کی اشاعت کو باعث فخر سمجھتے تھے۔ ادق سے ادق عنوانات پر لمبے لمبے مقالے اور مضامین ایک ہی نشست میں لکھ دیتے تھے آپ کی تصانیف وتالیفات اور مقالہ نگاری کا اکثر حصہ دوران سفر انجام پاتا تھا۔

"آپ کی سب سے پہلی تصنیف "التشبہ فی الاسلام" ہے جو آپ کے ابتدائی دور کی شاہ کار ہے، علمی حلقوں نے اسے بہت زیادہ پسند کیا ہے"۔ (۱۳)

مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی لکھتے ہیں:

"تقریر وخطابت کی طرح حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کا تصنیف وتالیف میں بھی

ایک خاص رنگ تھا، جس میں علم وعقل کی ہم آہنگی اور ظاہر وباطن کی یک جائی پائی جاتی تھی۔ ان کی خداداد حکمت ومعرفت، مسائل کے اسباب وعلل، اسرار وحکم، مبادی وغایات اطراف وجوانب کا احاطہ کرلیتی تھی۔ حضرت موصوف کو حسین وشیریں الفاظ میں مافی الضمیر ادا کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ دقیق ترین مسائل کو بہت ہی آسان عبارت میں ادا فرماتے تھے۔ ایسے ژولیدہ وپیچیدہ مباحث جن میں عموماً لوگ برسوں بھٹکتے ہیں اور انھیں کوئی سراغ نہیں ملتا، حضرت کا قلم حقائق رقم ایسے مباحث کو بڑی سہولت وسلاست سے حل کردیتا تھا....انھوں نے سیرت طیبہ سے لے کر مسئلہ تقدیر تک ایسے نازک مسئلے پر قلم اٹھایا مگر ان کا خاص معیاری اسلوب ہر جگہ قائم رہا۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ محض ذہن کی صناعی اور الفاظ کی میناکاری نہیں، بلکہ وہبی علوم ہیں اور ان میں ''قاسمی روح'' جھلکتی ہے''۔ (۱۴)

حضرت قاری صاحبؒ کے حکمت ریز قلم سے ایک سو کے قریب چھوٹی بڑی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ جب کہ ملک کے متعدد رسائل میں شائع ہونے والے مضامین ومقالات کی تعداد بے شمار ہے، چند ایک کتابیں درج ذیل ہیں:

۱۔خاتم النبیین ۲۔فطری حکومت ۳۔تفسیر سورہ فیل ۴۔اسلام اور فرقہ واریت ۵۔داڑھی کی شرعی حیثیت ۶۔شان رسالت ۷۔مسئلہ تقدیر ۸۔علم غیب ۹۔دین وسیاست ۱۰۔اسباب عروج وزوال ۱۱۔الاجتہاد والتقلید ۱۲۔اصول دعوت اسلام ۱۴۔عرفان عارف (مجموعہ کلام) ۱۵۔علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج (۱۵) ۱۶۔اسلامی مساوات۔

مذکورہ بالا سطور میں حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی ہشت پہلو شخصیت کے چند ایک گوشوں سے اختصار کے ساتھ نقاب کشائی کی کوشش کی گئی ہے۔ جب کہ اس تاب ناک شخصیت کے بہت سے گوشے سپرد قرطاس نہیں کیے جاسکتے اور نہ ہی ان مختصر سطور میں ان کی گنجائش کہ ؎

سفینہ چاہئے اس بحرِ بے کراں کے لیے

یار زندہ، صحبت باقی۔ ان شاء اللہ پھر کسی موقعہ پر۔

آخر میں حضرت قاری صاحبؒ کے ظاہری و باطنی سراپے کی بابت چند ایک سطور حوالہ قرطاس کی جا رہی ہیں:

سراپائے سیرت و صورت

حضرت والا کے سراپائے باطن کی بابت بہت کچھ کہا اور لکھا گیا اور بہت سوں نے لکھا اور بیان کیا ہے۔ مگر جیسا مختصر، جامع اور مکمل ترین سراپا عارف باللہ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی علیہ الرحمہ نے بیان فرمایا ہے، شاید اس سے بہتر سراپا بیان نہیں کیا جا سکتا۔ فرمایا:

"جملہ بزرگان و اکابر جماعت دارالعلوم دیوبند کی، کمال علم عرفان، حسن فکر و عمل، مکارم اخلاق و اخلاص، موثر ترین تقریر و خطابت، حقائق آفریں تحریر و کتابت اور صلاح و تقویٰ کی تمام خصوصیت کو حق تعالیٰ نے حضرت مولانا محمد طیب صاحب کی ذات گرامی میں جمع فرما دیا ہے۔

آج اگر کوئی زمانہ ماضی کے جملہ بزرگان و اکابر دارالعلوم دیوبند کو دیکھنے کی آرزو رکھتا ہو تو وہ حضرت مولانا محمد طیب صاحب کو دیکھ کر اپنی اس پاکیزہ آرزو کی تکمیل کر سکتا ہے"۔(۱۶)

جناب مولانا شاہین جمالی نے، حضرت قاری صاحب کے سراپائے ظاہر کی تصویر کشی ان الفاظ میں بہت خوب کی ہے:

"گداز دودھیا بدن حسن یوسف کی طرح جلوہ فگن، متوسط قد و قامت جسمانی و روحانی حسن و وقار کی علامت، پاک و صاف سینہ، علم و فضل کا سفینہ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں حکمت و دانش کی دو گہری جھلیں، آنکھوں کے حلقوں پر سیاہ سفید بھوؤں کی کمان تیرگی شام میں نمود سحر کا اعلان، چوڑی تابناک پیشانی خدا کے حضور سر بہ سجود

رہنے کی نشانی، روشن چہرہ بدر وہلال نیز آفتاب وماہتاب، چہرے کے دائرے میں مشرع سفید داڑھی آئینہ جمال پر بزرگانہ جلال کی مینا کاری، سر پر عالمانہ ہیئت کے کٹے ہوئے سفید بال اور اس پر انچی دیوار کی دوپلی طیب کیپ گویا ''ولہ الجوار المنشآت فی البحر کالاعلام'' بدن پر موسم کے مطابق سرد وگرم فرسٹ کلر کی شیروانی نزاکت ونفاست کی کہانی، بیش قیمت کپڑے کا لمبا کرتہ اور گول مہری کا پاجامہ، تراش خراش اور لباس میں بزرگی کا خبر نامہ۔'' (۱۷)

سانحۂ حیات آخر میں حضرت والا کی آخری زندگی کا سب سے سنگین سانحہ نذر قارئین ہے، جس کے غم نے انھیں نڈھال بنادیا اور جس کا رنج والم لیے وہ اس دار فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گئے۔ درحقیقت یہ دور، سخت قسم کی آزمائش اور ابتلا کا تھا، جس پر صبر یعقوبؑ کی توفیق خاص بندگان خدا ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ حضرت قاری صاحب ان سب روح فرسا حالات پر صبر کا دامن مضبوطی سے تھامے رہے، کبھی نہ حرف شکایت زبان پر لانا گوارہ کیا اور نہ اپنے معاندین کا برا چاہا۔

دورِ ابتلا میں کیا کچھ نہ قاری صاحب کو کہا گیا، اس کی داستان حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب مدظلہ کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''مرحوم سے متعلق غلط پروپیگنڈے، تہمت تراشی، افترا پردازی مکر وفریب اور ظلم وستم کی ایک سیاہ تاریخ ہے۔ اصلاح دار العلوم کے عنوان سے ہرنا کردنی کردنی اور ہر ناگفتنی گفتنی کرلی گئی۔ اجلاس صد سالہ کے بعد یہ پورا دور اس مظلوم شخصیت کے ساتھ چیرہ دستیوں اور مظالم سے بھرا ہوا ہے۔ تحریر وتقریر، تصنیف وتالیف، پمفلٹ، رسالے، اخبار، جرائد، نثر ونظم کے وہ زہر آلود تیر چلائے گئے کہ بے کسی وبیچارگی، بے بسی اور درماندگی ہچکیوں سے رونے لگی۔ مرحوم نے یہ پورا دور صبر وضبط، تحمل وبرداشت سے گزار کر سیدنا عثمان غنی کی تاریخ دہرادی۔ کیا مجال کہ زبان کو غیبت سے آلودہ کیا ہو۔ یہ ہرگز نہ ہوا کہ اپنے دشمنوں کے حق میں کلمۂ خیر کے سوا

کوئی نازیبا بات ان کی زبان پر آئی ہو۔ جب افترا پردازیوں کا شباب تھا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے صبر، سکوت اور استغناء کو اپنا لیا اور لاریب انہی عناصر پر جان، جان آفریں کو دی۔" (۱۸)

سفر آخرت اپنے دور کے اس "عثمان مظلوم" کی روح پاک ۶ رشوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷ رجولائی ۱۹۸۳ء یک شنبہ دوپہر ٹھیک گیارہ بج کر پانچ منٹ پر، اٹھاسی سال کی عمر میں مالک حقیقی کی جانب پرواز کر گئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

نماز جنازہ شب گیارہ بجے بعد نماز عشاء "احاطہ مولسری" میں ادا کی گئی۔ اس مرد صالح کی نماز جنازہ میں دسیوں ہزار دیو بند و بیرون دیو بند کے سوگواروں نے شرکت کی (العالم الهند الفرید شیخ المقری محمد طیبؒ، حضرت الاستاذ مولانا نور عالم خلیل امینی زید مجدہم، ص: ۱۰۵) حالاں کہ راقم سطور نے متعدد حضرات سے بہ گوش خود بارہا سنا کہ قاری صاحب کی وفات ۶ رشوال کو ہوئی، جب دیو بند، طلبہ واساتذہ جن کے دم قدم سے اس کی رونق قائم ہے، سے بالکل خالی تھا۔ مگر نہ معلوم کہاں سے لوگوں کا سیلاب اُمڈا چلا آیا یوں لگ رہا تھا کہ زمین اگل رہی ہو اور پھر تدفین کے بعد چشم زدن میں اژدحام بالکل ختم، گویا زمین نگل گئی ہو۔

اس طرح حضرت قاری صاحبؒ کی عند اللہ مقبولیت کا بھرپور نظارہ نگاہوں نے ایک بار پھر دیکھا و العبرۃ بالخواتیم.

مسک الختام شخصیت حضرت حکیم الاسلامؒ کی وفات کسی ایک عالمِ دین، عبد صالح، سحر البیان خطیب، باکمال مؤلف، نیک نام منتظم اور نرم خو، صلح جو اور خوش خلق انسان کی موت نہیں، بلکہ آپ کی وفات پر اسلاف کے عہد زریں کا خاتمہ ہوا، تقدس مآب سلسلہ اکابر اختتام پذیر ہوا اور وہ انسانی اقدار و اسلامی روایات ختم ہو گئیں، جو حضرات اکابر کی امانت، ہماری جماعت کا سرمایہ اور فقر شعار بزرگان دین کا ورثہ تھا۔

’’اب اس دور کا بالکل خاتمہ ہو گیا ہے، جو شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، علامہ العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی، اور مجاہد اسلام مولانا حسین احمد مدنی کی یادگار تھا۔ ان کی ذات ان اکابر کی نہ صرف بقیۃ السلف نشانی تھی، بلکہ ان کی ذات میں ان تمام اکابر و اساطین دیوبند کی نسبتیں جمع تھیں۔

’’الغرض وہ اپنے جامع الصفات اکابر و اسلاف کے کمالات و محاسن، نجابت و سعادت، شرافت و وجاہت، فضل و کمال، اخلاق و شرافت، وقار و تمکنت، فکر و اصابت، تواضع و قناعت کا ایک پیکر جمیل اور دیوبند کی اعلیٰ روایات کا ایک مرقع اور ظاہری لطافت و نظافت اور حسن و پاکیزگی کا ایک مجسمہ تھے۔ ان کا ماتم ان سب صفات کا ماتم ہے، پوری قوم اور پوری ملت کا ماتم ہے، دنیائے علم و فضل کا ماتم ہے، درس گاہوں اور خانقاہوں کا ماتم ہے‘‘۔ (۱۹)

اخلاص نیت کے ساتھ دعا ہے کہ حق تعالیٰ حضرت قاری صاحب کو جنت الفردوس میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی ہم نشینی سے شرف یاب کرے۔ آمین۔

حواشی

۱۔ نقش دوام، مؤلفہ: حضرت مولانا محمد انظر شاہ صاحب زید مجدہم ص:۴۸، حاشیہ۔ ۲۔ بڑوں کا بچپن، ص:۱۲۸۔ ۳۔ ذکر طیب، ص:۱۹۹، تالیف: حافظ محمد اکبر شاہ بخاری۔ ۴۔ بڑوں کا بچپن، ص:۱۲۹۔ ۵۔ ماہ نامہ الرشید ساہیوال، ماہ شوال، ذی قعدہ ۱۴۰۳ھ۔ ۶۔ حوالہ مذکورہ۔ ۸۔ ذکر طیب، ص:۱۲۹۔ ۹۔ ماہنامہ البلاغ، کراچی۔ ۱۰۔ ماہ نامہ بینات کراچی ۱۹۸۳ء۔ ۱۱۔ تاریخ دار العلوم دیوبند۔ ۱۲۔ ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک، بابت ماہ اگست ۱۹۸۳ء۔ ۱۳۔ ماہنامہ الرشید مدنی و اقبال نمبر۔ ۱۴۔ ماہنامہ بینات کراچی۔ ۱۵۔ اس کتاب کا شستہ و شگفتہ معیاری و ٹکسالی عربی ترجمہ، گرامی عزت حضرت الاستاذ مولانا نور عالم خلیل امینی مدظلہ کے قلم سے پہلے ’’الداعی‘‘ میں بالاقساط شائع ہوتا رہا اور اب نہایت دل کش و دیدہ زیب طباعت کے ساتھ کتابی شکل میں منظر عام پر آ گیا ہے۔ ۱۶۔ مکتوبات حکیم الاسلام، ص:۳۲۔ ۱۷۔ حوالہ بالا، ص:۳۰۔ ۱۸۔ لالہ و گل، ص:۱۲۹۔ ۱۹۔ ماہ نامہ الحق، پاکستان، ص:۲۷۷۔ ۲۸۱، مولانا سمیع الحق صاحب

روح طیب الوداع، السلام

مولانا ڈاکٹر طاہر الاسلام صاحب قاسمی دیوبندی رمقیم حال سعودی عرب

آج تو قاسم و امداد سب ہی مرتے ہیں ❁ اس کا کیا ذکر کہ برباد ہوئے تم یا ہم

دل و دماغ کی تمام قوتیں مفلوج، عقل و خرد کی تمام دانائیاں ماؤف، احساس وشعور کی کائنات مسلوب، تحریر و انشاء کی تمام صلاحیتیں مفقود، حواس پر بدحواسی طاری، خیالات منتشر، افکار و خواطر پریشان، معانی الفاظ و تعبیر کا لباس کھوئے ہوئے کلمات جیسے بے مزا و بے روح، زمین و آسمان آہوں سسکیوں اور کراہوں سے سہمے ہوئے آنکھیں نمناک و خوں بار، آنسوؤں کی جھڑی سے دنیا کی ہر چیز دھندلی دھندلی، اعضاء و جوارح ٹوٹے ہوئے، ہمتیں اور عزائم جواب دیئے ہوئے، روشنائی جیسے رنگ و وضاحت سے محروم، قلم رعشہ و لرزہ کی زد میں، اردگرد اور پورا ماحول تاریک اور دھوا دھواں!!! ایسے میں ۱۷ جولائی کو دن کے گیارہ بجے حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ کی وفات کا جو سانحہ پیش آچکا ہے اس کی سنگینی کو بیان کیا جائے تو آخر کیسے؟ اس پر اظہار سے قلم کا سینہ شق ہو جائے، انگلیاں شل ہو جائیں، پہاڑوں کی جڑیں اکھڑ جائیں دریا اور سمندر اپنی روانی کھو بیٹھیں، زمین و آسمان کی طنابیں کھنچ جائیں، یہ آفتاب و ماہتاب اور ستارے بے نور ہو جائیں!

کون کہتا ہے کہ مہتمم دارالعلوم مولانا قاری محمد طیب صاحب وفات پا گئے! نہیں، آج حاجی امداد اللہ وفات پا گئے۔ مولانا نانوتوی رخصت ہو گئے، حضرت گنگوہی نے پردہ فرما لیا، حکیم الامت تھانوی اٹھ گئے، علامہ شبیر عثمانی اور علامہ انور شاہ کشمیری رحلت فرما گئے۔

یہ جھوٹ ہے کہ صرف نسبتِ طیب ہم سے چھن گئی نہیں یہ تمام نسبتیں اور ان نسبتوں کے تمام علوم و فنون فضائل و کمالات، محامد و محاسن ہم سے چھن گئے۔ لاریب!

یہی نسبت طیب ہی تنہا وہ گلدستۂ واحد نسبت تھی جس میں یہ تمام نسبتیں سمٹ آئی تھیں، بلاشبہ! یہ ذات طیب ہی تنہا وہ گلستۂ حقیقت تھی جس میں ہر رنگ و بو اور ہر گلشن و چمن کے پھول چن چن کر حق تعالیٰ نے جمع کر دیئے تھے:۔

لیس علی اللہ بمستکر ❁ ان یجمع العالم فی واحد

اخبار و رسائل، مجلدات و جرائد ضمیمے شائع کر رہے ہیں، ملک کے گوشے گوشے میں تعزیتی جلسے ہو رہے ہیں، ایصالِ ثواب کی محفلیں منعقد ہو رہی ہیں۔ دنیا کے ریڈیو اسٹیشن اعلان کر رہے ہیں، کائنات کا ذرہ ذرہ چیخ رہا ہے کہ افتابِ عالم گہنا گیا ہے یعنی پورا عالم موت کی آغوش میں سو گیا ہے۔ اک شور بپا ہے کہ حکیم الاسلامؒ رخصت نہیں ہوئے بلکہ مکارم الاخلاق، فضائل انسانیت، علم و فن، تفقہ و بصیرت، ذہانت و ذکاوت، فہم و فراست، حسن بیان و زور و بیان، معیاری خطابت، متکلمانہ اسلوبِ تحریر، فلسفہ و حکمت، شریعت و طریقت، انابت و خشیت، انکساری و تواضع، ایمان و یقین، ایقان و اطمینان، صبر و شکر، استغناء و قناعت، حلم و تحمل، شجاعت و شہامت، بیباکی و حق گوئی، خود سپردگی اور مظلومیت غرض حسنِ صورت و حسن سیرت کے تمام رموز و نکات، دور و لآلی، نگینے اور موتی بے تمام و کمال رخصت ہو گئے، داغِ مفارقت دے گئے!! انا للہ و انا الیہ راجعون!۔ یہ شور ذرا کم ہوتا ہے اور میں بے خودی کی دنیا سے عالم ہوش و حواس کی طرف واپس آتا ہوں تو سوچنے لگتا ہوں کہ میرے حضرتؒ تو ایک عہد تھے کیا یہ فنا ہو سکتا ہے؟ میرے مرشدؒ تو ایک تاریخ تھے کیا تاریخ پر زوال آسکتا ہے؟ میرے مربیؒ تو مجموعۂ حسنات تھے میرے استاذؒ کی حیات مبارکہ اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دوام نہیں!؟۔

گریۂ غم کے بادل چھٹتے ہیں دھندلاہٹ ختم ہوتی ہے تو میری آنکھیں صاف طور پر دیکھتی ہیں کہ کفر و طاغوت میں شادیانے بج رہے ہیں بولہبی و بوجہلی قہقہے لگا رہی ہیں، ابلیس کی مجلس شوریٰ منعقد ہے اور مجلس کا ہر فرد بغلیں بجا رہا ہے ریا و منافقت کے ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا ہے، ضلالت و گمراہی مسکرا رہی ہے بدعات و خرافات سر ابھار رہی ہیں،

اسلام دشمن عناصر اور کیونسٹ طاقتوں کے یہاں گھی کے چراغ جل رہے ہیں مٹھائیاں تقسیم ہو رہی ہیں۔ مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ ؎

درمیانِ کارزارِ کفر دیں ❁ ترکش مارا خدنگ آخریں

حق و باطل اور کفر و ایمان کے معرکہ میں ہمارے ترکش کا آخری تیر بھی کام آچکا ہے اور موت اپنی اٹل حقیقت ہم سب سے تسلیم کرا چکی ہے! آستانہ قاسمی پر ایک ہنگامہ بپا ہے، پرسہ دینے اور تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے اور نہ جانے کب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا، میں دھڑکتے دل اور بہتی آنکھوں کے ساتھ سوچ رہا ہوں کہ پرسہ دوں تو کسے؟ تعزیت کروں تو کس سے؟ میں سمجھتا ہوں کہ مولانا سالم و اسلم و اعظم اور ان کی اولاد و احفاد ہی محض دلاسہ کے مستحق نہیں ہیں بلکہ ملت کا ہر ہر فرد آج تعزیت کا مستحق ہے، پرسہ کا محتاج ہے، حضرت حکیم الاسلامؒ نائب رسول تھے، وارث نبی تھے جس طرح رسول کا فیضان بھی عام تھا اسی طرح حضرت سے محرومی کے دلاسہ کے محتاج ہیں۔

ایک بات میں آپ سب کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اب تو زیادہ سے زیادہ ایصال ثواب اور دعاؤں کے محتاج ہیں بلکہ اس لیے کہ حضرت کی روح مبارک ہماری جانب متوجہ رہے اور پھر ع

سجدوں سے اور بڑھتی ہے رفعت جبین کی

دوسرے حضرتؒ اپنی تمام عمر زندگی کی آخری سانس تک جس مشن کو چلاتے رہے ہمیں بھی عہد کر لینا چاہئے کہ ہم بھی اپنی بقیہ زندگی اسی مشن کے لیے زندہ رہیں گے اور اسی کے لیے جان دیں گے"۔

ان شاء اللہ! اور اے حکیم الاسلام! ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ آپ اپنے مشن کے تئیں اپنے غلاموں میں کوئی کمزوری کاہلی ہرگز نہیں پائیں گے۔ ان شاء اللہ!

اے روحِ طیب الوداع ❁ السلام الوداع، السلام!!

❁❁❁

حکیم الاسلام ایک شخصیت ایک تأثر

(از: اظہر صدیقی صاحب جرنلسٹ

اتوار ۱۷؍جولائی ۸۳ء آج دیوبند کی فضا بظاہر پرسکون تھی، زندگی معمول کے مطابق تھی، کاروبار حسبِ سابق جاری تھے، ماحول پر ایک سکوت کی سی ایسی کیفیت طاری تھی جو کبھی کبھی اداسیاں اور مایوسیاں لاتی ہے۔ لیکن کوئی دل اور کوئی ذہن اس حادثہ فاجعہ سے باخبر نہ تھا۔ خود حضرت حکیم الاسلام حسبِ معمول کے مطابق صبح سویرے بیدار ہو کر نماز اور تلاوتِ کلام پاک سے فارغ ہوئے اور پھر حسب معمول مطالعہ کتبِ حدیث میں تھوڑی دیر مشغول رہے۔

اس کے بعد زندگی کے دوسرے معمولات ناشتہ وغیرہ سے فراغت ہوئے۔ لوگ حضرت کے پاس آتے رہے حضرت سب سے اسی خوشگوار شفقت آمیز اور محبت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ گفتگو فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ دو معصوم بچے بھی حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت نے ان کو بہت دعائیں دیں اور فرمایا کہ جب دوبارہ آؤگے تو میں تمھیں الماری میں سے ایک چیز نکلوا کر دوں گا، اس وقت کوئی آدمی ایسا موجود نہ تھا جو یہ خدمت انجام دے سکتا۔ اس طرح اور لوگ آتے رہے باتیں ہوتی رہیں۔

کسی کو وہم وگمان بھی نہ تھا کہ آج دیوبند کے افق پر جو سورج نکلا ہے وہ پوری ملتِ اسلامیہ، پوری انسانیت اور علمی وروحانی، مذہبی واخلاقی حلقوں کے لیے ایک نقصانِ عظیم ایک دردناک حادثہ اور روح فرسا غم والم کا پیغام لے کر آیا ہے۔

ایسا غم جس کی کسک صدیوں تک محسوس کی جائے گی۔ ایسا نقصان جس کی تلافی کی کوئی امید بظاہر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ کون جانتا تھا کہ جماعتِ دیوبند پر حسرت والم اور درد وکسک کا ایک پہاڑ ٹوٹنے والا ہے جس کا اثر سینکڑوں سال تک محسوس کیا جائے گا، ایسا سانحہ پیش آنے والا ہے جس کو سننے کے لیے کسی کے کان آمادہ نہیں

تھے۔کوئی دل کوئی ذہن کوئی شور کوئی وجدان کوئی دماغ قبول کرنے پر تیار نہیں تھا، ایک ایسا حسرت آمیز اور یاس انگیز سانحہ جو تاریخ کے سینۂ بریاں پر عرصہ تک ایک خونچکاں زخم کی شکل میں موجود رہے گا۔ رستا رہے گا، درد اور کسک پیدا کرتا رہے گا، ملتِ اسلامیہ اپنی حرماں نصیبوں، حسرت ناکیوں اور الم انگیزیوں پر خون کے آنسو روتی رہے گی اس اندھیرے میں بھٹکتی رہے گی جو اک شمع فروزاں اور ایک چراغ ضوفشاں کے گل ہوجانے کی وجہ سے پیدا ہوگیا ہے۔ ملت کے افق پر اس کی صفوں میں اور اس کے پورے علمی، مذہبی، ملّی، دینی ماحول پر ایک مہیب سناٹا چھا گیا ہے۔ ایک ایسا سناٹا جس کا تصور بھی لرزہ خیز تھا، دل، دماغ اور روح کو انتہائی رنج الم میں مبتلا کرنے والا تھا، ایک پُر ہول خاموشی، سکوت، اداسی اور حسرت ناکی۔! امت کا سر پرست ہزاروں علمی قافلوں کا سالار لاتعداد علمی و تعلیمی مرکزوں کا روح رواں رخصت ہوگیا۔ اور اب فضائیں اداس ہیں، ماحول خاموش ہے اور پوری کائنات کہہ کر تڑپ رہی ہے، بلک رہی ہے، کہ ؎

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی ❁ اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

دس بج کر ۵۵ منٹ پر حکیم سید محمود علی صاحب (حضرت کے معالج) آئے تو حضرت حکیم الاسلام نے اپنی مخصوص شفقت و مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا کہ آپ تو مقامی ہوتے ہوئے بھی غیر مقامی ہوگئے آپ سے ملاقات ہی نہیں ہوتی حکیم صاحب نے معذرت کے ساتھ احوال دریافت کئے تو آپ نے جواب دیا کہ آج تو میری طبیعت بہت اچھی ہے آپ کے علاج سے کافی افاقہ ہوا ہے البتہ رات تنفس کی شکایت ہوگئی تھی یہ باتیں ہورہی تھیں، مولانا سالم صاحب مولانا اسحاق صاحب، سید اعجاز حسن صاحب، مفتی اعظم مولانا احمد علی سعید صاحب وغیرہ بھی موجود تھے، حسبِ دستور تسبیح ہاتھ میں تھی کہ اچانک حضرت نے دونوں ہاتھ اوپر کی طرف اٹھائے جیسے نماز کی نیت باندھ رہے ہوں۔ یا بارگاہِ رب العزت میں دعا کر رہے ہوں زبان کو حرکت ہوئی کلمہ شہادت پڑھا، کچھ ہلکی سی تشنج کی سی کیفیت محسوس ہوئی حکیم صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھا۔ مولانا سالم صاحب نے سورہ

یٰسٓ شریف پڑھنی شروع کی کہ۔اچانک وہ نبض رک گئی بند ہوگئی، جس کی دھڑکن کے ساتھ لاکھوں دلوں کی دھڑکنیں وابستہ تھیں اور ایک عظیم و بے مثال قافلۂ علم وعمل رواں دواں تھا اور زہد وتقویٰ رشد وہدایت علم وتفقہ اور اخلاق وشرافت کا ایک بحرنا پیدا کنار جاری تھا۔ اچانک ساکت ہوگیا۔حکیم صاحب دم بخود رہ گئے۔تاریخ کا ایک باب ختم ہوگیا، درخشاں، تابناک روشن اور منور باب۔!ایک کہانی ختم ہوگئی جس کے ہر رخ اور ہر حصہ میں زندہ حقائق کی تابنا کیاں جلوہ فرما تھیں۔

حکیم الاسلامؒ کی نبض ڈوبنے کے ساتھ ایسا محسوس ہوا جیسے پوری کائنات کی رفتار تھم گئی ہو ع

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبض کائنات

آسمان کی طرف سے شبنم افشانی

یہ حقیقت ہے جس میں مبالغہ کا ادنیٰ سا شائبہ بھی نہیں ہے کہ حضرت حکیم الاسلام کی وفات کے دن سے کئی روز پہلے سے دیوبند کیا بلکہ بہت سی جگہوں پر گرمی بلا کی شدت اور نا قابل برداشت قسم کی ہورہی تھی گرمی کی شدت اور تمازت سے جسم تو جسم لوگوں کے دماغ ودل بلکہ روح بھی کھولتی ہوئی محسوس ہورہی تھی ہر شخص گرمی کی اس شدت کی وجہ سے پریشان تھا بے چین اور بے قرار تھا۔لیکن گیارہ بج کر دس منٹ پر جیسے ہی حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب کی روح مبارک دار فانی سے رخصت ہوئی ماحول ایک دم بدل گیا موسم تبدیل ہوگیا اور آسمان نے اپنے خالق حقیقی کے ایک سچے اور بے ریا ولی کامل کے سانحہ پر اشک افشانی بلکہ شبنم افشانی شروع کی جنت کی ٹھنڈی ہوائیں، بھیگی فضائیں اور ہلکی ہلکی بوندیں ماحول کی کھولتی ہوئی کیفیت کو ختم کردینے کا فرض انجام دے رہی تھیں جس وقت جسدِ مبارک دیدار کے لیے گھر سے باہر لایا گیا اس وقت بھی بوندیں پڑیں۔گویا زمین والوں کے آنسوؤں میں آسمان بھی شریک ہوگیا ۱۱ بج کر دس منٹ پر جیسے ہی حضرت حکیم الاسلامؒ کا سانحہ ارتحال پیش آیا دیوبند کے اس سرے

سے اس سرے تک ہر طرف سے سسکیوں، چیخوں، کراہوں اور رنج وغم کی اُداسیوں کی ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ کاروبار بند، دوکانیں مقفل، تعلیمی وسماجی ادارے ماتم گر اور خاموش، مرد اور عورتیں تو اپنی جگہ لیکن معصوم بچوں میں بھی عجیب درد انگیز تاسف آمیز اور حیرت انگیز منظر اس سے پہلے نہیں دیکھا۔

جنگل کی آگ کی طرح سارے قصبے بلکہ آس پاس کے دیہات میں یہ روح فرسا خبر پھیلتی چلی گئی اور لوگ دیوانہ وار آستانہ قاسمی پر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ حضرت مولانا سالم صاحب کے چہرہ پر اداسی اور غم ودرد کی نہایت حسرتناک کیفیت موجود تھی لیکن وہ انتہائی صبر وضبط اور استقلال وہمت کے ساتھ ان تمام لوگوں کو تسلی دینے کی کوشش کر رہے تھے جو اس حادثۂ عظیم پر بے قراری کے ساتھ رو رہے تھے۔ کوئی سبک سبک کر رو رہا تھا، کوئی ضبط کی حدوں سے تجاوز کر کے کس قدر آواز سے تڑپ تڑپ کر آنسو بہا رہا تھا مولانا محمد اسلم صاحب تصویر یاس والم بنے ہوئے تھے بار بار اپنے والد ماجد کے چہرۂ مبارک کو بوسہ دیتے اپنا سر انکے پلنگ کی پٹی پر رکھ کر دیر دیر تک روتے پھر سر اٹھاتے اور تھوڑی دیر تک ٹکٹکی باندھ کر چہرۂ مبارک کا دیدار کرتے رہے۔ ایسے بیشمار نوجوانوں اور ضعیف العمر آدمی اس موقع پر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے جن کی قوت برداشت اس سے پہلے کبھی بڑے بڑے حادثہ پر بھی متاثر ہوتے ہوئے نہیں دیکھی گئی تھی۔

مولانا علامہ رفیق اور شیخ الحدیث وقائم مقام مہتمم (وقف) دار العلوم دیوبند جیسے پختہ کار اور بہادر لوگ بھی اپنے اوپر قابو رکھنے پر قادر نہ تھے۔ لوگ آرہے تھے حضرت کا دیدار کر رہے تھے اور صرف اس لیے ایک طرف سے آکر دوسری طرف سے نکل رہے تھے۔ تاکہ سب کو زیارت کا موقع مل جائے سوگواروں کا مجمع لمحہ لمحہ بڑھتا جارہا تھا عورتیں، بچے، مرد، نوجوان سب بلک رہے تھے۔ سسکیوں اور ہچکیوں کی آوازیں پورے گھر بلکہ علاقہ میں سنائی دے رہی تھیں۔ ابھی تک حضرت حکیم الاسلام کا جسدِ مبارک اسی تاریخ ساز اور عہد آفریں کمرہ میں رکھا ہوا تھا جہاں سے علم وعمل اور رشد وہدایت کا یہ

آفتاب و ماہتاب ساٹھ سال سے اپنی نورانی کرنیں بکھیر تا رہا اور تاریک دلوں کو ایمان ویقین اور علم وشریعت کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔

آہ! یہ وہی تاریخی مکان ہے جہاں ایک دن حضرت مولانا محمد طیب صاحب کو دولہا بنایا جارہا تھا۔ تصور کی آنکھوں میں وہ منظر گھوم رہا ہے اہاں ایک طرف استاذ الاساتذہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری، حضرت حکیم الاسلامؒ کو شادی کا جوڑا اپنے دست مبارک سے پہنا رہے ہیں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ شیروانی پہنا کر اس سعادت میں شریک ہونا باعثِ فخر سمجھ رہے ہیں۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ قدس سرہ سر پر صافہ باندھ رہے ہیں۔ عارف باللہ میاں صاحب حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ اس تقریب میں دل وجان سے شرکت فرما رہے ہیں۔ حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحبؒ اپنے دستِ مبارک سے صافہ کو مکمل فرما رہے ہیں اور پھر اسی گھر سے۔ جی ہاں اسی گھر سے۔ جس کے متعلق حضرت شیخ الہندؒ کا یہ تاریخی ارشاد مشہور ہے اور ہزاروں سینوں اور ذہنوں میں محفوظ ہے کہ:

> ’’اس گھر کا پاؤلا کتا بھی اگر ہمیں کاٹے تو ہمیں یہ حق نہیں ہے کہ ہم اس کو دھتکار دیں بلکہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کو پیار اور احترام کے ساتھ الگ کرنے کی کوشش کریں‘‘۔

وہ مقدس گھر اور اس کی تاریخ ساز اور عہد آفریں چہار دیواری آج اپنے دور کے ولیٔ کامل کے آخری سفر کی تیاریوں کا دردناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ جی ہاں اسی گھر سے اس وقت کے اولیاء کرام، مشائخ عظام علمائے کرام کا پورا قافلہ حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی بارات اپنی سربراہی میں لے کر روانہ ہوا تھا۔ زمین وآسمان، فضائیں اور در ودیوار، خوشی ومسرت سے جھوم رہے تھے۔ ہر دل مسرور تھا شادماں تھا، آج تاریخ کی یہ کیسی بے رحم کروٹ اور کیسا اندوہناک موڑ اور مرحلہ ہے کہ اسی گھر میں ہزارہا سوگوار دل، ہزارہا اشکبار آنکھیں ایک تاریخ ساز شخصیت اور جماعت دیوبند

کے ''نشان'' اور ''علامت'' کو آخری سفر پر روانہ کرنے کی تیاریاں ہوتی ہوئی دیکھ رہی ہیں۔ سارا دن لوگوں کا تانتا بندھا رہا حضرتؒ کا دیدار کرنے والوں میں وہ لوگ بھی ہیں جو حضرت کو ہمیشہ ایک مربی، ایک رہنما، ایک مرشد برحق سمجھتے تھے ایسے بھی ہیں جن کے ذہن وفکر کسی غلط فہمی کا شکار رہے تھے۔ ایسے بھی ہیں جن کے زبان وقلم اور حرکات وسکنات حضرت کے خلاف استعمال ہوتے تھے لیکن آج جس نکتہ پر سب متفق تھے وہ یہ تھا کہ حضرت حکیم الاسلام کی شخصیت۔ آخری درجہ کے مقدس ومحترم بزرگ اور ملت اسلامیہ کے عظیم ترین فرد کی شخصیت ہے۔ بقول حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی جماعت دیوبند کا تو وہ نشان اور امتیاز اور علامت تھے۔ مسلک دیوبند کی آبرو تھے، علمائے حق اور حضرت نانوتویؒ کی نسبتوں اور علوم ومعارف کے امین تھے۔

رات کے تقریباً ۱۱ بجے جنازہ مکان سے باہر لایا گیا ہجوم اتنا زیادہ ہو چکا تھا کہ اس کو کنٹرول کرنا مشکل ہو رہا تھا سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح مجمع کی اس کثرت پر قابو پا کر جنازہ کو باہر لایا جائے اور نماز وتدفین کے لیے لے جایا جا سکے گا۔...........

کیوں کہ مجمع اتنا تھا کہ قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ اور ہر شخص کی خواہش تھی کہ وہ جنازہ کو کندھا دینے کی سعادت سے محروم نہ رہ جائے اسی خیال سے چارپائی میں لمبے لمبے بانس لگا دیئے گئے تھے مگر پھر بھی مجمع کی کثرت اژدہام کسی صورت نظم قائم کرنے نہیں دے رہا تھا۔

کسی نہ کسی طرح بلکہ صحیح تر بات یہ ہے کہ اللہ کریم وکارساز کی خاص مہربانی سے مجمع کچھ سنبھلا اور بہت بڑی تعداد میں لوگ جنازہ کی نماز میں شریک ہونے کے لیے پہلے ہی دارالعلوم دیوبند کے احاطہ مولسری میں جمع ہونے لگے آستانہ قاسمی سے دارالعلوم کے احاطۂ مولسری کے درمیان بہت تھوڑا سا فاصلہ ہے لیکن اتنا فاصلہ طے ہونا بڑا بھاری مشکل کام نظر آرہا تھا۔

لوگ اِدھر سے اُدھر تک دارالعلوم کے مختلف احاطوں اور ادھر دیوان دروازہ تک

ادھر چھتہ کی مسجد کے قریب تک پھیلے ہوئے تھے۔لاؤڈ سپیکر سے اعلان کیا گیا کہ صفیں سیدھی کرلی جائیں تو لوگوں نے جہاں جہاں کھڑے تھے وہیں صفیں بنالیں۔اور پھر تھوڑی دیر بعد حضرت حکیم الاسلام کے جانشین اور خلف اکبر حضرت مولانا سالم صاحب نے نماز جنازہ پڑھانی شروع کی۔اللہ اکبر کی آواز کے ساتھ ایک زبردست سکوت چھا گیا۔ایک دردناک خاموشی طاری ہوگئی جس میں تکبیرات کی آواز کے ساتھ تھوڑا سا فرق محسوس ہوتا تھا۔

نماز ختم ہوئی تو آہوں، چیخوں اور کلمۂ طیبہ کی ملی جلی آوازوں کے ساتھ درودیوار ماتم کرتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔تقریباً ایک گھنٹہ دارالعلوم سے قبرستان قاسمی تک پہنچنے میں لگا نماز جنازہ میں شریک ہونے والوں کی تعداد تقریباً دس ہزار تھی۔

عجیب رقت انگیز منظر تھا کہ ہر شخص درد وکرب کے ساتھ جنازہ کو کاندھا دینے کی کوشش کررہا تھا اکثر لوگوں کی بے ساختہ چیخیں نکل رہی تھیں۔

بارہ بجے کے قریب جنازہ قبرستان پہنچا۔ہجوم کو کچھ لوگوں نے کنٹرول کرنے کی کوشش کی اور خدا کی مدد سے کچھ ایسا نظم قائم ہوگیا کہ ہر شخص بآسانی مٹی دینے میں شریک ہوگیا۔رات کا نصف حصہ گذر چکا تھا۔آج علم وعمل رشد وہدایت اور اخلاق وشرافت کے ایک آفتاب درخشاں کو زمین کے اندر رکھ کر اللہ تعالیٰ کے حوالہ کردیا گیا،اس کی رحمتوں کی آغوش میں دیدیا گیا اور ہر شخص نمناک آنکھوں ڈوبتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے دعائے مغفرت کرتے ہوئے واپس آرہا تھا۔ہر ہر قدم پر ایسا محسوس ہورہا تھا کہ ہم سب ایک قیمتی خزانہ،ایک گراں مایہ جوہر اور آفتابِ درخشاں سے محروم ہوگئے۔

فرصت ملے تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم ❁ تو نے یہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

❁❁❁

بیسوی صدی کی عظیم شخصیت قاری محمد طیب صاحبؒ

مولانا ڈاکٹر عبید اقبال عاصم قاسمی رعلی گڑھ

اب سے بیس برس قبل جن حضرات نے دیوبند میں جولائی کا مہینہ گزارا ہے ان کے اس مہینہ کی ۱۷ رتاریخ کی جسم جھلسا دینے والی گرمی اور انتہائی حبس کا عالم ابھی تک نظروں کے سامنے ہوگا۔ اس ماہ کی سترہ تاریخ کی صبح کا وہ سخت ترین گرم موسم کہ جس میں کپڑے جسم کو لہولہان کررہے تھے۔ ہوا کا گویا گزرہی بند تھا۔ صبح میں یہ عالم تھا۔ دس بجے تک تمازت اپنی شدت کو پہنچ چکی تھی اور معلوم ہورہا تھا کہ جیسے سورج سوا نیزہ پر آنے کا دن آج ہی مقرر ہوا ہے۔ پورا قصبہ معمول کے مطابق گرمی کی سختی پر تبصرہ کررہا تھا۔ آہ وفغاں ہر شخص کے دل سے نکل رہی تھی۔ معلوم نہیں کہ یہ کس قیامت کا پیش خیمہ تھا۔ کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہ وقت کسی عظیم شخصیت کی جانکنی کا ہے، تقریباً سوا یا ساڑھے گیارہ بجے میں نے کسی صاحب کو بھاگتے ہوئے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ''مہتمم صاحب کا انتقال ہوگیا'' ابھی اس کی تصدیق وتکذیب یا اس شخص کے اول فول بکنے پر کوئی تبصرہ ہوتا جامع مسجد کے مائیک سے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے انتقال کا اعلان ہوا تھا۔ اعلان تھا یا دھماکہ جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ جو کوئی جس حالت میں بھی تھا اسی حالت میں طیب منزل کی طرف بھاگا ہوا جارہا تھا۔ گرمی کی شدت کا احساس ہی نہیں رہا تھا وہ سب تبصرے جو دس منٹ قبل گرمی کی زیادتی پر ہورہے تھے نسیا منسیا ہوگئے تھے، اور واقعتاً طیب منزل تک پہنچتے پہنچتے ہوا کے وہ خوشگوار جھونکے آنے شروع ہوگئے کہ سب کی یاد حافظہ میں تاہنوز ویسی ہی موجود ہے۔ ایسا محسوس ہورہا تھا گویا کہ جنت کے دریچے کھل گئے ہوں۔ جن سے سرد ہوائیں چھن چھن کر آرہی ہوں شام ہوتے ہوتے موسم کتنا خوشگوار ہوگیا اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا، راقم اس

میں کوئی مبالغہ نہیں کر رہا ہے الحمداللہ باشندگان دیوبند کی کثیر تعداد اس سہانے موسم کی چشم دید گواہ ہے کہ سترہ جولائی ۸۳ء کے بعد کی رات میں سرد ہواؤں سے بچنے کے لیے رضا ئیوں کا سہارا لینا پڑا تھا۔

میں جب بھی قاری محمد طیب صاحب کی زندگی کے بارے میں کچھ سوچتا ہوں تو اس دن کا یہ موسم مجھے ضرور یاد آتا ہے کہا جاسکتا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس مقبول بندے کی روح لینے کے لیے جب ملک الموت کو بھیجا تو زمین کو سانس لینے کی ہمت وحوصلہ نہیں رہا رات کے سبب موسم سخت تر ہوتا چلا گیا اور جب یہ عمل مکمل ہو چکا تو رضوان نے اللہ کے اس مقبول بندے کے استقبال کے لیے جنت کی کھڑکیاں کھول دیں جس سے اللہ کی مخلوق فیضیاب ہوئی۔

بہرحال حکیم الاسلام کی وفات سے قبل نہ تو اس قسم کی کوئی چیز مشاہدہ میں آئی تھی اور نہ ہی آج تک دیکھی گئی اس لیے اس نقش نے حکیم الاسلام کی عظمت کو مجھ جیسے سینکڑوں افراد کی نظر میں دوچند کر دیا۔ یوں تو الحمداللہ حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کی خدمت کا موقع بھی میسر ہوا، ان کی مجالس میں بیٹھنے کا اتفاق بھی ہوا۔ دو ایک دفعہ سفر میں بھی رفاقت میسر ہوئی طویل ترین خطابات، وعظ اور تذکار و نصیحت سننے کے مواقع بھی نصیب ہوئے، کچھ ڈانٹ ڈپٹ بھی سنی انہیں قریب سے بھی دیکھنے کی سعادت میسر ہوئی ان کی مظلومیت کے وہ دن بھی یادداشت میں محفوظ ہیں جب ''اصحاب جبہ ودستار'' انہیں مغلظات بکنا ''اسلام'' کی سربلندی تصور کرتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے قضیۂ نامرضیہ کا ذکر اس وقت مناسب نہیں لیکن ۲۲/۲۳ مارچ ۸۲ء کی درمیانی شب کا وہ روح فرسا منظر بھی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے جب اس دارالعلوم کے لاؤڈ سپیکر سے جس کی آبیاری انھوں نے ساٹھ سال تک کی تھی۔ انہیں دارالعلوم سے نکالنے کی ''خوشخبری'' ان غلیظ نعروں کے ساتھ ''قال اللہ وقال الرسول کی مسندوں پر فائز حضرات سنا رہے تھے کہ جن کو سننے کے لیے کان تیار نہیں تھے۔ اور بطور دلیل میں حضرات علماء

مائک سے "اذا جاء نصر الله والفتح" کی صدا بلند فرمار ہے تھے۔ دنیا کی کون سی ایسی بری گالی یا کون سا ایسا برا خطاب تھا جو اس چھیاسی سالہ بوڑھے کو نہیں دیا جار ہا تھا جو ان سب کا محسن و کرم فرما بھی تھا اور با قاعدہ استاذ بھی اور جس کی عمر صرف ایک سال تین ماہ چھبیس دن یعنی ۴۸۱ دن اس دنیائے فانی سے جانے کے باقی تھے۔ ایک طرف یہ حالت تھی اور دوسری طرف ۲۳ / مارچ کی صبح کی حکیم الاسلام کی مجلس تھی جو رات کے واقعہ سے بالکل بھی متاثر نہیں تھی۔ وہی پند ونصائح جو روز کا معمول تھے آج بھی تھے۔ وہی مواعظ حسنہ تھے، نہ تو دار العلوم کے غاصبانہ قبضہ پر کوئی تبصرہ تھا اور نہ ہی اظہار افسوس، نہ قبضہ واپس لینے کا خیال تھا اور نہ ہی کوئی سازش تانے بانے کہ جن سے یہ اثر لیا جائے کہ اس بوڑھے کے دل میں اس ادارہ میں واپسی کا خیال ہے جسے اکیلے ہاتھوں نے تین نسلوں کی عمر تک اپنے خون جگر سے سینچا تھا۔ جسے اس نے دعاء نیم شبی اور شبانہ روز کی تدابیر سے "دار العلوم" بنایا تھا اور جس کے صد سالہ اجلاس میں بظاہر نحیف ولاغر نظر آنے والی اس شخصیت کی بھاری بھر کم آواز نے دیوبند جیسے قصبہ میں ہندو بیرون ہند سے پینتیس لاکھ سے زائد افراد کو اکٹھا کر دیا تھا۔ ہندوستان میں کسی مسلم ادارہ کے نام پر جمع ہونے والا مجمع اس سے بڑھ کر نہ تو تاریخ میں ہوا اور نہ ہی مستقبل قریب میں کوئی امید۔

حکیم الاسلام کو اللہ تعالیٰ نے گوناگوں خصوصیت سے نوازا تھا۔ وہ خاندانی طور پر اپنے دادا حجۃ اللہ فی الارض مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے ظاہر و باطنی علوم کے امین تھے تو علم وفضل میں محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیری کے ممتاز ترین شاگرد روحانی وابستگی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے تھی تو دوسری طرف شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بھی کم درجہ کی عقیدت نہیں تھی طالبعلمی کے زمانے سے ہی ان کا طبعی رجحان تصوف وسلوک کی طرف مائل رہا۔ دورانِ تعلیم ہی انھوں نے اپنا تعلق شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن سے قائم کر لیا لیکن ان کا زمانہ زیادہ نہیں مل سکا تو آپ نے ان مراحل کو اپنے محبوب ترین استاذ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی معرفت طے کیا اور

جب یہ داغ مفارقت دے گئے تو آپ خانقاہِ اشرفیہ کے خوشہ چینوں میں ہو گئے جنھوں نے آپ کو دستارِ خلافت عطا فرمائی۔ تحریر و تقریر پر اللہ نے انہیں یکساں قدرت عطا فرمائی تھی۔ وہ جب تقریر کرتے تو شاعر کا یہ شعر صادق آتا کہ ؂

پھول جھڑتے ہیں دم گفتار تیرے نطق سے
علم کے سانچے میں ڈھل کر جب تو کرتا ہے کلام

اور جب کوئی تحریر سپردِ قلم فرماتے تو "دریا کو کوزہ میں بند فرما دیتے" بعد میں ان تحریروں کو پڑھا جاتا تو ان کی گہرائی گیرائی پَرت دَر پَرت معلوم ہوتی، ایک ذرا سے جملے میں صفحات کو سمو دینا حضرتؒ کی خاص شان تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاں زمانہ اور عہد کی وجہ سے اپنی اس محرومی پر افسوس ہوتا ہے کہ نہ تو ہماری آنکھوں نے شاہ ولی اللہ دہلویؒ جیسی عبقری شخصیت کو دیکھا اور نہ ہی ان کے لائق و فائق فرزند شاہ عبدالعزیز کو ہماری نگاہ شاہ اسحاق کو نہ دیکھ سکی اور نہ ہی حاجی امداداللہ مہاجر مکی کو ہم نے نہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی زیارت اور نہ ہی حاجی عابد حسین صاحبؒ کی زمانہ نے ہمیں اتنا پیچھے کر دیا کہ ہم مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا شیخ الہندؒ مولانا محمود الحسن کو بھی نہ دیکھ سکے۔ وائے محرومی محدثِ عصر علامہ انور شاہ کشمیری کا حلیہ یا مولانا خلیل احمد سہارنپوری کا سراپا بھی ہمارے ذہن میں نہیں۔ نہ ہی ہماری نگاہوں میں علامہ شبیر احمد عثمانی کی صورت ہے اور نہ ہی مولانا حسین احمد مدنیؒ کی (اللہ ان سب کی قبروں کو نور سے بھر دے۔ آمین) جہاں ان جیسے صدہا ہزارہا اکابرین کی زیارت نہ کرنے کا افسوس ہے وہیں اس سعادت پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے کہ ہم نے حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی ذاتِ والا صفات کو چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، ہنستے بولتے، دیکھا ہے جن میں شاہ ولی اللہؒ کے انسانیت نواز علم کی جھلک ملتی تھی اور شاہ عبد العزیز دہلویؒ کے حقائق و احکام کی حکمت آفرینیاں بھی۔ مولانا قاسم نانوتویؒ کا تو تفقہ اسلام بھی تھا۔ شاہ اسحاقؒ دہلویؒ کی دلسوزی بھی تھی اور حاجی امداداللہ کا روحانی جذبہ بھی۔

حاجی عابد حسینؒ کی باطنی نظر بھی تھی اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی جرأت بھی۔ شیخ الہندؒ کا عزم بھی تھا اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی مثالی وسعتِ نظر بھی۔ مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی دیدہ وری بھی تھی اور مولانا شبیر احمد کی خطابت بھی۔ حکیم الامت کی اصلاح پسندی بھی تھی اور مولانا حسین احمد مدنی کا حوصلہ بھی۔ غرض کہ یہ شخصیت بہت سے اوصاف کا مجموعہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ظاہری حسن کے ساتھ باطنی جمال سے بھی نوازا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صورت پر نظر پڑتے ہی اسلاف کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں علمی و عملی و انتظامی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ ملت کے ہر طبقہ کو بلا امتیاز مسلک ان پر بھر پور اعتماد تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ۱۹۷۲ء آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا وجود عمل میں آیا اور اس کی سربراہی کا مسئلہ ہوا تو سبھی کی نظریں بہ یک وقت متفقہ طور پر قاری محمد طیب صاحبؒ پر جا کر جم گئیں اور تا حیات وہ ہندوستانی مسلمانوں کے اس متحدہ و مشترکہ پلیٹ فارم کی قیادت کرتے رہے، آخیر عمر میں انہیں کچھ مفاد پرستوں نے جن جن ''خطابات'' سے نوازا دنیا کو معلوم ہو گیا کہ حقیقت کیا تھی اور جھوٹ کیا تھا؟

حضرت حکیم الاسلامؒ کی ذات والا صفات صبر و شکر کا عملی نمونہ تھی آخیر عمر میں انہیں جو تکالیف و مصائب۔ اپنوں اور غیروں کی طرف سے پہنچی ان کا ذکر اس وقت نامناسب معلوم ہوتا لیکن انھوں نے مخالفین و معاندین و محاسدین کے اشتعال انگیز، جذباتی اور گستاخ لب و لہجہ کا جس خندہ پیشانی، استقلال اور ثابت قدمی سے جواب دیا وہ اپنی مثال آپ ہے حد تو یہ ہے کہ ان حالات میں بھی وہ اس پر شکر گزار رہتے کہ ان کی ذات کچھ حضرات کی روزی رسانی کا ذریعہ بن گئی۔ کیوں کہ اس وقت کے بیشتر ابن الوقت اور حریص حضرات مال و زر کی طمع میں اپنی شرافت و نجابت، ذکاوت و ذہانت اور تقاریر و صحافت سے قاری صاحب پر وہ باز ار و الزام لگا رہے تھے جو عام آدمی کو بھی نہیں لگائے جا سکتے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اپنی ذات میں ایک انجمن کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ جب دار العلوم دیوبند کی مسندِ اہتمام پر جلوہ افروز ہوتے تو دار العلوم

دیوبند کے چھوٹے چھوٹے کام پر ان کی گہری نظر ہوتی۔ ڈھائی ہزار طلباء کے تعلیمی مسائل، ان کی شبانہ روز زندگی، دارالعلوم دیوبند کے تعمیراتی کام، ملازمین کی ضروریات اوران کی تکمیل، مالی معاملات، مطبخ، تعلیمات، اقامت، درس وتدریس، تقسیم اسباق جیسے ہزارہا مسائل تھے جوان کے سامنے رہتے اور وہ تن تنہا ان سب مسائل کو بحسن وخوبی حل کرتے۔ اس پر مستزاد، دارالعلوم دیوبند کی شہرت کے پیش نظر دن رات مہمانوں کی آمد، اپنے دور طالب علمی میں ہم نے دیکھا کہ ہر مہینہ کوئی منسٹر، وزرا، سفیر ملکی وغیر ملکی نمائندوں کی آمد رہتی جن کے استقبال کے لیے قاری صاحب بذاتِ خود تشریف فرما رہتے، مہینہ دو مہینہ میں دارالحدیث تحتانی میں کسی نہ کسی مہمان کے اعزاز میں جلسہ ہوتا جس میں حکیم الاسلام بھی رونق افروز رہتے۔ ہر ایک مہمان کا اس کے شایان شان استقبال کیا جاتا، سرکاری شخصیات کا اعزاز واکرام اپنی جگہ لیکن کبھی اظہار مرعوبیت نہ ہوتا۔

۱۹۷۴ء کی بات ہے دارالعلوم دیوبند میں اسی وقت کے اتر پردیش کے گورنر اکبر علی خاں مرحوم تشریف لائے تو دیوبند کے ایک دیرینہ مطالبہ ڈگری کالج کے عالیہ کی تکمیل کی خاطر موقع کو غنیمت تصور کرتے ہوئے باشندگانِ دیوبند نے ڈگری کالج کا سنگ بنیاد گورنر موصوف کے ہاتھوں رکھوانے کے انتظامات کیے، گورنر کی موجودگی میں کالج کی عمارت کے لیے فنڈ مہیا کرنے کی ضرورت پیش آئی تو دیوبند کے تمام مالدار حضرات نے اپنی استطاعت کے مطابق چندہ دینے کا اعلان کیا۔ کچھ حضرات نے اسی وقت نقد دیا اور کچھ نے وعدے کیے۔ منتظمہ کمیٹی نے آخیر میں گورنر صاحب کے توسط سے قاری صاحبؒ کو بھی توجہ دلائی تو حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ ''حضرات! جس کی جیب میں جو کچھ تھا وہ اس نے دیا یہ خوشی کی بات ہے، ہم جیسے افراد مالی تعاون نہیں کر سکتے لیکن ہمارے پاس ایک چیز ہے دعاء پر تقریب کا اختتام عمل میں آیا۔ گورنر صاحب خود قاری صاحبؒ کی اس دعاء اور فضائل دعاء سے بہت زیادہ متاثر ہوئے لیکن کسی نے یہ محسوس نہیں کیا کہ قاری صاحبؒ گورنر سے مرعوب ہو گئے ہوں، کوئی اور ہوتا تو اپنی جیب

سے نہیں تو دار العلوم کے خزانے سے ہی سہی موقع کو غنیمت تصور کرتے ہوئے ایک خطیر رقم چندہ اسے دے دیتا۔

۱۹۷۶ء میں اس وقت کے صدر جمہوریہ ہند فخر الدین علی احمد دارالعلوم دیوبند تشریف لائے تو ان کا شایانِ شان استقبال کیا گیا لیکن ہندوستان کے اس سب سے بڑے عہدہ یا عہدہ دار سے مرعوب ہونے کا کوئی شائبہ بھی نہ تو ان کی گفتگو میں محسوس کیا گیا اور نہ ہی ان کے چہرے سے یہ احساس ہوا کہ وہ صدر جمہوریہ کے پہلو میں بیٹھ کر کسی احساسِ برتری یا احساس کمتری کا شکار ہوں گے۔

اور تو اور اجلاسِ صدسالہ کی پہلی نشست میں راقم نے بذاتِ خود مشاہدہ کیا کہ اس وقت کی وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی اجلاس کے اسٹیج پر اس وقت تشریف لائیں جب کہ اجلاس کا آغاز ہو چکا تھا۔ (محترمہ کی آمد کی کیا وجوہات رہیں؟ اور انہیں کچھ سیاسی حضرات نے کس طرح اجلاس تک لانے کا کھیل کھیلا یہ ایک الگ بحث ہے جس پر اس وقت کلام کی گنجائش نہیں) بہ حیثیت طالب علم جن طلباء کو اسٹیج کا انتظام سپرد کیا گیا تھا اس میں راقم بھی شامل تھا۔

اندرا گاندھی کی وزارتِ عظمیٰ اور آج کل کی وزرات میں زمین آسمان کا فرق ہے اور کچھ سال قبل ہی انہوں نے ایمر جنسی کے باعث اپنی تصویر جس انداز سے پیش کی تھی جس کے نتیجہ میں انہیں وزرات عظمیٰ سے دستبردار بھی ہونا پڑا تھا، اب یہ ان کا دوسرا دور تھا جس کو شروع ہوئے دو تین ماہ ہوئے تھے اسی لیے ان کی دہشت اور رعب عوام و خواص سبھی کے دلوں پر یکساں تھی۔

آج تک وہ منظر آنکھوں کے سامنے ہے کہ جس وقت محترمہ اسٹیج پر تشریف لائیں تو ہراول دستے کے طور پر کانگریس آئی کے جنرل سیکریٹری ہیم دتی نندن بہوگیا تیزی سے اسٹیج کی کرسیوں پر چڑھ کر مخاطب ہوئے کہ قاری صاحب کہاں ہیں؟ میڈم تشریف لے آئیں ہیں؟ اس خبر نے تمام منتظمین کے ہاتھ پیر پھلا دیے، قاری صاحبؒ تک اطلاع ہوئی تو وہ اپنی منکسرانہ شان کے ساتھ استقبال کے لیے اسٹیج کے زینہ تک تشریف لائے

جہاں اس وقت اندرا جی پہنچ چکی تھیں۔ محترمہ اندرا گاندھی نے آگے بڑھ کر قاری صاحب کے قدم چومنے چاہے لیکن قاری صاحب نے قدرے پیچھے ہٹ کرانہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا وار اپنی معیت میں اندرا جی کو ان کی کرسی پر لاکر براجمان کیا (اندرا گاندھی کی موجودگی اس اجلاس کے بعد کے کتنے فتنوں کا موجب بنی اوراس کے پیچھے کیا کیا شازشیں کارفرما رہیں یہ بھی الگ بحث کا موضوع ہے) الغرض بات چل رہی تھی قاری صاحب مرحوم کے اپنے انداز. جداگانہ اور ان کی اپنی شخصیت کی جو بذاتِ خود انجمن تھی جن سے ملک وبیرون ملک کی اہم ترین عالم شخصیات کو شرف ملاقات حاصل ہوا تھا لیکن وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند کے انتظامی امور انہیں اصلاحی مواعظ وخطبات سے نہیں روکتے تھے اپنے مواعظِ حسنہ سے امت کی اصلاح کا فریضہ انجام دے رہے تھے، اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک خاص تصنیفی ذوق بھی عطا کیا تھا۔ ان کی بعض تصانیف نے عالمی شہرت حاصل کی شعروشاعری میں ان کے اشعار اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں ان کی زندگی کی بیشتر جہات ایسی ہیں جو تفصیل کی محتاج ہیں۔

آج اس عظیم شخصیت کے انتقال کو بیس سال کا عرصہ گزر گیا ہے، اس میں ایک نئی نسل تیار ہوگئی ہے۔ پرانی روایات کے حامل اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کرتے جارہے ہیں اب ضرورت ہے کہ نئی نسل کو اپنے عہد کی ممتاز ترین، عظیم شخصیت کے سلسلہ میں بتایا جائے جس دن سے قاری صاحب کا نتقال ہوا تبھی سے مستقل طور پر داخلی وخارجی طور پر منصوبہ سازی کی جارہی ہے کہ اس عظیم شخص کا بھرپور تعارف عوام کے سامنے عمومی طور پر کرایا جائے لیکن افسوس کہ یہ کوششیں ابھی تک کامیاب نہیں ہوسکی۔

بیسوی صدی کی اس اہم ترین شخصیت پر نہ تو کوئی سوانح حیات ترتیب دی جاسکی اور نہ ہی کسی اہم اخبار یا رسالہ نے حکیم الاسلام سے متعلق کوئی قابل قدر نمبر شائع

کیا۔ وقف دارالعلوم دیوبند کے نمائندہ اخبار ''ندائے دارالعلوم دیوبند'' نے ۱۹۹۴ء میں اڑتالیس صفحات کا ایک مختصر سا نمبر نکالا کہ اپنے محسن ومربی کو خراج عقیدت پیش کرنے کی کوشش ضرور کی لیکن اسے ''فرض کفایہ'' سے زیادہ کوئی عنوان نہیں دیا جاسکتا، کیوں کہ اس میں کچھ تأثراتی مضامین کے علاوہ سوانحی خاکہ بالکل ناپید ہے، پورے نمبر کے مطالعہ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ عظیم شخص کب پیدا ہوا؟ کہاں پیدا ہوا؟ کیا کارنامے انجام دیے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس کام کی قاری صاحبؒ کے خاندانی حلقوں سے، ان کے متوسطین کے طبقوں سے، معتقدین ومریدین ومتوسلین سے توقعات وابستہ نہیں لیکن ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

حضرت مہتمم صاحب کے انتقال کے فوراً بعد راقم کی تحریک پر اکابرین کے مشورے سے سرزمین دیوبند پر، دیوبند کے کچھ فعال ومتحرک نوجوانوں کو ساتھ لے کر ''طیب ایجوکیشنل سوسائٹی'' کی بنیاد ڈالی گئی تھی جس کی غرض وغایت قاری صاحبؒ کی حیات وخدمات کے گوشوں کو اجاگر کرنا، ان کی تصانیف کی ازسرِ نو اشاعت، ہندی وانگریزی زبانوں میں تراجم، قاری صاحب کی حیات پر سیمینار کا انعقاد وغیرہ جیسی چیزیں شامل تھیں۔ جوانوں میں جذبہ بھی تھا اور قاری صاحبؒ کے تئیں عقیدت بھی۔ خیال تھا کہ اس سوسائٹی سے بہت سے مفید کام لیے جاسکتے ہیں لیکن کچھ بزرگوں ومشفقوں نے اس کام کو ''بچوں'' کے لیے ناممکنات میں سے تصور کرتے ہوئے ازخود کرنے کی تجویز رکھی جسے ہم جیسے بے بضاعتوں کے لیے ماننے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا، نتیجتاً طیب ایجوکیشنل سوسائٹی، حکیم الاسلام لائبریری اور حکیم الاسلام شبینہ اسکولوں تک سمٹ کر رہ گئی۔ سرپرستان کرام کی عدمِ توجہی اور اکابرین کی لاپرواہی کے باعث دوسالوں تک ہی یہ چل سکی، مجبوراً اسے بند کرنا پڑا۔ اس درمیان میں طیب ایجوکیشنل سوسائٹی نے حضرت حکیم الاسلام پر جولائی ۸۴ء میں ایک قومی سیمینار کا اعلان کیا جس کی مخالفت تو نہیں ہوئی لیکن کچھ ''بلند حوصلہ'' دانشور احباب نے اس کام کو اپنا

فریضہ تصور کرتے ہوئے اسے بین الاقوامی سمینار کی شکل میں کرنے کی تجویز پیش کر کے مخلص نوجوانوں کی ہمت توڑ ڈالی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بین الاقوامی تو کیا قومی سمینار بھی نہ ہوسکا، راقم کی کوششوں سے اگلے سال (جولائی ۸۵ء) میں مقامی سطح پر سیمینار منعقد کرا کے اس جذبہ کے ''آنسو'' پونچھ دیے گئے۔ جو قاری صاحبؒ کے تئیں تھا۔ افسوس یہ کہ اس کے بعد بھی تا ہنوز حضرت حکیم الاسلام کی حیات پر کوئی کام نہیں نہ کوئی علمی مذاکرہ ترتیب دیا جا سکا یہ ہماری بے حسی کی ایک مثال ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمات پر وقت کی گرد تہہ در تہہ جمتی جا رہی ہے اگر اب بھی سنجیدگی سے اس طرف غور وخوض نہیں کیا گیا تو آئندہ بیس سالوں میں ان کا تذکرہ کرنے والے بھی اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے اور عالمِ اسلام کی ایک اہم ترین شخصیت نسیاً منسیاً ہو کر رہ جائے گی۔ اس لیے اربابِ حل وعقل سے گزارش ہیکہ وہ ان معروضات پر سنجیدگی سے غور کریں اور بیسوی صدی کی اس عظیم شخصیت کی ان مخلصانہ کوششوں سے عوام وخواص کو روشناش کرائیں جن سے نئی نسل کی مراد سازی اور کردار سازی میں مدد مل سکے۔

آشیاں اجڑا کیا — ہم ناتواں دیکھا کیے

(از: مولانا احسن مفتاحی: روزنامہ اخبار مشرق کالکتہ

"جناب احسن مفتاحی صاحب ایک ممتاز صاحب قلم اور معروف ومنصف مزاج قلم کار رہے ہیں ان کی بے باک اور انصاف پسند تحریروں نے پوری ایک نسل کو متاثر کیا ہے، حقائق وواقعات، صداقتوں اور سچائیوں کو گویا ان کے یہاں زبان مل جاتی ہے اور ان کے زیر قلم آنے والے موضوعات نے حیاتِ دوام حاصل کی ہے۔

زیر نظر مضمون ان ہی کے قلم کا مرہونِ منت ہے جس کو ہم بغیر کسی حذف واضافہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں ہمیں معلوم ہے کہ بہت سے لوگ اس کو پڑھ کر چیں بہ جیں ہوں گے اور بہت سے اصحاب جبہ ودستار کے ایوانوں میں زلزلہ آجائے گا"۔

الفاظ ومعانی، علم وفضل، حکمت ومعرفت اور حلم وبردباری کے بے تاج بادشاہ اور برصغیر ہند وپاک اور بنگلہ دیش کے سب سے قد آور عالم باعمل حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ۸۵ رسال کی عمر میں ہم گنہگاروں سے روٹھ کر اللہ کو پیارے ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حکیم الاسلام کی وفات حسرت آیات کا اندوہناک المیہ کسی فرد خاندان، شہر، ملک، یا طبقہ کا نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا ایک ایسا صدمہ اور نقصان ہے جس کی تلافی قحط الرجال کے اس دور میں ممکن نہیں۔

خدا رحمت کرے اس صادق پاکیزہ طینت پر

دنیائے اسلام کے تمام اہل علم ایک بابصیرت اور بالغ نظر عالم دین کے اٹھ جانے سے ماتم کناں ہیں، تحریر وخطابت کی مسند خالی ہوگئی تصنیف وتالیف اور درس وتدریس کی مجلسوں میں ایک کہرام برپا ہے کہ اب آہ! کون ہمیں درس زندگی دے گا۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کا انتقال پر ملال ''اخبار مشرق'' کا اپنا نقصان ہے جو ان کی دعاؤں سے محروم ہو گیا۔ قاری صاحبؒ اپنی زندگی کے آخری دور میں لکھنے پڑھنے سے معذور ہو گئے تھے اس لیے اپنے رفقائے کار سے خصوصی طور پر خط لکھوا کر ''اخبارِ مشرق'' کے لیے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کر کے خدائے عزوجل سے اس کی ترقی اور بقا کے لیے دعائیں فرماتے تھے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اگرچہ عمر طبعی کو پہنچ کر اپنے اللہ کو پیارے ہوئے ہیں مگر بعض جلیل القدر ہستیاں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ طویل ترین زندگی گزار کر بھی دنیائے فانی سے رخصت ہوتی ہیں تو بے اختیار کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ

''کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور''

دنیا سرائے فانی ہے اور کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ کے مصداق دیر سویر سب کو یہاں سے جانا ہے۔ گلشن عالم کا مالی وقت موعود پر پھولوں کو اُگاتا اور توڑتا ہے لیکن اس کے باوجود خلاقِ عالم کے حضور یہ گستاخی کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ہم کروڑوں گنہگاروں اور کم سوادوں کی روحیں قبض کر لی ہوتیں اور ان کے عوض ایک روح بخش دی جاتی جو بڑی مقدس اور پاکیزہ تھی۔ محمد طیب ایک ایسے کوہ نور کا نام تھا جو کسی کلاہِ کج میں بھی لگ جاتا تھا تو اسے علم و فضل کا بادشاہ بنا دیتا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ دار العلوم دیوبند کے مہتمم تھے لیکن ندوہ، علی گڑھ، بریلی، اجمیر اور کلیر شریف میں بھی یکساں مقبول تھے اور اس رندِ باصفا کو بریلوی مکتبۂ فکر کے لوگ بھی اپنا مقتدا سمجھتے تھے۔

مشرکین مکہ کی طرح بیسویں صدی کے منافقِ اعظم اسعد مدنی کے حواریوں نے اندرا گاندھی کی چھتر چھایا میں از ہر ہند دار العلوم دیوبند پر شب خون مارا تو وہ اہل حدیث ہوں یا بریلوی مکتبۂ فکر کے لوگ ہوں بلا اختلافِ مسلک تمام دینی حلقوں میں مستقبل کے خطرے کے پیش نظر تشویش کی لہر دوڑ گئی کہ اب ہمارے دینی قلعوں کو ایک منصوبہ بند سازش کے تحت منافقین کی مدد سے ایسے مرکزوں میں تبدیل کیا جائے گا جہاں سے نعرۂ

جہاد بلند کرنے والے علماء تیار ہو کر نہیں نکلیں گے، بلکہ اربابِ اقتدار کی ہر بات پہ آمنا وصدقنا کہنے والے وہ مولوی نکلیں گے جو بھاڑے کے ٹٹو بن کر اسلام کی تصویر مسخ کریں گے اور سوویت یونین کے نام نہاد مسلم لیڈروں کی طرح حق نمک ادا کریں گے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے دارالعلوم دیوبند کی چٹائیوں پر بیٹھ کر اپنے اکابر کی امانت کی جس طرح حفاظت کی اور اس کی ترقی وتوسیع کے لیے کوشاں رہے اس پر تفصیل سے لکھنے کا یہ موقع نہیں ہے، قاری محمد طیب صاحب کے دورِ اہتمام میں مصر کے سابق صدر مرحوم انور سادات جب دیوبند آئے تھے تو وہ اپنے ملک میں الازہر یونیورسٹی ہونے کے باوجود بے ساختہ پکار اٹھے تھے کہ: ''اس عظیم تاریخی یونیورسٹی کی زیارت نے مجھے مجبور کیا کہ میں خلوص دل سے اپنے ان بھائیوں کو مبارک باد پیش کروں جو اس کے نظام کو چلا رہے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس سے اسلام اور مسلمانوں کو ہمیشہ نفع پہنچے اور یہ علم ومعرفت کا ایک مینار ثابت ہو۔

۳۰ رمئی ۱۸۶۷ء کو دیوبند کی چھتہ مسجد میں انار کے درخت کے نیچے انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں ایک استاذ اور ایک شاگرد سے دارالعلوم کی بنیاد ڈالی گئی تھی تو اس وقت اس کے بانی نے اصول مقرر فرمادیا تھا کہ دارالعلوم توکل بخدا چلے گا۔ اور اس کی آمدنی کی کوئی مستقل سبیل نہ ہوگی۔ درس وتدریس کی دنیا میں توکل علی اللہ کا یہ کتنا انوکھا واقعہ ہے کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے اکابر کی اس میراث کو اپنے ساٹھ سالہ دور اہتمام میں توسیع وترقی کے اتنے اونچے زینے پر پہونچادیا کہ دنیا دیکھ کر عش عش کرتی تھی، قاری محمد طیب صاحب نے اکابر کے سچے جانشین کی حیثیت سے ''علم برائے علم'' کے تصور کو فروغ دیا یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے لوگ اس پاکیزہ تصور کی وجہ سے مرحوم کی خدماتِ جلیلہ کو خراجِ تحسین پیش کرتے تھے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر گرے ونٹ نے قاری صاحب کے حسن اہتمام سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ ''یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ مجھے دیوبند دیکھنے کا اتفاق ہوا، میں نے دیکھا کہ

قدیم اسلامی کلچر اب بھی یہاں پوری آب وتاب سے درخشاں ہے، ایک مورّخ کے لیے اس سے زیادہ روشن موقع کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا۔"

دارالعلوم دیوبند کا پرسکون علمی ماحول اس کی وسیع وعریض شاندار عمارتیں اور پھر حسنِ اہتمام قاری صاحب کی ذاتِ بابرکات کی فیض رسانی کا مظہر تھا۔ انھیں خدائی بزرگ وبرتر پر یقین کامل اور ان کا جذبۂ صادق تھا اس لیے انہوں نے کبھی دارالعلوم دیوبند کی آزادانہ حیثیت کو مجروح ہونے نہیں دیا اور نہ کسی حکومت سے کوئی امداد طلب کی حالانکہ امداد قبول کرنے کی بارہا ترغیب دی گئی لیکن حکیم الاسلامؒ نے اپنے اکابر کی حکیمانہ نصیحت پر سختی سے عمل کیا اور اربابِ اقتدار کو کبھی دارالعلوم پر نگاہِ غلط ڈالنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

حکیم الاسلامؒ کے دور اہتمام میں دارالعلوم کے طلبہ کے لیے ۲۰۰/ سے زائد رہائشی کمرے تھے، اجلاس صد سالہ کے موقع پر مزید اسی کمرے نیز وسیع وکشادہ ہال تعمیر کرائے گئے تھے دوسری قراردادوں کے علاوہ ایک قرارداد یہ بھی منظور کی گئی تھی کہ دنیا کے مختلف حصوں میں جو اسلامی کتابیں شائع ہورہی ہیں انھیں اردو زبان میں منتقل کیا جائے گا اور اس کے لیے ایک وسیع دارالاشاعت کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ اسی قرارداد میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ یونیورسٹیوں کے ایسے گریجویٹ طلبہ کے لیے جو دینی ذوق رکھتے ہوں یا جنہوں نے عربی یا دینیات میں ایم اے کیا ہو ان کے لیے دارالعلوم میں خصوصی شعبہ قائم کیا جائے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اپنی فراست ایمانی سے سمجھ گئے تھے کہ اس دورِ پُرفتن میں مسلمانوں کو خیر امت بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ایک نئے علمی، ثقافتی اور تہذیبی دور کا آغاز کیا جائے، اس منصوبے پر انہوں نے دارالعلوم دیوبند کے اجلاس صد سالہ کے بعد ہی تیزی سے عمل شروع کردیا تھا۔ اجلاس میں وزیر اعظم اندرا گاندھی اپنے بیٹے سنجے گاندھی کی معیت میں شریک ہوئیں تو پیغمبر آخرالزماںؐ کے نائب کی صورت میں آفتاب رسالتؐ کی جلوہ گری دیکھ کر مبہوت ہوگئیں دشمنانِ اسلام بیس لاکھ فرزندانِ توحید کے اجتماع کو دیکھ کر پریشان ہوگئے کہ اپنے مرکز کو ماننے

والا یہ سیلِ رواں اگر کسی بات پر حکومتِ وقت کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تو وہ سیلاب میں تنکے کی طرح بہہ جائے گی۔ اسعد مدنی اندراجی کی روانگی کے بعد اجلاس کے دوران ہی اٹھ کر چلے گئے اور ایک خفیہ مقام پر جلسہ منعقد کیا جہاں منصوبہ بنایا گیا کہ اسلام کے اس عظیم قلعہ پر حکومتِ وقت کی مدد سے کیسے قبضہ کیا جائے۔

حکیم الاسلامؒ دنیائے اسلام میں فکری اور تہذیبی اعتبار سے ایک ایسا دفاعی حصار قائم کررہے تھے جس پر الحاد ودہریت کی کوئی بمباری اثر نہ کرسکتی تھی —— دیوبند جیسے چھوٹے سے قصبہ میں ٹرینوں کی چھتوں، اونٹوں، گھوڑوں، خچروں پر بیٹھ کر ٹرینوں اور بسوں کے فٹ بورڈوں سے لٹکے ہوئے اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے ۲۰؍لاکھ آدمیوں کو دیوانہ وار لپکتے ہوئے دیکھا تو دشمنانِ اسلام بھانپ گئے کہ کیا ہورہا ہے اور اس کے نتائج کیا ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ (۱) صفدر گنج میں اسعد مدنی جیسے منافقین کی مدد سے کھچڑی پکائی گئی کہ دارالعلوم دیوبند پر کس طرح قبضہ کیا جائے۔ بالآخر ۲۳؍مارچ ۱۹۸۲ء کی رات میں ڈاکوؤں، پیشہ ور غنڈوں، بموں، پستولوں اور بندوقوں کے ساتھ دارالعلوم پر اس حال میں قبضہ کیا گیا کہ "اوپر کے حکم" کے مطابق رسوائے زمانہ پی اے سی کے ہزاروں مسلح جوان انکی حفاظت اور مدد کے لیے دارالعلوم کی عمارتوں کے اردگرد تعینات تھے۔

اگر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب سے ہندوستانی مسلمانوں کو سچی عقیدت ہے تو اس عقیدت کا تقاضا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کو منافقین کے قبضہ سے آزاد کرایا جائے خوشامدیوں ضمیر فروشوں اور ملت دشمنوں کو بےنقاب کرکے واصلِ جہنم کیا جائے تاکہ مسلمان ان شیطانوں کی فریب کاریوں سے محفوظ و مامون رہیں۔ ان منافقوں کے پاس ضمیر نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ان کی ظاہری شکلوں پر نہ جایئے جو بڑے مقدس اور پارسا نظر آتے ہیں۔ عبداللہ بن ابی بھی صحابہؓ کی طرح اپنی شکل وصورت بنائے رکھتا تھا لیکن حضور ﷺ یا صحابہؓ کو کوئی نقصان پہنچتا تھا تو اس کے گھر میں گھی کا

چراغ جلتا تھا۔ اسعد مدنی جیسے لوگ اپنا دین وایمان دنیاوی مفادات کے مہاجنوں کے یہاں گروی رکھ چکے ہیں۔ اس قسم کے لوگ اپنی ٹوپی میں تقدس کا طرّہ سجا کر مسلمانوں کو دھوکا دیتے ہیں۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے اٹھ جانے سے ملتِ اسلامیہ ایک بیش قیمت سرمایہ سے محروم ہوگئی ہے۔ اس لیے ان کی خدماتِ جلیلہ کے نتیجے میں دارالعلوم دیوبند کی شکل میں علم ودانش کا جو سرمایہ باقی بچا ہے اسے غاصبوں کے قبضے سے آزاد کرانا ہمارا فرض ہے۔

ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، پسماندگان کو صبر عطا فرمائے اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین۔

بشکریہ ''اخبار مشرق'' کلکتہ، مورخہ ۱۹ر جولائی ۱۹۸۳ء مطابق ۸ر شوال ۱۴۰۳ھ بروز منگل جلد نمبر ۴، شمارہ نمبر ۱۹۳۔

فرشتوں کی انجمن کا ایک انسان

نبیرہ امام العصر حضرت علامہ کشمیریؒ مولانا نسیم اختر شاہ قیصر
استاذ دارالعلوم (وقف) دیوبند، ومہتمم الجامعۃ الانوریہ دیوبند

کارواں سے کیسے کیسے لوگ رخصت ہوگئے
کچھ فرشتے چل رہے تھے جیسے انسانوں کے ساتھ

انسان زندگی میں بہت کچھ کھوتا اور بہت کچھ حاصل کرتا ہے اس پانے اور کھونے کے عمل کا نام ہی زندگی ہے اور جب ہم زندگی کے اوراق پلٹتے ہیں تو ہر صفحہ پر بامراد ہونے یا محروم رہ جانے کی داستان رقم ہوتی ہے، عمر کا کارواں اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہتا ہے اور پڑاؤ در پڑاؤ بالآخر زندگی کا سفر پورا ہو جاتا ہے، اس زندگی میں کچھ اشخاص اور افراد ایسے ضرور ملتے اور ٹکراتے ہیں جس کا ساتھ چاہے مختصر ہو یا طویل، جن کی صحبتیں گنتی کی ہوں یا بے شمار ان کی یادیں زندگی کا حاصل اور سرمایہ بن جاتی ہیں اور پھر یہاں سے شروع ہوتا ہے مایوسیوں اور محرومیوں کا ایک سفر، آغاز ہوتا ہے ایک اور کہانی کا، شروعات ہوتی ہے مسرت اگیز اور مسرت خیز لمحات کی، اس سفر، اس کہانی اور داستان کو دہرانے کے لیے ہمت کا ہاتھ تھامنا پڑتا ہے اور جب ہمت اور طاقت مجتمع ہو جاتی ہے تب یہ ادھوری، بے ربط اور بے لطف سی سطور قلم کی نوک سے کاغذ کے سینے پر پھیل کر اپنے وجود کا احساس دلاتی ہیں صرف ایک ذریعہ ہے جو اس احساس کی شدت کو کم کرسکتا ہے کہ پرانے دنوں کو یاد کیا جائے اور یادوں کے دریچے سے جھانک کر ان الفاظ کو آنکھوں میں قید کرلیا جائے جو روحِ جاں اور روحِ قلب ہیں۔

اس لایعنی، بے مزہ تمہید کے بعد اپنے موضوع کی طرف لوٹتا ہوں، موضوع ہے وقت کی ایک نابغۂ روزگار شخصیت کا ذکر، ایک بلند مرتبہ انسان کے احوال، ایک فرشتہ

صفت شخص کی یادیں، ایک واعظ، ایک خطیب، ایک مقرر، ایک مفکر، ایک مدرس، ایک مصنف، ایک ادیب، ایک منتظم، ایک متفق علیہ آدمی کا بیان، ایک ایسی ہستی کی باتیں جو روح کی غذا اور قلب کی تقویت کا باعث ہیں، جماعت دیوبند کے اس فرزند کا تذکرہ جو الامام الاکبر، حجۃ الاسلام، بانی دار العلوم مولانا محمد قاسم نونتویؒ کے علوم کا شارح، حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی اصلاح وتربیت کا نمونہ، امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے علم وفضل کی یادگار، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی طلاقت لسانی اور زور خطابت کا مثال، الابر دار العلوم کے کمال، تقویٰ، زہد وورع کی نشانی، دورِ حاضر کا ایک ایسا نورانی پیکر جس کو علم وعمل کی دنیا میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی نور اللہ مرقدہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

یوں تو یہ جملہ بہت سے اشخاص کے لیے لکھا جاتا ہے کہ وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے اور ان کے وجود کی خوشبو سے علم وعمل کی راہیں پر رونق وار آباد تھیں مگر حکیم الاسلامؒ حقیقی معنی مں ے ہمہ جہت اور ہمہ صفت شخصیت رکھتے تھے، وہ ظاہری اخلاق و عمل کے اعتبار سے بھی بے نظیر تھے اور باطنی کمالات کی وجہ سے بھی ان کو امتیاز حاصل تھا ، راقم الحروف کا تأثر یہ ہے کہ حکیم الاسلامؒ اپنے صاحب علم وفضل معاصرین کی مجالس میں میر مجلس اور شمع مجلس تھے ان کے معاصرین کی بڑی تعداد بلاشبہ ان جلیل القدر اور رفیع المرتبت انسانوں پر مشتمل ہے جو گذشتہ نصف صدی میں چراغِ راہ، چراغِ دین اور چراغِ انسانیت کی شورت روشن ہے ان کی روشنی سے تاریک راہوں کو ہی اجالا نہیں ملا بلکہ قلوب اور مردہ دلوں کو بھی حرارت اور روشنی حاصل ہوئی۔ دینی درسگاہوں، خانقاہی سلسلوں، روحانی رشتوں اور بیعت وارشاد کی مسندوں کو ان افراد نے تابندگی اور توانائی عطا کی، حکیم الاسلامؒ کا شمار ان افراد میں کیا جانا چاہیے جو اعلیٰ بلند اور باوقار معاصرین کی صف میں ممتاز بن کر رہتے ہیں اور سب کے دلوں میں جن کے لیے احترام ہوتا ہے، اس امتیاز کے باوجود معاصرانہ چشمک کا ان کو شکار ہونا پڑا، ان کی سوانح کا یہ ایک ایسا باب

ہے جسے اگر نظر انداز کرتے ہیں تو حکیم الاسلامؒ کی مبارک زندگی کا ایک اہم گوشہ ادھورا اور نامکمل رہ جاتا ہے اور اگر اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں تو بہت سے صاحب جبّہ و دستار افراد کی پیشانیوں پر بل پڑجاتے ہیں ویسے بھی میں عوامی سطح پر بولنے یا لکھنے میں احتیاط کا قائل ہوں اور ان مسائل سے خاص طور پر اجتناب برتتا ہوں جو باہمی انتشار و افتراق کا عنوان ہیں مگر کبھی بات ایسے موڑ پر آجاتی ہے جہاں اشاروں میں ہی سہی کچھ نہ کچھ کہنا ضرور پڑتا ہے، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس طرح کا رویہ حق و انصاف کے تقاضوں سے میل نہیں کھاتا مگر بعض اوقات اجتماعی مفادات بغیر کچھ کہے خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ جانے کا اشارہ کرتے ہیں۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اپنی اعلیٰ علمی نسبتوں اور رابطوں کی وجہ سے صرف جماعتِ دیوبند کا قابل فخر سرمایہ نہیں تھے بلکہ وہ اپنی متوازن طبیعت اور دینی و فکری بصیرت کی وجہ سے بھی تمام حلقوں میں مقبول متعارف تھیان کو خداوند قدوس نے جو اعلیٰ علمی فکری اور انتظامی صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں، کسی دوسری جگہ پر ان کا خال خال ہی ہے بزرگوں کی امانت دار العلوم دیوبند کو جس شان، وقار اور عظمت کے ساتھ انہوں نے چلایا اور مقبولیت و شہرت کی جن بلندیوں تو پہونچایا اس میں ان کی انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کے تدبر، تحمل اور تواضع کو بھی بڑا دخل ہے۔ دار العلوم کو اپنی معنوی اولاد کی طرح لے کر چلے تو ساتذہ و کارکنان کے عملے کو انہوں نے اپنے خاندان کا فرد سمجھا نہ کوئی ان سے دور تھا اور نہ کسی کو ان کی ذات سے کوئی خوف، دیکھنے کو تو وہ ایک کمزور اور منحنی سے انسان تھے مگر عزم و حوصلہ اور ارادے و ہمت کی ایسی چٹان تھے جس سے سمندر کی بپھری اور بے قابو ہو موجیں بار بار ٹکراتیں اور مایوس ہو کر لوٹ جاتی تھیں، کبھی طوفان آیا تو یہ چٹان ایک پہاڑ بن کر اس کی راہ میں حائل ہو جاتی مفادات دار العلوم کا تحفظ ان زندگی کا مشن تھا، دار العلوم کی علمی ترقیات ان کا اوڑھنا بچھونا، اپنے خاندان اور اہل خاندان کے مسائل اور ضرورتوں کا بوجھ شاید ہی کبھی نہوں

نے محسوس کیا ہو، مگر دار العلوم کی ایک ایک اینٹ سے انہیں دلی لگاؤ تھا اور اس کی ہر ضرورت کی تکمیل ان کی اولین خواہش۔ دار العلوم ان کا گھر تھا، ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کا محور تھا، ان کے علم وفکر کی جولان گاہ تھا، ان کی کوششوں اور جہد وسعی کا میدان تھا، نہ ان کے بغیر دار العلوم کی تاریخ مکمل ہوسکتی ہے اور نہ دار العلوم کو چھوڑ کر ان کی شخصیت کے ساتھ انصاف کیا جاسکتا ہے۔

دار العلوم نے جو باکمال افراد اور اشخاص پیدا کیے ہیں ان کی خدمات، ان کی قابل قدر کوششوں، ان کے نمایاں کارناموں کا سفر کافی طویل ہے اور اس سفر میں بے شمار لوگ اس کے ساتھ چل رہے ہیں، چھوٹے بھی بڑے بھی، صاحب علم بھی اور صاحب نسبت بھی، صاحب لسان بھی اور صاحب قلب بھی، تمام خوبیوں اور کمالات کا مجموعہ حضرتؒ کی ذات تھی، قلم ان کا ایسا جس موضوع کو اختیار کرے اس کے اطراف و جوانب اور گرد وپیش کا مکمل احاطہ کرتا، تحریر بڑی شستہ، جاذب نظر اور پرکشش تھی، استدلال اور اعتدال کے ساتھ بڑی چابک دستی اور مہارت کے ساتھ آگے بڑھتے، پوری تحریر اپنی معنوی اور خوبصورتی کا احساس دلاتی، بات کہنے اور ادا کرنے کا جو ملکہ ان کو حاصل تھا وہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے، اختلافی موضوعات پر بھی سنجیدگی، متانت اور احتیاط کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے، ان کی تصانیف کی کافی تعداد بازار میں موجود ہے، جن افراد نے ان کی تحریروں اور کتابوں کا مطالرہ کیا ہے وہ تسلیم کرتے ہیں کہ حکیم الاسلامؒ نے اختیار کردہ موضوعات کا ہر طرح حق ادا کیا ہے۔ علوم قاسمی اور حکمتِ قاسمی کو جس طرح انہوں نے سمجھا اور پھر جس سہل، سادہ اور آسان انداز میں اس کو بیان کیا وہ اہیں کا حصہ ہے۔ مسودات کی صورت میں بھی ان کے کافی علمی اور فکری شہ پارے موجود ہیں گرانقدر مقالات اور قیمتی مضامین کا بڑا ذخیرہ الگ سے اپنی اہمیت کا احساس دلاتا ہے۔

تصنیف وتالیف کا کام سفر وحضر دونوں حالتوں میں جاری رہتا، سفر ٹرین کا ہو یا ہوائی جہاز کا وہ دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوکر لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے۔

تقریر میں ان کو جو انفرادیت حاصل ہے دوسروں کا حصہ نہ بنسکی، نہ شعلہ بیان مقرر وار خطیب نہیں تھے مگر ان کے لہجے میں شہد کا سا مٹھاس، ان کے بیان میں پھولوں کی سی خوشبو، ان کی گفتگوں میں چاندی کا حسن، اور دریاؤں کی سی سوانی تھی۔ گھنٹوں بولتے نہ خود تھکتے اور نہ دوسرے اکتاہٹ کا شکار ہوتے۔ قرآن، حدیث، قصص، آثار و واقعات، منطق و فلسفہ، حکمت و دانائی، علمی بصیرت و گہرائی، فقہ، ادب، معانی و کلام سب کچھ ان کی تقریروں کا خاصہ تھا، اتنی لمبی اور طویل تقریروں میں نہ اٹکتے، نہ ٹھہرتے، نہ کھاکھارتے، اور نہ اپنے موضوع سے دور ہوتے ہیں، ان کی تقریریں کیا تھیں ایک ایسا دلچسپ، دلآویز اور دلکش بیان، "سنئے اور سر دھنئے" کے مصداق، دلائل عقلی بھی ہوتے اور نقلی بھی، یکساں رفتار نے اتار نہ چڑھاؤ، پیچیدہ اور الجھے ہوئے مسائل و موضوعات کو سلیقہ اور ترتیب کے ساتھ سامعین کے گوش گذار کرتے۔ لگے بندھے اور رٹے رٹائے عنوانات پر تقریر کے محتاج نہیں تھے، ہر عنوان ان کے لیے آسان تھا۔ ہزاروں کا مجمع ہو یا لاکھوں کا، سامعین کی تعداد کم ہو یا زیادہ ان کی تقریر تقریر ہی ہوتی، حاضرین کی کمی زیادتی سے نہ مایوس ہوتے اور نہ ان میں جوش پیدا ہوتا وہ دیوبند کے ترجمان تھے اور اس ترجمانی کو انہوں نے خوبی کے ساتھ نبھایا، ان کے خطبات اور مواعظ کے کئی طویل اور مختصر مجموعے اس بات کا ثبوت ہیں کہ حکیم الاسلامؒ، واقعی حکیم الاسلام تھے، مسلمانان عالم کے عالمی مسائل سے لے کر دینی، علمی، مذہبی اور تعلیمی تقاضوں وضرورتوں پر ان کی گہری نظر تھی، سیاسی مسائل سے بھی واقف تھے، مگر ان قربت کو شجر ممنوعہ سمجھتے، ہاں کبھی موقع ہوتا تو اس میدان میں بھی رہنمائی فرماتے۔ سیاست کو کبھی نہ اپنانے کے باوجود اس کی نزاکتوں، باریکیوں اور الجھاؤ کو بھی جانتے اور خوب سمجھتے تھے، سراپا اتنا خوبصورت، دلکش اور حسین تھا کہ ہزاروں کے درمیان بھی پہچانے جاتے ظاہری حسن کا پرکشش مجسمہ تھے۔ سرخ وسفید چہرہ، آنکھوں میں ملکوتی چمک، پیشانی پر سجدوں کی نورانیت، ہونٹوں پر ہلکا تبسم، خوبصورت دانت، ہاتھ پاؤں نہایت موزوں، قد متناسب، اکہرا بدان، نہ زیادہ

دبلے کہ ناگوار معلوم ہوں، نہ زیادہ موٹے کہ بھدے لگیں، جس پر نہ گوشت کی دبیز تہیں اور نہ ہڈیاں لحم سے محروم، چلتے تو محسوس ہوتا کہ فرشتے ہجوم میں چلے جا رہے ہیں، نگاہیں نیچی رکھتے، قدموں کی چاپ اتنی دھیمی کہ چلنے تک کا احساس نہ ہوتا، اس عالم میں کبھی مسجد دار العلوم اور کبھی صدر گیٹ سے گذرتے ہوئے دفتر اہتمام میں پہونچتے اور گھنٹوں کی مصروفیات سے فارغ ہو کر پھر اسی انداز میں طیب منزل میں داخلہو تے ان کی آمد و رفت کے درمیان ہر شخص محبت وعقیدت کی نگاہوں سے انہیں دیکھتا، آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کو نہارتا اور ان کے علم، عمل اور اخلاق کے ہزاروں مناظر دل و دماغ میں بسا لیتا، انتہائی نفاست پسند تھے، لباس سادہ تھا مگر یہی سادہ لباس جب، وہ زیب تن کرتے تو ان پر خوب سجتا، بناوٹ، تصنع اور ظاہری ٹیپ ٹاپ سے کوسوں دور تھے، جب وہ چلیں تو ایک بڑی جماعت یا مجمع ان کے پیچھے ہو اس سے قطعاً بے نیاز تھے۔

حلم اور بردباری، ملنساری اور خاکساری، عجز وانکساری، حسن اخلاق اور حسن عمل کی لازوال خصوصیات سے بہرہ ور تھے سنگین سے سنگین صورتِ حال میں برداشت اور تحمل کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے، ناگوار حالات میں بھی خوش اخلاقی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹتا تھا، چھوٹوں کے لیے انتہائی خلیق اور بڑوں کے یہاں بے انتہاء مؤدب تھے، نسبتوں کا خصوصی احترام تھا، حقوق کی ادائیگی میں مستعد تھے، دیانت اور اعانت کے ساتھ معاملات کرنے کے عادی تھے کسی کو نقصان پہونچانے کا جذبہ بالکل نہیں تھا، بلکہ ذاتی مخالفین کے ساتھ بھی رعایت اور صرف نظر سے کام لیتے، پاکیزہ اطوار، پاکیزہ عادات، پاکیزہ خصائل اور پاکیزہ فکر انسان تھے۔ ان کے علمی رشتوں کا ایک سرا اگر امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے جڑا ہو تھا تو دوسرے سرے کا تعلق حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے تھا۔ روحانی تعلق حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے رکھتے تھے، ان کی خانقاہ کے تربیت یافتہ اور انکی روحانی و علمی مجلسوں کے فیض یافتہ تھے۔ بزرگانہ اداؤں اور بزرگانہ طرزِ عمل نے دوسرے لوگوں کے مقابلے

میں اِن کو زیادہ عظمت اور بزرگی عطا کی تھی۔ اختیارات کا بیجا استعمال ان کی سرشت میں نہ تھا، انتظامی معاملات میں کسی ڈھیل اور سست کے قائل نہ تھے۔ ملازمین اور اساتذہ کا کنبے کے افراد کی طرح خیال کرتے اور ہر شخص کے ساتھ حسب مراتب پیش آتے، کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے، نہ کبھی زیادتی کرنے والوں کو ہدف ملامت بنایا نہ ستانے والوں کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھا۔

مطالعہ ان کی زندگی تھا، مطالعہ کے بغیر شاید کبھی انہوں نے کھانا کھایا ہو، مطالعہ میں ایسے منہمک ہوتے کہ گردوپیش کی خبر نہ رہتی، سفر میں بھی کتابیں ان کے ساتھ رہتیں، لکھنے سے فارغ ہوتے تو مطالعہ میں مشغول ہو جاتے، مطالعہ کی یہ عادت اتنی پختہ تھی کہ اجلاس صد سالہ کی عظیم الشان مصروفیات اور گہما گہمی کے درمیان بھی یہ سلسلہ نہ ٹوٹا۔ راقم الحروف نے اپنے پندرہ روزہ اخبار ''اشاعت حق'' کا صد سالہ نمبر شائع کیا تو اسے لے کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت حضرت صد سالہ کی زبردست تیاریوں میں لگے ہوئے تھے میں قریب ہوا اور حضرت کو نمبر پیش کیا حضرت نے چند حوصلہ افزا کلمات فرمائے اور دعائیں دیں اور اسی عالم میں ''اشاعت حق'' کے مطالعہ میں مصروف ہو گئے، منتظر رہا کہ شاید کچھ اور فرمائیں گے مگر ان کے انہماک کو دیکھتے ہوئے خاموشی کے ساتھ اٹھ کر وہاں سے چلا آیا جس وقت میں وہاں سے اٹھا تو میں نے دیکھا کہ اخبار کے دو صفحات پڑھ چکے ہیں اور ان کے انداز سے یہ نہیں لگتا تھا کہ وہ جلد ہی مطالعہ ختم کر دیں گے۔

درس و تدریس میں ان کا اپنا ایک مقام تھا، بخاری شریف، حجۃ اللہ البالغۃ، مشکوۃ شریف، ترمذی شریف، کئی کتابیں مختلف اوقات میں زیر درس رہیں۔ مسند تدریس پر بھی ان کی انفرادیت مسلم ہے ایک کامیاب اور اعلیٰ مدرس کی تمام صفات ان کے اندر موجود تھیں، کتاب کی اہمیت، مصنف کے حالات، موضوع کا احاطہ، افہام و تفہیم کا خصوصی ملکہ، حل لغات کی رعایت، حاشیہ و متن پر غائر نظر، مسائل و مرادات کا کامل استحضار، بیان پر قدرت، طلبہ کی طلب اور درس کے تقاضوں کا بھرپور علم تھا ان کی انتظامی مصروفیات نے

تدریس کے لیے زیادہ وقت تو انہیں نہیں دیا مگر جتنا بھی انہوں نے اس کام پر لگایا وہ کار آمد، مفید اور نفع بخش وقت رہا، طلبہ نے ان سے خوب خوب استفادہ کیا۔ حضرت فقیہ الامت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ نے اپنے ایک شعر میں حضرت کے درس بخاری کا نقشہ یوں کھینچا ہے ؎

باب اول از بخاری درس داد آں خوش نظام

ذات وصفش ہست طیب، نائب خیر الانام

ان کی مجالس کا رنگ خالص علمی تھا اور یہ باوقار علمی مجلسیں عموماً بعدِ عصر ہوا کرتیں یہ مجالس علماء طلباء اور علم وفضل کے قدر دانوں کے لیے ایک نعمت تھیں، کبھی حضرت خود علمی مسائل پر گفتگو فرماتے، اور کبھی حاضرین کے سوالات اور اشکالات کے جوابات عنایت فرماتے، یہ مجلسیں ایک شیخ کامل، ایک مرشدِ وقت اور ایک صاحب نسبت بزرگ کی مجلسیں تھیں جہاں شریعت کی عظمتوں، تصوف وسلوک کے اسرار و رموز اور قرآن و حدیث کی تعلیمات کا غلبہ ہوتا، برسہا برس یہ سلسلہ جاری رہا اور تشنگانِ علم اس چشمۂ صافی سے پیاس بجاتے رہے، ان کی ان انمول مجلسوں کا ایک مجموعہ بنام "مجالس حکیم الاسلام" منظر عام پر آچکا ہے گو یہ مجموعہ ان تمام مجالس کا احاطہ نہیں کرتا مگر کسی نہ کسی حد تک ان مجالس کی اہمیت وافادیت کو ضرور اجاگر کرتا ہے۔

شعر وادب سے بھی حضرت کا گہرا تعلق تھا، خاص طور پر نعت اور حمد آپ کی محبوب صنف سخن تھیں، دیگر اصنافِ سخن پر بھی آپ نے طبع آزمائی کی ان کے متام تر شعری سرمایہ کی بنیاد اصلاح وتربیت پر ہے اکابر کی طرح حمد ونعت کو ہی انہوں نے اپنی فکری پرواز کا محور بنایا، مرشد کامل حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے لے کر حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تک اور اس کے بعد اکثر بزرگوں نے حمد ونعت کا سلسلہ جاری رکھا، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کی شاعری تو اپنا خاص رنگ اور کیفیت رکھتی ہے اور ان کے یہاں بعض ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جو شعر وفکر کی دنیا سے تعلق رکھنے

والے نامور افراد کے اشعار کے مقابلے میں نے بآسانی لکھے جاسکتے ہیں، حکیم الاسلامؒ کی شعریؒ اور فکری صلاحیتوں کا ذکر وقت کی معروف صاحب قلم اور صاحب علم شخصیت مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے جس وقیع انداز میں کیا ہے اس سے حکیم الاسلامؒ کی پختہ گوئی، برجستگی، سلاست اور روانی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ان کی نورانی، پاکیزہ اور قابل تقلید زندگی کے بہت سے دیگر خوشنما اور حسین عنوانات ہیں جن کو ایک سوانحی مضمون میں سمیٹنا ناممکن ہے۔ حکیم الاسلامؒ کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ۲۳/ سال ہو رہے ہیں۔ ۱۷/ جولائی ۱۹۸۳ء کو یہ صاحب علم و فضل انسان، جماعت شیخ الہند کا نورِ نظر، اکابر و اسلاف کی نشانی، ہندستانی مسلمانوں کی دینی اور مذہبی رہنمائی کا ایک نمونۂ کامل، تقریر و خطابت کا نامور شہ سوار، تحریر و قلم کی باعظمت ہستی عالم فانی سے عالم باقی کی طرف کوچ کر گئی۔ ۲۳/ سال کا عرصہ معمولی نہیں ہوتا، ان ۲۳/ سالوں میں راقم الحروف نے بلا مبالغہ دس مضمون تو حضرت پر لکھے ہیں اور ہر بار بہت سے لوگوں سے یہ سنا کہ ایک ہی شخصیت پر تم اتنا کیوں لکھتے ہو؟ میں آج تک ان حضرات کو اس سوال جواب تو نہیں دے سکا، مگر میرے ذہن کے کسی گوشے سے یہ آواز ضرور آتی ہے کہ جن افراد و اشخاص کو میں نے دیکھا ہے اور ایک بلند مرتبہ انسان کو جو تصور میرا ہے اس تصور میں کسی اور شخص کو میں شریک نہیں کر سکا جو معیار شخصیت کو پرکھنے کا ہے اس معیار پر کسی اور انسان کو میں نے نہیں پایا اس کو میری خوش گمانی یا عقیدت جو کچھ آپ کہہ سکتے ہیں، اس میں بااختیار ہیں۔

اس موقعہ پر اس افسوس کے اظہار پر بھی میں اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں کہ اس طویل عرصہ میں حضرتؒ کی کوئی مکمل اور وقیع سوانح منظر عام پر نہیں آسکی، قاسمی برادری کے ہزاروں قابل، باصلاحیت اور صاحب قلم افراد ہندوستان اور ہندوستان سے باہر موجود ہیں، مگر کوئی بھی اس کا ملکوانجام نہیں دے سکا، ایسا لگتا ہے کہ ذہنوں پر ابھی تک دھول جمی ہوئی ہے اور فضا ابھی بھی غبار آلود ہے، اس محرومی کا احساس اس وقت اور بڑھ

جاتا ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ گذشتہ دس سال کے عرصہ میں گذرنے والے اکابر علماء اور نامور افراد پر کافی چیزیں سامنے آچکی ہیں۔ حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ کی سوانح حیات، حضرت مولانا صدیق احمد باندویؒ پر کئی رسائل کے معیاری نمبر ،حضرت موالانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی سوانح اور نمبرات کی ایک طویل قطار، حضرت مولا ناوحید الزماں صاحب کیرانویؒ کا مفصل تذکرہ اور تو اور حضرت مولانا منظور نعمانیؒ صاحب پر بھی الفرقان کا اچھا خاصا نمبر آچکا ہے۔

حضرت حکیم الاسلام کی سوانح لکھنے کا کام بہت سے افراد انجام ید سکتے ہیں۔لیکن اس کام کے لیے اگر کسی موزوں شخص کا انتخاب کرنا ہو تو نگاہیں خود بخود ان حضرات کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ حیدار آباد میں محترم حضرت مولانا محمد رضوان صاحب قاسمی، دہلی میں قاسمی برادری کے بیشتر افراد، دیوبند میں حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم ،حضرت مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی، حضرت مولانا سید عبداللطیف صاحب، ناظم مظاہر علوم سہارنپور کے صاحبزادے مولانا سید عبدالرؤف صاحب، اور کویت میں مقیم مولانا بدرالحسن صاحب قاسمی بڑی خوبی کے ساتھ یہ کام کرسکتے ہیں۔حضرت مولانا محمد سالم صاحب دامت برکاتہم کے لیے تبلیغی اسفار اور انتظامی مصروفیات کی بنا پر یہ کام کٹھن ہے ان کی بہ نسبت حضرت مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی کے لیے راستہ سہل ہے۔مولانا سید عبدالرؤف صاحب عالی دفتر کی فائلوں اور کاغذات کے ڈھیر میں دبے ہوئے ہیں جہاں ان کی اعلیٰ فکری اور قلمی صلاحیتیں اگر سوئی نہیں تو غنودگی کا شکار تو ہو ہی گئی ہیں۔ حضرت مولانا بدرالحسن صاحب قاسمی مادّی سہولتوں اور آسائشوں کے حصول میں علمی دنیا سے دور ہوگئے ہیں اور دیوبند سے تو انہوں اپنا علمی رشتہ تقریباً منقطع ہی کرلیا ہے اس عالم میں خدا کرے کوئی صاحب ہمت قاسمی اٹھے اور اس معرکہ کو سر کرے۔

حکیم الاسلام

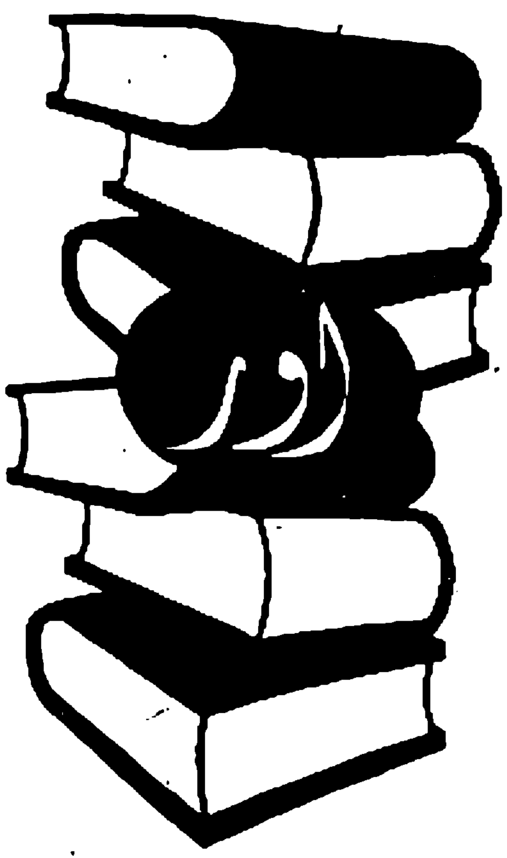

ان کی حکمت ریز تصانیف

حضرت قاری صاحب کی تصانیف پر ایک نظر

از قلم: مولانا اسیر ادروی استاذ جامعہ اسلامیہ بنارس

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی شہرت ایک سحر البیان خطیب اور شیوا بیان مقرر کی حیثیت سے تھی؛ ان کا ظاہری جاہ و جلال، حسن و جمال، رکھ رکھاؤ، لباس کی پاکیزگی وزیبائی، پر وقار چہرہ، عالمانہ تمکنت و وجاہت ان تمام خصوصیات نے مل جل کر ان کی شخصیت کو دل کش اور پر وقار بنادیا تھا، پہلی ہی نگاہ میں ان کو دیکھنے والا مرعوب اور متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، وہ ایک خطیب اور شیوا بیان مقرر کی جملہ خصوصیات سے متصف تھے: کشیدہ قامت دلکش شخصیت، سرخ و سپید چہرہ، مخصوص لب و لہجہ، واضح اور صاف لہجہ و آواز، انداز گفتگو میں توازن و اعتدال، خودداری و خود اعتمادی موضوع کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال احادیث و قرآن کے ایک ایک لفظ سے حکیمانہ نکتہ آفرینی خالص عالمانہ زبان میں حقائق و معارف اور اسرار و حکم کی ایسی نقاب کشائی فرماتے تھے کہ علماء، صلحا، وزہاد، اساتذہ علم وفن تو ایک طرف عوام اور کم پڑھے لوگ بھی مسحور ہو کر رہ جاتے تھے، زبان جادو کرتی تھی اور انداز بیان دلوں کو جیت لیتا تھا۔

الفاظ و معانی کے پھول برساتی ہوئی زبان، شان و شوکت سے مرصع و مسجع کلام، مخصوص لب ولہجہ، خاص طرز ادا کے ساتھ موضوع کے دائرے میں رہتے ہوئے ہر ممکن مواد کو سمیٹتی ہوئی، علم و حکمت کا نور بکھیرتی ہوئی چلی جاتی تھی، سلجھا اور نکھرا ہوا انداز بیان، معیاری اور دقیق عالمانہ زبان، پرشوکت الفاظ کے ساتھ حسن اخلاص مضمون سے لگن، موضوع سے وابستگی و وفاداری، علم کی گیرائی و گہرائی، مطالعہ کی وسعت، پیشکش کا خوب صورت سلیقہ دلوں پر سحر کرتا چلا جاتا تھا، ان کی دقت نظر سلامتی ذہن اصابت رائے، احتیاط و تنقید، اکابر علماء و بزرگان دین کی صحبت و تربیت، تقویٰ و طہارت،

اخلاص و بے نفسی، غیر جذباتی ٹھنڈی طبیعت علوم متداولہ پر عبور اور تبحر علمی سے متاثر ہوئے بغیر کوئی شخص رہ نہیں سکتا۔

حضرت قاری صاحب درحقیقت ممبر ومحراب کے بزرگ تھے، اسی میدان میں ان کے جوہر بھی کھلے کیوں کہ ان کا حقیقی میدان یہی تھا، اپنی زندگی اور ماحول، عہدہ و منصب، ذمہ داری وفرائض کے لحاظ سے بھی خطابت وشیوابیانی ان کی ضرورت تھی اور وہ ان کی ایک ذات کا ایک ضروری عنصر بن گئی تھی۔

قاری صاحب بحیثیت مصنف

اپنے فرائض وذمہ داروں کی مصروفیتوں اور طول طویل اسفار کے باوجود درجنوں کتابیں بھی یادگار چھوڑی ہیں، ہر کتاب اپنے مواد، اپنی معلومات، اپنے دلائل وبراہین، استنباط مسائل واستخراج نتائج حکیمانہ نکتہ آفرینیوں پرشوکت اور مرعوب کن کلامی مباحث کے لحاظ سے اپنا ایک خاص امتیاز ومقام رکھتی ہے، ان کتابوں کو پڑھ کر قاری محسوس کرتا ہے کہ دائرۂ معلومات میں بہت سی ایسی باتیں ضرور آگئی ہیں جن پر اب تک ان کی نگاہیں نہیں پڑی تھیں، ہر کتاب قاری صاحب کی مخصوص طرز وتحریر کے ساتھ عالمانہ محققانہ مباحث، زبان وبیان کی رعنائیوں اور دل آویزیوں سے آراستہ وپیراستہ ہے۔

قاری صاحب کی اکثر کتابوں کا اپنا اپنا ایک تاریخی پس منظر ہے ہر کتاب کسی ناگزیر ضرورت کے پیش نظر معرض تحریر میں آئی ہے، ایسا کم ہے کہ خود قاری صاحب کے ذہن نے کوئی علمی موضوع منتخب کیا ہو اور اس پر غور وفکر کے بعد اپنی کتاب مرتب کی ہو بلکہ اکثر ہوتا یہ رہا ہے کہ کسی نے ان سے علمی ومذہبی سوالات کیے یا ان کے گردوپیش کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ اس میں مسلمانوں کی رہنمائی کی شدید ضرورت محسوس ہوئی یا اسلامی حلقوں میں کسی فتنہ نے سر اٹھایا اور اس کے دفعیہ کی ایک عالم دین کی حیثیت سے ان پر ذمہ داری عائد ہوئی اور انہوں نے قلم اٹھالیا اور مختصر جواب یا مضمون کے بجائے ایک مستقل کتاب تیار ہوگئی۔

قاری صاحب عرصہ دراز تک اسلامی دنیا کے ایک عظیم ترین مذہبی ادارے کے سربراہ رہے جس ادارے سے وابستہ عام اہل علم کا ملک میں ایک اہم پُر وقار اور بلند علمی مقام تھا یہ ادارہ اپنی علمی و مذہبی خدمات اصلاح مفاسد و بدعات اور اسلامی دستور حیات و تعلیمات و روایات کو ہر قسم کی آمیزشوں اور آلائشوں سے پاک صاف، مصفّٰی و مجلّٰی رکھنے اور ان کو روشن و تابناک بنانے کی جہد مسلسل کی وجہ سے ایک مکتبۂ فکر بن گیا تھا، قدرت نے اس ادارہ میں ایسی عبقری شخصیتیں پیدا کیں جو اپنی بے پناہ علمی صلاحیتوں اور علوم اسلامی پر مبصرانہ نگاہ کی وجہ سے اپنے اندر اجتہادی شان رکھتے تھے، فرق باطلہ میں ان کی علمی شہرت نے زلزلہ ڈال دیا تھا ان کے لیے ان کی زبان ان کا قلم شمشیر براں کی تیزی اور رعد و برق کی کڑک اور گرج رکھتا تھا، انہی اسباب کی بنا پر اسلام پر اعتراض کرنے والوں نے بھی انہیں کو اسلام کے ترجمان کی حیثیت سے خطاب کیا، اپنے شکوک و شبہات اور اعتراضات انہیں کے سامنے پیش کیے اسی کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات و روایات سے محبت رکھنے والوں ان کو روشن و تابناک دیکھنے کی تمنا رکھنے والوں کی نگاہیں بھی انہیں کی طرف اٹھتی تھیں جب اسلام پر اور اس کی تعلیمات و روایات پر کسی طرف سے کوئی حرف آتا تھا۔

قاری صاحب تو اس ادارہ کے سربراہ ہی تھے، اس لیے قدرتی طور پر اس طرح کے سوالات ان کے سامنے پیش کیے جاتے تھے خود قاری صاحب اپنی ذہنی و طبعی ساخت و پرداخت اور ایک عظیم علمی سلسلۃ الذہب سے وابستہ ہونے کی حیثیت اور ذہن و مزاج کے لحاظ سے انہیں علماء کے گروہ میں شامل تھے، جنہوں نے کچھ ہی دنوں پہلے عیسائیت کے دہاڑتے ہوئے سیلاب کے آگے بند باندھا تھا، آریوں کی یورشوں اور بدزبانیوں کا سدباب کیا قادیانیوں کے طائر فکر و خیال کے پر نوچ کر ان کی قوت پرواز چھین لی تھی، انہی اسباب کی وجہ سے جب وہ ملک میں اصلاحی و تبلیغی دورے کرتے تھے تو ان سے ہر طرح کے لوگ ملتے تھے اور وہ اپنے اشکالات شکوک شبہات پیش کرتے تھے۔

ان شکوک وشبہات، اعتراضات واشکالات کو دور کرنا وہ اپنا مذہبی و دینی فریضہ تصور کرتے تھے اور اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے اور وہ ہاتھ میں قلم اٹھا لیتے تھے، عام طور پر قاری صاحب کی تصانیف کا یہی پسِ منظر ہے۔

میں نے قاری صاحب کی تصانیف کا تعارف کراتے ہوئے ان کے پسِ منظر بتانے کی بھی کوشش کی ہے تاکہ کتاب کے مباحث کو اس سے سمجھنے میں سہولت اور مدد ملے اور کتابوں کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے میرے سامنے قاری صاحب کی جو تصانیف ہیں میں نے انہی پر اظہارِ خیال کیا ہے اگر ان کی کچھ اہم تصانیف کا ذکر اس مضمون میں نہیں ہے تو یہ سمجھ لیجئے کہ مجھے وہ کتاب دستیاب نہیں ہوئی اور تا دمِ تحریر مجھے نہیں مل سکی۔

اجتہاد اور تقلید

ہندوستان میں تقلید وعدم تقلید کی بحث ایک صدی سے چلی آرہی ہے اس مسئلہ پر چھوٹی بڑی کتابیں لاتعداد ہیں، مباحثے ومناظرے بھی بڑی تعداد میں ہوئے جو بالعموم چند فروعی مسائل تک محدود رہے اس ماحول اور بحث و مباحثہ نے تعلیم وتعلم کے طریقوں کو بھی ایک خاص رنگ میں رنگ دیا، احادیث کے اسباق میں قراءت خلف الامام، آمین بالجہر، رفع یدین رکعات تراویح کی تعداد کے مسئلے پر اساتذہ دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں اور طلبہ کے ذہن میں ان مسئلوں کے سارے پہلوؤں کو اتنی تفصیل سے جاگزیں کر دیتے ہیں کہ ذہین طلبہ ان مسائل کے دلائل دونوں طرح کی حدیثوں کے درمیان تطبیق، احادیث کی صحت وضعف اس سلسلہ کے راویوں کی جرح وتعدیل تک سے واقف ہو جاتے ہیں، زیادہ تر یہ بحث انہی چند جزئی مسئلوں تک محدود رہتی ہے ان مسئلوں نے ہندوستان میں دو گروہ بنا دیئے جو آج تک قلمی معرکہ آرائیوں اور نبرد آزمائیوں میں مصروف ہیں، ان مسائل کی بحث بھی ناتمام ہے ایک صدی گذر چکی لیکن ہنوز روز اول سے، ہندوستان کی فضا میں اب بھی ھل من مبارزِ کی صدا گونجا کرتی ہے۔

ان دونوں گروہوں کا بنیادی اختلاف تقلید وعدم تقلید کا مسئلہ ہے جو اجتہاد کی

ضرورت اور اس کے شرائط کی تفصیلات پر منحصر ہے اگر یہ مسئلہ حل ہو جائے تو سارے مسائل از خود حل ہو جائیں، آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے تک ہندوستان کے مسلمانوں میں ساری تباہیوں اور بربادیوں کے باوجود اس بحث و مباحثہ سے دلچسپی باقی رہی اور اس دور کے ہر قابلِ ذکر عالم نے جس کے ہاتھ میں قلم تھا اس مسئلہ پر کوئی کتاب کوئی رسالہ ضرور لکھا شبلی جیسا مورخ اسلام اور محقق انسان بھی اس گروہ بندی اور ہنگامہ آرائی سے دامن نہ بچا سکا اور اسکات المعتدی لکھ کر ان مجاہدین کی صف میں شامل ہو گیا جو عدم تقلید کے خلاف مصروف جہاد تھی۔

قاری صاحب کا دور شباب اسی ماحول اور فضا میں گذر رہا تھا وہ کیسے اس سے دور رہ سکتے تھے، اس لیے اس فضا سے متاثر ہو کر آپ نے بھی ایک مختصر رسالہ اجتہاد و تقلید کے نام سے سپرد قلم کیا، اور حق یہ ہے کہ بحث کا حق ادا کر دیا، آپ نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے بدیع المثال نمونے پیش کیے ہیں جن کی طرف ابھی ایسی کوئی غائرانہ نظر نہیں ڈالی گئی تھی اور اپنی حکیمانہ نکتہ رسی کی وجہ سے مباحث کے ایسے ایسے پہلوؤں کو منصۂ شہود پر لائے ہیں جن کی طرف عام طور سے اہل علم کے ذہن نہیں گئے تھے اس رسالہ میں بھی انہوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی اور وہ راہ اختیار نہیں کی جس پر دوسروں کے ہزاروں نقوش قدم پہلے سے موجود تھے بلکہ انہوں نے اپنی راہ خود نکالی۔

آپ نے اصل بحث سے پہلے گفتگو کا آغاز تکوین و تشریع کے درمیان ایک تعلق خاص کو بتاتے ہوئے نتیجہ نکالا کہ جس طرح کائنات عالم کے کل مادے آب و خاک و باد آتش پھر مادوں کے کلی موالید جمادات نباتات حیوانات پھر ان کے علویات اور سفلیات پھر موالید جمادات، نباتات حیوانات پھر ان کے علویات اور سفلیات پھر موالید علوی و سفلی کی جامع انواع و اجناسِ انسان، شیر، بکری شجر، حجر، بحر و بر، جن و ملک، سیارات و ثوابت، ارض و سما وغیرہ وغیرہ کی یہ مجموعی ہیئت جسے عالم کہتے ہیں اب کوئی کمی بیشی قبول نہیں کر سکتے اسی طرح دین کے اصول و کلیات اساسی، قواعد و ضوابط اور تمام منصوص

عقائد واحکام کی اس مجموعی ہیئت کذائی میں جسے اسلام کہتے ہیں کوئی کمی بیشی اور ترمیم و تنسیخ نہیں ہوسکتی کیوں کہ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیلًا کہہ دیا گیا ہے۔

یہ نتیجہ نکالنے کے بعد قاری صاحب نے بتایا کہ جس طرح کائنات کا نظام درجہ تکمیل کو پہنچ جانے کے بعد اس میں تغیر وتبدل نہ ہوتے ہوئے بھی سیکڑوں اور ہزاروں پہلو ایسے ہیں جو اب تک نگاہوں سے مخفی ہیں اور جب غور وفکر سے کام لیا جاتا ہے تو ایسے ایسے عجائب و غرائب نگاہوں کے سامنے آتے ہیں جہاں تک عقل انسانی کی اب تک رسائی نہیں ہوئی تھی، اسی طرح تشریع کے منتظم احکام ومسائل اور قواعد وکلیات کے مخفی علوم واسرار کا پتہ لگا کر ان سے تدین کے نئے نئے فروعی مسائل لطائف وظرائف اور حقائق ومعارف پیدا کیے جاسکتے ہیں، تکوینی انکشافات کا نام ایجاد ہے اور تشریعی استخراج کا نام اجتہاد ہے۔

آپ نے کتاب میں آگے چل کر بتایا کہ اجتہاد کا رنگ ہر دور کی علمی ذہنیت اور تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے مجتہد انہی کے مسائل کے استخراج پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا ہے جن کی اس دور کو ضرورت ہوتی ہے اور جب ضرورت پوری ہو جاتی ہے تو اس کے بعد اجتہاد کا وہ دور نہیں لوٹتا جو آچکتا ہے کیوں کہ زمانہ کو بات حاصل ہو چکی ہوتی ہے اب صرف اس سے نفع اٹھانے کا موقع رہ جاتا ہے، آپ نے مزید ارقام فرمایا کہ ہر دور میں مسلمانوں میں دو طبقے رہے ایک وہ جن میں قدرت نے استنباط واستخراج مسائل کی فطری صلاحیت و ودیعت کردی تھی اور دوسرے وہ لوگ جو اس نعمت عظمیٰ میں ان کے شریک نہیں تھے، جن کی احادیث کے ذخیرہ پر نگاہ ہے وہ جانتے ہیں کہ صحابۂ کرام میں بھی دو طبقے موجود تھے، بعض صرف حافظ حدیث تھے اور بعض فقیہہ ومجتہد تھے جیسے ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابن مسعودؓ، حضرات شیخین رضی اللہ عنہم، پھر فقہائے صحابہؓ میں بھی فرق مراتب تھا بعض کے ذہن کی رسائی بہت گہری تھی اور بعض کی اس سے کم کیوں کہ ملکۂ اجتہاد وہبی ہوتا ہے کسبی نہیں، بعض اس کے اہل ہوتے ہیں بعض نہیں، احادیث قرآن اور واقعات صحابہؓ سے بہت سی مثالیں دیتے ہوئے اس فرق مراتب کو آپ نے واضح کیا ہے۔

فرق مراتب کی موجودگی نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر اجتہاد ضروری ہے تو تقلید بھی ضروری ہو جاتی ہے کہ قدرت نے جن لوگوں کو قوت اجتہاد نہیں دی ہے ان کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں جو اس کی دسترس سے باہر تھا مجتہد کی تقلید کرے اور اس پر عمل کرے جب خود علم نہیں رکھتا ہے تو علم والے کی اتباع کرے خود ان مخفی دلائل و علل تک نہیں پہونچ سکتا ہے تو دانایانِ اسرار و علل کے سامنے جھک جائے کیوں کہ علم کے دو ہی مرتبے ہیں یا تو خود سمجھنا یا سمجھے ہوئے لوگوں کی اطاعت کرنا اس کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے فَاسْئَلُوا اَهْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اس دعویٰ کی تائید کے لیے شاہد عادل ہے۔

اسلامی تاریخ سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ قرونِ اولیٰ میں بھی یہی صورت حال رہی اگر کوئی صحابی مجتہد ہے تو دوسرے صحابی مجتہد صحابی کے قول پر عمل کرتے تھے واقعات شاہد ہیں عبد اللہ بن عمر سے پوچھا گیا کہ قرض دینے والا قرض کی مدت سے پہلے قرض ادا کرنے پر قرض کا کچھ حصہ کم کرنے کے لیے تیار ہے تو کیا یہ درست ہوگا، آپ نے اس کو نا پسند فرمایا اور ایسا کرنے سے منع کیا جب کہ اس سلسلہ میں کوئی مرفوع حدیث موجود نہیں تھی ظاہر ہے کہ یہ ان کا اجتہاد تھا، اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کو اس شرط پر غلہ دیا کہ وہ دوسرے شہر میں اس کو ادا کرے گا حضرت عمرؓ نے منع فرمایا اور کہا کہ بار برداری کا کرایہ کہاں گیا؟ اس مسئلے میں بھی کوئی حدیث مرفوع حضورؐ سے مروی نہیں، کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ حضرت عمر کا اجتہاد تھا مذکورہ بالا دونوں مسئلوں پر عمل کیا گیا سامعین نے حضرت عمرؓ اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی باتیں مانی اور انہیں پر عمل کیا، سوال کرنے والوں نے ان حضرات سے دلیل کا مطالبہ نہیں کیا حالانکہ سائل و مسئول دونوں صحابی ہیں لیکن ایک میں اجتہادی ملکہ تھا دوسرے میں نہیں اس لیے جو اہل علم نہیں تھے انہوں نے اہل علم کی رائے پر عمل کیا اور ان کی اتباع کی۔

آپ نے اس شبہ کا ازالہ بھی دلائل و براہین کی روشنی میں بہت واضح طور پر کر دیا

کہ اجتہاد کا دروازہ ہر ایک کے لیے کھلا ہوا ہے اور ہر ابجد خوان مدعی اجتہادی بن جائے، شریعت اسلامیہ میں اس کی گنجائش نہیں ہاں عام تحقیق وتلاش کتاب وسنت میں تدبران کے لطائف وحقائق کا استخراج ہر زمانہ کے تکوینی حوادث سے تشریعی مسائل کو تطبیق دے کر مناسب فتویٰ دینا معاندین اسلام کے نئے نئے شکوک وشبہات اور اعتراضات کی تردید کے لیے نصوص شرعیہ سے استنباط کرنا، اصول اسلام کے اثبات اور تحقیق کے لیے کتاب وسنت سے تائید پیدا کرنے کا کام باقی ہے اور ہر دور میں اہل علم کے لیے میدان کمال باقی ہے، اجتہاد کی یہی نوعیت کل بھی تھی اور آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی اجتہاد کی بحث سے لازمی طور پر ہر شخص کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ مجتہدین کی رایوں میں اختلاف کی صورت میں تو سوائے امت کی تفریق کے اور کیا حاصل ہوگا، امت میں اختلاف ہے کہ شریعت کے احکام کی کوئی معین صورت اور تحقیقی شکل باقی نہیں رہے گی، یہ اختلاف رحمت کے بجائے زحمت بن جائے گا اس خلجان کو دور کرنے کے لیے قاری صاحب نے ایک لطیف اور دقیق بحث چھیڑی ہے اور انہوں نے عقل ودرایت کی روشنی میں اسے امت کے لیے رحمت ہی ثابت کیا ہے اسی مسئلہ کو واضح کرنے کے لیے آپ نے جو مقدمات ترتیب دیئے ہیں عقل کو اپیل کرنے والے ہیں اس لیے آپ نے ان مقدمات سے جو نتیجہ نکالا ہے عقل اسے از خود قبول کر لیتی ہے۔

قاری صاحب نے اس دکھتی ہوئی رگ پر بڑے ماہرانہ انداز میں نشتر لگائے ہیں جس کو تقلید شخصی کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے، آپ نے محکم دلائل سے یہ ثابت کر دیا کہ اجتہاد مشروع ہے اجتہادیات پر عمل بھی مشروع ان کا مجموعی ذخیرہ فراہم کرنا بھی شرعی چیز اس مجموعہ کا نام رکھنا بھی شرعی بات ہے تو اس کے بعد آپ نے بتایا کہ اجتہادیات میں غیر مجتہد کے لیے تقلید کرنا بھی ناگزیر اور ضروری ہو جاتا ہے یہ صحیح ہے کہ اجتہادی مسئلوں میں دو رایوں یا اس سے زیادہ کا ہونا فطری اور قدرتی بات ہے اور وہ دائرہ شرع میں داخل ہے تو ایسے اختلافی مسائل میں تقلید شخصی بھی ضروری ہو جاتی ہے، آپ نے عقلی مقدمات

ترتیب دے کر بطور نتیجہ ثابت کیا ہے کہ ایک مسلمان کے لیے تقلید شخصی کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے اگر ایک شخص اپنی صوابدید کے مطابق کسی مسئلہ میں کسی امام کی رائے پر عمل کرتا ہے اور دوسرے مسئلہ میں دوسرے ائمہ کی تقلید کرتا ہے تو وہ تقلید شخصی ہی تو ہوتی ہے کیونکہ دو متخالف رایوں پر بیک وقت عمل ممکن نہیں ہے اس لیے جب کسی مسئلہ خاص میں کسی امام کی رائے ترک کر کے دوسرے امام کی رائے پر عمل کرتا ہے تو وہ بھی تقلید شخصی ہوئی فرق یہ ہے کہ پہلے امام کے بجائے اب اس نے دوسرے امام کی رائے قبول کر لی ہے پہلے امام کی رائے کو ترک کر دیا ہے۔

سب سے آخر میں آپ نے اس بحث کو چھیڑا ہے جو حاصل کلام ہے اور جس کے لیے یہ کتاب معرض وجود میں آئی ہے اور وہ مسئلہ ہے امام واحد کی تقلید کا اگر تقلید ضروری ہے تو پھر ایک ہی امام کی تقلید کیوں ضروری ہے ظاہر ہے کہ ہر امام اور مجتہد کا اہل علم میں شمار ہے اور جن میں اجتہاد کی صلاحیت نہیں وہ اہل علم نہیں ٹھہرے اب وہ کسی بھی اہل علم یا مجتہد کی رائے پر عمل کرتا ہے تو اس کا یہ فعل عین شریعت اور منشاء شریعت ہونا چاہئے ایک شخص بعض مسائل میں ابوحنیفہ کی تقلید کرتا ہے اور بعض مسائل میں امام مالک کی رائے پر عمل کرتا ہے ہر حال میں وہ مجتہد اور اہل علم ہی کی رائے پر عامل ہوتا ہے پھر یہ بات اس کے لیے ممنوع کیوں ہوگئی جب کہ وہ **فاسئلوا اھلِ الذکرِ اِنْ کنتم لا تعلمون** پر عمل کرتا ہے۔

قاری صاحب نے اس بحث کو بڑی تفصیل سے تحریر فرمایا ہے، اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بیک وقت ایک سے زیادہ ائمہ کی تقلید کی صورت میں بعض مسائل میں جزئیاتی تناقض ہو گا، بعض میں ان جزئیات کے کلیوں اور اصولوں میں تناقض نمایاں ہوگا اور پھر اس دعویٰ کو درجنوں مثالوں سے واضح کیا ہے اور تناقض کی مختلف صورتوں کو تحریر کیا ہے پھر بتایا ہے کہ کسی مجتہد کے مزاج میں توسیع کا غلبہ ہے اور کسی کے مزاج میں احتیاط کا، کسی میں شدت ہے کسی میں جمعیت کا غلبہ ہے اور کسی میں جامعیت کا، کسی میں دیانات کا وفور ہے اور کسی میں اس کے ساتھ سیاست و نظم اور اجتماعیات کا بھی اعلیٰ شعور ہے کسی میں ظاہریت کا غلبہ

ہے اور کسی میں باطنیت کا، کسی میں تاسّی باسوق السلف کا غلبہ ہے اور کسی میں رجحانات سلف کے تتبع واستقرار کا، ظاہر ہے کہ جہاں ظاہریت غالب ہوگی وہاں سب سے بڑی مرجع ظواہر روایت ہوں گی اور جہاں باطنیت کا غلبہ ہوگا وہاں سب سے بڑا مرجع بواطن روایت یعنی درایت ہوگی جس امام کی جو ذہنی خصوصیت ہوگی وہی اس کے اصول استنباط سے چھنے گی اور پھر وہی خصوصیات ان اصولوں کے تحت مستنبط شدہ جزئیات سے مترشح ہوں گی اور انہیں خصوصیات کا خاص رنگ بالآخران افراد کی ترتیب کرے گا جو اس فقہ پر عامل ہوں گے، ایک سے زائد امام کی تقلید کرنے والا ہر جگہ متضاد خصوصیات کے مابین متعارض جزئیات کا شکار ہو کر پھر کلیاتی تناقض کا شکار ہوگا اس مقلد میں دو ذوقی رنگ اپنے تناقض کے ساتھ جمع ہونے کی کوشش کریں گے جس کا لازمی نتیجہ روحانی مزاج میں فساد ہوگا اور دو متضاد اثرات کی کشاکش میں گرفتار ہو کر پراگندہ حال بن جائے اور اس میں عملی فساد پیدا ہو جائے اس طرح شریعت اسلامیہ کی طرف سے عائد کردہ فرائض کی اصل روح اس کے عمل سے ختم ہو جائے گی اور شریعت بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گی۔

قاری صاحب نے اس پامال موضوع پر اپنے نکتہ آفریں دماغ اور دقیقہ رس نگاہ سے کام لے کر روایت ودرایت کی روشنی میں اتنی لطیف بحث کی ہے کہ عقل اس سے حاصل شدہ نتائج کو قبول کرنے کے لیے مجبور ہو جاتی ہے اب تک اس مسئلہ پر اردو میں بہت کم ایسی کتابیں وجود میں آئی ہیں اپنے متکلمانہ انداز بیان میں روایات وآیات قرآنی سے ایسے لطیف نکتے پیدا کرتے ہیں جہاں تک عام اہل علم کے ذہنوں کی رسائی مشکل سے ہوتی ہے پوری کتاب استخراج نتائج کے اس خصوصی پہلو کے لحاظ سے شاہکار ہے۔

علم غیب

ہندوستانی مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا ہے جو اسلامی تعلیمات و روایات میں عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح افراط وتفریط کا شکار ہے، عقائد ومسائل میں یہ افراط وتفریط اس کے ذہن کی پیداوار اور اس کی کم فہمی وکوتاہ علمی کا نتیجہ ہے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان پر ایمان لانے والے

تو کم ہی رہے اور اتنی تعداد بھی نہ ہو سکی کہ وہ اپنے پیغمبر کو دشمنوں سے بچا سکیں جب وہ پھانسی پر چڑھانے کے لیے لے جا رہے تھے اور جب یہودیوں نے اپنے خیال کے مطابق پھانسی دیدی تو پھانسی کی لکڑی ساری دنیا کے عیسائیوں کے گلے کا ہار بن گئی صلیب یا کراس ہے جو ان کے مذہبی شعار میں داخل ہو گئی ایک طرف تو ان کو پیغمبر تک ماننے میں تأمل رہا اور جب پیغمبر ماننے پر آمادہ ہوئے تو ان کو اتنا بڑھایا کہ خدا بنا دیا، آج پوری عیسائی دنیا اسی وجہ سے تثلیث کے شرک میں گرفتار ہے یہ افراط اور غلو محبت کے اظہار کی حد ہے، جب تک پیغمبر نہیں مانا تو کافر مطلق رہے اور جب ان کی عظمت کو پہچاننے کی گھڑی آئی تو مشرک مطلق ہو گئے، کچھ یہی حال ہندوستان میں اس گروہ کا ہے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت، علوم اسلامی کی تعبیر و تشریح، احادیث و قرآن کی تفسیر و تشریح، اسلام دشمن فرقوں اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے، دوسرے مذاہب کے اہل علم کے اسلام اور بانیٔ اسلام حضور اکرم ﷺ پر اعتراضات کے جوابات دینے، ملک میں اسلام اور مسلمانوں اور ان کے شعائر کو محفوظ کرنے کا کوئی کام بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنے ذمہ نہیں سمجھتے، مسلمان تباہ ہوتا ہے ہونے دو، جبر کے ہاتھوں مجبور ہو کر مرتد ہوتا ہے ہو جائے، مسجدیں اصطبل بنا دی جائیں ہو جانے دو مسلمانوں کی جان مکھی مچھر سے زدیادہ کم قیمت بنا دی جائیں، بن جانے دو اسلام کا نام لینے والوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا جائے ان کی بلا سے ان کو نہ ان باتوں کا غم ہے اور نہ پروا، نہ اس کی صلاحیت نہ جذبہ، لیکن جب رسول اکرم ﷺ کی ذات سے زبانی دعویٰ محبت کے اظہار پر آمادہ ہوئے تو ان کو رسول اور پیغمبر کے بجائے خدا اور خدائی طاقت و قوت کا مالک بنا دیا اور ساری صفات خداندی کو حضور ﷺ کی ذات سے وابستہ کر دیا۔ ؎

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر ❁ اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

وہ مالک کائنات بھی ہیں اور مختار کل بھی اور جنت و دوزخ کی کنجی بھی آپ کے دست مبارک میں ہے اور ہر جگہ حاضر و ناظر بھی، ازل سے ابد تک کا پورا علم بھی ہے اور

سارے مغیبات کا اسی طرح علم رکھتے ہیں جیسے خداوند قدوس کا علم محیط ہے جس کو چاہیں جنت دے دیں جس کو چاہیں جہنم میں بھیج دیں، وغیرذالک۔

اسی گروہ نے علم غیب کے مسئلہ کو پیدا کیا ہے اس مسئلہ پر چھوٹی بڑی اتنی کتابیں، رسالے، اور مضامین اردو میں لکھے جا چکے ہیں کہ مزید اس پر اضافہ کی گنجائش نظر نہیں آتی، اور یہی وجہ ہے کہ اب اس مسئلہ پر کوئی نئی کتاب سامنے نہیں آئی ہے اور فضا میں ایک طرح کی خاموشی ہے، قاری صاحب نے آج سے بہت پہلے جب ملک میں اسلامی ذہن رکھنے والوں اور دل و دماغ سے سوچنے والوں اور پیٹ سے سوچنے والوں کے درمیان معرکہ کارزار گرم تھا تو آپ نے علم غیب کے نام سے یہ کتاب لکھی تھی اور شائع تو اور بعد میں ہوئی جب شوروغوغہ ایک حد تک خاموش ہو چکا تھا۔

"علم غیب" کسے کہتے ہیں؟ قاری صاحب نے بات یہیں سے شروع کی ہے، قدیم علماء کی کتابوں سے علم غیب کے مفہوم کو واضح طور پر پیش کرتے ہوئے حاصل کلام یہ بتایا کہ غیب وہ ہے جو انسان کی اپنی کسی بھی ادراکی قوت سے خواہ ظاہری ہو یا باطنی حاصل نہ ہو سکے اور حواس وعقل اور کشف اکتشاف سے بالاتر ہو اور جب علم غیب کا یہ معنی متعین ہو گیا تو علم غیب کے لیے جو وسائل امت کے حق میں منفی ہیں یعنی عقل ونظر فکر و بصیرت وغیرہ وہ نبی کے حق میں بھی بدستور منفی رہیں گے کہ انبیاء کو بھی ان وسائل سے علم غیب حاصل نہیں ہوگا البتہ غیب کی خبر پیغمبر کے بجائے پیغمبری ورسالت ونبوت خدا کی خبر اور علم غیب کا ذریعہ بنیں گی جس کو وحی کہتے ہیں، معلوم ہوا کہ مخلوق کے لیے علم غیب کا ذریعہ صرف وحی ہے جو پیغمبر پر براہ راست آتی ہے اور امتی کو پیغمبر کے ذریعہ سے اس طرح نبی اور امتی صرف خدا کی اطلاع ہی سے غیب پر مطلع ہو سکتے ہیں خود اپنی کسی ادراکی قوت، عقل ونظر یا حس و وجدان سے مطلع نہیں ہو سکتے اور ظاہر ہے کہ علم غیب وہی کہا جائے گا جو بلا واسطہ اسباب ہو اور جب وہ بالواسطہ آئے گا تو حقیقی معنی میں علم غیب نہیں ہوگا، اہل اللہ کو کشف والہام کے ذریعہ کسی بات کا علم ہو جائے تو لغتاً اسے علم غیب کہیں

گے کہ غیبی امور کا انکشاف ہوا لیکن شرعاً علم غیب نہیں کہیں گے علم کے جملہ حسی وسائل ہوں یا معنوی، کھلے ہوئے ذرائع ہوں یا چھپے ہوئے ان سے حاصل شدہ علم کو شرعاً علم غیب نہیں کہا جائے گا اور ظاہر ہے کہ جب اصطلاحاً علم غیب وہی ہوگا جو عادی وسائل سے بالاتر ہوکر بلا توسطِ اسباب از خود ہو تو اس معنی میں علم غیب بجز ذات بابرکات خداوندی اور کسی کے لیے نہیں ہوسکتا کیوں کہ غیر خدا کو جب بھی علم ہوگا اور جیسا بھی ہوگا وہ عطاء الٰہی ہوگا اور وسائل واسباب میں سے کسی نہ کسی وسیلہ کے واسطے ہوگا خواہ وحی سے ہو یا کشف والہام سے تجربے سے ہو یا حواس سے یا عقل وخرد سے، ظاہری اسباب کے راستہ سے ہو یا باطنی اور معنوی اسباب کے طریق سے، ظاہر ہے کہ ان معنوں میں علم غیب خاصۂ خداوندی نکل آتا ہے۔

قاری صاحب نے اپنے دعویٰ کو متعدد آیتوں سے مدلل ومبرہن کیا ہے، الفاظ قرآنی سے ایسے حکیمانہ نکتے اور الفاظ کی معنوی وسعت کو ظاہر کرتے ہوئے اس کے حقیقی مقصود کو اس طرح واضح کیا ہے کہ دل استدلال واستنباط نتائج سے قطعی طور پر مطمئن ہو جاتا ہے، آیتوں کی تفسیر وتشریح کرتے ہوئے آیت کے ایک ایک لفظ اور آیتوں کے انداز بیان سے غیر اللہ سے علم غیب کی کلی نفی اور اس سے متعلق ہر ہر شبہ کا حل اور ذہنی خلجان کو دور کردیا ہے اور تمام شرک آمیز تصورات کا قلع قمع کردیا ہے۔

قرآن کی آیتوں میں کئی مقامات پر علم غیب پر رسولوں کو مطلع کرنے کا ذکر آیا ہے اس سے عام ذہن میں یہ خیال آسکتا ہے کہ جب ذات خداوندی عالم الغیب ہے اور اس نے اپنے علم غیب پر رسولوں کو مطلع کردیا ہے تو خدا اور رسول دونوں علم غیب میں برابر ہوگئے زیادہ سے زیادہ ایک کا علم ذاتی ہوگا اور دوسرے کا عطائی لیکن علم میں مساوات تو پیدا ہو ہی گئی اور یہ سراسر مشرکانہ عقیدہ ہے کہ عبد ومعبود دونوں میں کسی طرح مساوات ثابت کی جائے۔

قاری صاحب نے اس بحث کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے اور خود آیت ہی کے لفظوں سے اس ذہنی خلجان کو واضح طور پر دور کردیا ہے اس سلسلہ میں آپ نے تحریر کیا ہے کہ اظہار

غیب کے موقعہ پر رسول کا لفظ قرآن میں ذکر کیا گیا ہے یعنی جس ذات پر غیب کو ظاہر کیا گیا ہے وہ وصف رسالت سے متصف ہے، یعنی اطلاع غیب کی مستحق اور متقاضی کسی رسول کی ذات نہیں بلکہ وصف رسالت اور عہدہ و منصب نبوت ہے اسی وجہ سے خصوصیت کے ساتھ اس موقعہ پر لفظ رسول لایا گیا ہے اور یہ بالکل واضح اور ہر شخص جانتا ہے کہ رسول کی رسالت کا موضوع اور مقصد وحید اصلاح خلق اللہ ہے اور بندگان خدا کو راہ حق کی طرف رہنمائی اور ان کی تربیت و تکمیل ہے اس لیے وصف رسالت کا قدرتی تقاضا وہی علوم غیب ہو سکتے ہیں جو کہ ہدایت و اصلاح میں کارآمد ہوں اور جن علوم غیبیہ کا اصلاح و تربیت میں دخل نہ ہو اس سے وصف رسالت کو خود ہی سروکار نہ ہوگا، مغیبات میں سے قیامت کے وقت، اس کی تاریخ و سنہ یا اس کی مدت کے قرب و بعد کی اگر رسولوں کو اطلاع نہ ہو جیسا کہ قرآن کی متعدد آیتوں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا علم کسی کو نہیں دیا گیا ہے اسی طرح ان بے شمار کائناتی حوادث اور جزئیات کا انہیں علم نہ ہو جو روزمرہ دنیا میں رونما ہوتی رہتی ہیں تو یہ ان کے حق میں نہ صرف یہ کہ کسی طرح کا نقص نہیں بلکہ ان امور کا علم نہ ہونا ہی ان کے وصف رسالت کا ایک طبعی و فطری تقاضا ہے۔

جب رسولوں کو علم غیب کی صرف وہی قسم دی گئیں جن کا ان کے منصب رسالت سے تعلق ہے اور بقیہ مغیبات کا علم نہیں دیا گیا کیوں کہ ان کے منصب نبوت کو ان کی ضرورت ہی نہیں تھی تو پھر اس سے نبی ﷺ کی شان میں نقص کہاں لازم آتا ہے، ان حقائق کے ہوتے ہوئے رسول کے لیے جمیع ما کان و ما یکون کے علم کا دعویٰ وہی شخص کر سکتا ہے جو قرآن کے اسلوب بیان اور شریعت خداوندی کے مزاج سے ناآشنا اور وصف رسالت کے فطری تقاضوں سے بے خبر ہو۔

قرآن و حدیث، عقل و نقل سے علم غیب کے مسئلہ کی صحیح صورت پیش کر کے آخر میں تحریر کیا کہ قرآنی تصریحات و تلمیحات کے ہوتے ہوئے حضرت سید الاولین والآخرین حضور ﷺ کے لیے علم غیب کا دعویٰ اور وہ بھی علم کلی اور علم ما کان و ما یکون کی

قید کے ساتھ نہ صرف بے دلیل بے سند بلکہ مخالف دلیل معارض قرآن اور اس توحیدی شریعت کے مزاج کے خلاف ہونے میں اب کوئی شبہ باقی نہیں رہا ——— علم ما کان وما یکون حضور ﷺ کے لیے ثابت کرنے کی غرض سے بعض احادیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے قاری صاحب نے بالاستیعاب ان دلائل کا علمی جائزہ لیا ہے اور ہر ایک کا شافی اور مدلل و مبرہن غیر مبہم الفاظ میں رد کیا ہے۔

بحث کے آخر میں آپ نے حکیمانہ انداز میں مسئلہ غیب پر روشنی ڈالی ہے اور عقل و درایت کی کسوٹی پر اس مسئلہ کو پرکھ کر کھوٹے اور کھرے کو علیحدہ علیحدہ کر دیا ہے اس سلسلہ میں علم غیب کی حقیقت و ماہیت کو پیش کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ عقلی طور پر بھی علم کلی مخلوق کے لیے ممکن نہیں، آپ نے نظام کائنات کی قدرتی ترتیب کو پیش کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ ایک حقیر سے حقیر جزئی کا بھی علم وادراک اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک موجودہ اور ممکنہ کائنات کا یہ سارا کلیاتی نظام اپنی حقیقت سمیت علم میں نہ آجائے اور ذہن ان سارے حقائق وکلیات کا احاطہ نہ کرے اور یہ انسانی بساط اور بشری حد سے باہر ہے، یہ کلامی اور فلسفیانہ بحث پچاسوں صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور یہ کتاب کا آخری حصہ اتنا بلند اور دقیق ہے کہ جن لوگوں کے دل و دماغ کی تطہیر کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے ان کے مبلغ علم سے کہیں بلند اور دقیق ہے، لیکن جو لوگ منقول و معقول دلائل کے متلاشی ہیں ان کے لیے یہ کتاب تسلی بخش دلائل فراہم کرتی ہے اور ذہن کے سارے خلجان کو دلیل و برہان کی روشنی میں دور کرتی ہے اور مسئلہ کے صحیح پہلو کو متعین کرتی ہے متکلمانہ بحث دیکھ کر مفکر اسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی یاد آجاتی ہے جنہوں نے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی اور دشمنانِ اسلام کے منہ بند کر دیے قاری صاحب نے بھی اس سے حظ وافر پایا ہے یہ کتاب دیکھ کر یہ یقین کرنے پر دل مجبور ہے۔

اسلام کا اخلاقی نظام

ہندوستان میں انگریز آئے تو ان کے ساتھ ہی عیسائیت بھی آئی دونوں کو ایک دوسرے کے سہارے

کی ضرورت تھی عیسائی مذہب کی سرگرمیوں اور ہنگامہ آرائیوں کا مقصد سیاسی استحکام کے سوا اور کچھ نہیں تھا، مگر بڑے پیمانے پر عیسائی پادریوں کی فوج تیار کی گئی اور اس نے ہندوستان میں مسلمانوں سے پنجہ آزمائی شروع کر دی بڑے بڑے مناظرے ہوئے، قدرت بھی وقت کے لحاظ سے افراد پیدا کرتی ہے علماء اسلام میں بھی ایسے افراد پیدا ہوئے جنہوں نے عیسائیت کی تار پود بکھیر کر رکھ دی مگر پھر بھی عیسائیت نے ہندوستان میں اپنے قدم جما لیے اور لاکھوں ہندوستانی عیسائی ہو گئے ہندوستانی عیسائیوں میں بھی کچھ پڑھے لکھے تھے انہوں نے بھی مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ جاری رکھی اسی طرح ایک پادری نے رڑکی سے قاری صاحب کو ایک خط لکھا جس میں اس نے اسلام پر کچھ اعتراضات کیے اور اسلام کے اخلاقی نظام کو اپنا نشانہ بنایا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام سے عیسائی کا نظام اخلاق کہیں بہتر اور برتر ہے، اس خط میں سب سے اہم اور بڑا اعتراض حضرت زینب سے حضور ﷺ کے نکاح پر تھا کہ آپ نے زینب کے حسن سے متاثر ہو کر ایک مسلمہ اصول کو نظر انداز کر دیا اور اپنے منھ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا جب کہ خود عرب میں بھی یہ معیوب تھا لیکن زینب کے حسن نے آپ کے دل میں اپنی جگہ بنالی تھی اور چاہتے تھے کہ کسی طرح زینب سے نکاح کر لیں قرآن نے خود کہا کہ آپ دل میں جو کچھ چھپا کر کھتے ہیں اللہ ان کو ظاہر کر دینے والا ہے **تُخفی فی نَفسِك و اللّٰهُ مبدِیهِ** قرآن میں موجود ہے اس نے خط میں کہا کہ "قرآنی اخلاقی معیار ایک عجیب چیز نظر آتی ہے جب بیٹے کی بہو پر طبیعت مچل گئی تو پھر آسمانی وحی نے ساری روحانیت نیکی اور سچائی پر ایسا بھاری پردہ ڈال دیا کہ تمام دین داری چھپ گئی اور اپنے بیٹے کی بہو کو اپنی بیوی بنانے کا حق اللہ میاں سے حاصل ہو گیا آپ کو ماننا پڑے گا کہ زید کی بیوی کا نبی کی جورو بنا دینے کا حکم غلط ہی نہیں بلکہ گناہ اور زنا کاری کو فروغ دینا ہے کیوں کہ خدا ایسی بات کبھی نہیں کر سکتا کہ ایک موزوں جوڑے کو توڑ کر ایک نہایت غیر موزوں جوڑا بنا دے۔

اس کے بعد پادری نے قرآنی نظام اخلاق کے مقابلہ میں بائبل کے بیان کردہ

نظام اخلاق کے دس اصولوں کو ترجیح دی ہے بائبل کے اس اصولوں میں سے چوری نہ کر، زنا نہ کر، خون مت کر خاص طور سے ذکر کیا ہے۔

قاری صاحب نے اولاً بائبل کے حوالے سے پیش کردہ دس احکام کو معیار اخلاق قرار دینے پر جو گفتگو کی ہے اس سے محسوس ہوا ہے کہ قاری صاحب انیسویں صدی میں عیسائیوں سے ہونے والے معرکۃ الآرا مناظروں کی بحثوں سے پورے طور پر واقف ہیں جن میں اسلامی مناظروں کے مستحکم دلائل کی قوت ان کی تاثیران کی اثر اندازی نے عیسائی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا اور جس کی وجہ سے ہندوستان سے یورپ تک کے عیسائیوں کے دل ودماغ کو لقوہ مار گیا اور میدان مناظرہ سے عیسائی مناظرین اس طرح سرپٹ بھاگے کہ قرآن نے باطل کے فرار کی جو محاکات کی ہے اس کا پورا نقشہ سامنے آگیا ''جاءَ الحقُّ و زَهَقَ الباطلُ اِنَّ الباطلَ كَانَ زَهُوقاً''۔

قاری صاحب نے اصل مسئلہ پر گفتگو سے پہلے موجودہ بائبل کو ناقابل اعتبار قرارا دیتے ہوئے انہیں ناقابل شکست دلائل سے اس کو محرف ثابت کیا جو ان کے اسلاف نے عیسائی دنیا کے سامنے پیش کیے تھے جس کے بعد رعد و برق کی طرح کڑکنے اور گرجنے والے عیسائی مناظرین میں شہر خموشاں کا سکوت اور قبرستان کا سناٹا چھا گیا تھا، بائبل کی تحریف کے ثابت کرنے کے باوجود بائبل کے حوالے پیش کردہ ان دسوں احکام کے بارے میں تحریر کیا کہ یہ امور نہ خود معیار اخلاق ہیں اور نہ معیار اخلاق بن سکتے ہیں کیوں کہ یہ دس باتیں مثلاً تو چوری مت کر، تو زنا مت کر، تو خون مت کر از قسم افعال ہیں جن کا تعلق نہ کرنے سے ہے از قسم اخلاق نہیں ہیں جو خلقی مادے ہیں اخلاق کی حیثیت بیج کی سی ہے اور قلب اس کے لیے زمین ہے۔

جب یہ بیج اس جڑ کو پکڑ لیتا ہے تو اس بیج سے شاخیں پھوٹتی ہیں، شاخوں سے تخم نہیں بنا کرتا اس لیے افعال تو اخلاق سے سرزد ہو سکتے ہیں لیکن افعال سے اخلاق پیدا نہیں ہوتا، آدمی میں خلق شجاعت ہے تو اس سے حملہ کرنے کا فعل ظاہر ہوگا آدمی میں خلق

جود وسخا ہے تو اس سے داد و دہش کا فعل وجود میں آئے گا اس طرح تمام افعال اخلاق کے بیج سے پیدا ہوتے ہیں، قلب میں صبر، شکر، سخاوت، شجاعت، مروت، غیرت، حیا، غنا جن کو اخلاق کہا جاتا ہے اگر انسان میں یہ اخلاق پیدا ہو جائیں تو اس شخص سے انہی اخلاق کے مطابق افعال سرزد ہوں گے، اس لیے آپ کے بیان کردہ چوری نہ کر، زنا نہ کر، خون مت کر معیار اخلاق کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص شاخوں کو بیج کے اچھے ہونے کا معیار بتا نے لگے، پھر ان جملوں سے ان جڑوں کے حرام ہونے کا تو علم ہو سکتا ہے لیکن ان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان فعلوں کی ممانعت کی بنیاد کیا ہے اور ان افعال کی حرمت کی علت کیا ہے وہ علت ہی درحقیقت معیار حکم بن سکتی ہے پھر یہ علت جہاں جہاں پائی جائے گی وہ حرام ہوتی چلی جائے گی، ان جملوں سے ان کی علتوں کا کوئی پتہ نہیں چلتا اس لیے وہ ایک جزئی حکم بن کر رہ جاتا ہے اور بطور کلی اس کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا اور جزئیات منفردہ کا نام قانون اور ضابطہ نہیں ہوتا، معیاری قانون اگر دیکھنا ہے تو وہ یہ ہے جو انہیں احکام کے بارے میں قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ ان میں سے ہر ایک جزئی حکم کے ساتھ اس کی جامع علت اور علت وحکم کا درمیانی رابطہ دکھلا کر اسے معیاری قانون بنادیا ہے۔

قاری صاحب نے قرآن کی متعدد آیتوں سے اس کی مثالیں پیش کی ہیں ان سے ایسے حکیمانہ نکتے پیدا کیے جہاں تک عام اہل علم کی نگاہیں عام طور پر نہیں جاتی ہیں، اور ان کے ذہن وقاد نے جو نتائج نکالے ہیں ان سے قرآن کی جامعیت اور قرآنی الفاظ کی معنوی وسعت، اسلامی قانون کی گیرائی و گہرائی کا یقین ہوتا چلا جاتا ہے، اور دل حیرت استعجاب میں ڈوب جاتا ہے کہ یہ آیتیں روز پڑھی جاتی ہیں لیکن ان لطیف نکتوں کی طرف ذہن نہیں جاتا ہے جو درحقیقت روح کلام کا درجہ رکھتے ہیں، قاری صاحب کی نکتہ شناسی اور دقیقہ رسی کی اسی سلسلہ میں ایک مثال پیش ہے۔

آپ نے بائبل کے جزئی فعل کے مقابلہ میں قرآن کے کلی حکم اور اس کی قانونی وسعت کو سمجھانے کے لیے ''لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَ سَاءَ سَبِيْلًا ''کو

پیش کیا ہے آپ نے بتایا کہ آیت نے زنا سے روکتے ہوئے اسکی بنیادی علت بھی بتادی ہے، اس علت کو لفظ ''فحش'' اور ''سوء سبیل'' سے تعبیر کیا ہے، یہی اس کی ممانعت کا معیار ہے، انہیں دو باتوں کی وجہ سے فعل زنا میں حرمت پیدا ہوئی، اگر قلب میں فحش اور غلط روی کے بجائے عفت و پاکدامنی ہو اور نکاح اور ملک متعہ کی راہ اختیار کرے تو یہی فعل حرام ہونے کے بجائے حلال ہو جاتا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ خود یہ فعل اپنی ذات سے برا ہے نہ ممنوع، فحش اور سوء سبیل نے اس میں ممانعت کا حکم پہنچایا ہے اس لیے اس آیت میں حکم زنا کی ممانعت کے ساتھ اس کا معیار بھی ذکر کر دیا ہے کہ وہ فحش اور سوء سبیل ہے یعنی بے حیائی اور بے راہی، اس لیے اس قرآنی حکم کو معیاری حکم کہیں گے نہ کہ انجیل کے حکم کو کہ جس میں صرف ممانعت زنا تو ہے معیار کا کوئی ذکر نہیں اور جب کہ یہ علت ہی معیار حکم ہے اور وہ انجیل میں مذکور نہیں تو انجیل کا یہ حکم معیار اخلاق تو کیا ہوتا معیار حکم بھی نہیں، حکم اور علت دونوں کو ساتھ ساتھ ذکر کر دینے سے یہ معلوم ہو گیا کہ ممانعت میں فعل زنا اصل نہیں بلکہ فحش اور سوء سبیل اصل ہے تو ممانعت فحش اور سوء سبیل کی ہوئی چونکہ زنا میں یہ علت ہے اس لیے وہ بھی ممنوع ہوئی اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ فحش ممنوع جس فعل میں پایا جائے گا وہ فعل بھی بضمن فحش درجہ بدرجہ ممنوع ہوتا چلا جائے گا جیسے اجنبی عورت پر نگاہ ڈالنا، اس کی طرف بری نیت سے چل کر جانا، اسے ہاتھ لگانا، دل میں اس کے خیالات پکانا وغیرہ فحش کے افعال تھے اس لیے یہ سب ممنوع قرار دیے گئے اسی لیے حدیث میں نگاہ بازی کو آنکھ کا زنا کہا گیا، اجنبی عورت کو چھونے کو ہاتھ کا زنا کہا گیا بدکاری کی نیت سے چل کر جانے کو پاؤں کا زنا کہا گیا اس لیے کہ فحش کی علت کی بنا پر ایک زنا ہی حرام نہیں ہوا بلکہ وہ سارے افعال بھی ممنوع ہو گئے جس کو فحش اور بے حیائی نے ابھارا ہو جن کو ہماری شریعت میں دواعیٔ زنا کہا گیا ہے بس اس ایک حکم زنا کی ممانعت سے ایک ہی آیت کی بدولت بے حیائی کے ہزاروں افعال حرام ہو گئے جو در حقیقت بیان معیار کا اثر ہے قاری صاحب نے قرآن کے اس حکم اور بائبل کے حکم کا

موازنہ کرتے ہوئے قرآنی حکم کی وسعت، پھیلاؤ، جامعیت اوراس کے دوررس اثرات کی حقیقت ومعنویت کو اتنا واضح کیا ہے کہ اسکے بعد کسی کلام کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

قاری صاحب نے اپنے دعوے میں کہا ہے کہ قرآن میں ننانوے اخلاقی معیار بتائے گئے ہیں اوران کو خداوند قدوس کے ننانوے اسماء حسنٰی سے ثابت کیا ہے، آپ نے سب سے پہلے حدیث سے ننانوے اسماء حسنٰی کو شمار کرایا ہے پھر قرآن کریم کی مختلف آیتوں سے ان ننانوے اسماء حسنٰی کو شمار کرا کے انہیں اسماء سے ننانوے اصول اخلاق ثابت کیے ہیں اور ننانوے اخلاقی قوانین مستنبط کر کے شمار کرائے ہیں، یہ بحث اپنی نوعیت کی منفرد بحث ہے اور قاری صاحب کے ذہن کی دقیقہ رسی اور نگاہ نکتہ رسی کا ثمرہ ہے، حیرت یہ ہے کہ جب پوری بحث پڑھئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ وہ حقیقتیں ہیں جو ہماری زندگی میں جاری وساری ہیں لیکن آج تک ان الفاظ کی معنوی گہرائی تک ہماری رسائی نہیں ہوئی، اور جب قاری صاحب کے قلم نے ہمارے لاعلمی کے پردے ہٹا دیے تو جانی پہچانی حقیقتیں ہمارے سامنے آئیں اس لیے بیساختہ قاری صاحب کے لیے "**حکیم الاسلام**" کا خطاب ہماری زبانوں سے نکل جاتا ہے جس کے وہ صحیح طور پر مستحق ہیں۔

آیات قرآن سے ننانوے اسمائے حسنٰی شمار کرانے کے بعد آپ نے بتایا کہ یہی حق تعالٰی کے وہ اصول اخلاق، رحم وکرم، حلم وصبر، عفو ودرگذر، عظمت، قدرت، محبت، عدل وانصاف، علیمی وخبیری، وسعت واحاطہ، یکتائی، غنا، نورانیت، ہدایت، بزرگی، حفظ ونگہبانی، نفع وضرر، انعام، انتقام سلب وعطا، ثبات واستقلال، مصدریت کمالات، تقدس، پاکی، حکومت وملوکیت، لطافت، ستھرائی، علوّ شان، اعزاز، تذلیل وغیرہ وغیرہ ہیں جن کی اصولی تعداد ننانوے تک پہونچتی ہے جنہیں حدیث نے اسماء الٰہیہ کے نام سے تعبیر کیا ہے اور قرآن نے اسماءِ حسنٰی کے لقب سے یاد کیا ہے، یہی وہ پاکیزہ اخلاقِ خداوندی ہیں جنہیں حاصل کرنے کے لیے نبی کریم ﷺ نے امت کو حکم تخلقوا باخلاق اللہ سے دیا ہے، انہیں اخلاق الٰہیہ سے مخلوق کی اخلاقی تکمیل کے لیے نبی کریم

ﷺ مبعوث ہوئے، آپ نے فرمایا ہے: بُعِثتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الاخلاق.

اسلام کے قوانین اخلاق کو پیش کر کے آپ نے انجیل کے مذکورہ دس احکام کو ایک بچکانہ بات بتایا اور کہا کہ قرآن کے نظامِ اخلاق کی وسعت کے سامنے یہ چند سطحی باتیں پیش کر کے سورج کو چراغ دکھانا ہے، اس کے باوجود عیسائی کہتے ہیں کہ اسلام کا کوئی نظام اخلاق نہیں ہے، اور اگر معیاری اخلاق ہیں تو عیسائیوں کی تحریف شدہ انجیل کی تعلیمات ہیں۔ع

جنوں کا نام خرد رکھ لیا خرد کا جنوں

رڑکی کے پادری نے دوسرا اعتراض حضرت زینب سے حضور ﷺ کے نکاح پر کیا ہے، یہ اعتراض رڑکی کے اس معمولی پادری کے دماغ کی اختراع نہیں ہے بلکہ مشہور مستشرقین کا چبایا ہوا لقمہ ہے، سوموبر، درمنجم، واشنٹن ارنج اور رلامنس نے اپنی اپنی کتابوں میں بڑے زور وشور سے لکھا ہے جن کا مدلل جواب علماء مصر نے عربی اور انگریزی میں اتنی تفصیل سے دیا ہے کہ اب مزید اس پر اضافہ کی گنجائش نہیں ہے، یہ مستشرقین کی غلط فہمی نہیں اور نہ تاریخ اسلام سے ناواقفیت کی بنیاد پر یہ اعتراض کیا گیا ہے، بلکہ تنگ نظری، عصبیت، اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی سازش کے طور پر کیا گیا ہے، ورنہ معترضین کو خوب معلوم ہے کہ مشاہیر مفسرین نے ان آیات قرآنی کی جو تفسیریں کی ہیں اور اسلامی تاریخ میں جو تفصیلات مذکور ہیں ان کو پڑھنے کے بعد کسی انصاف پسند، اور حقانیت دوست کے لیے اعتراض کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی، یہ علماء اسلام یہ مفسرین کرام آیات قرآنی کے مفہوم و مقصد کو ان مستشرقین سے کہیں زیادہ طور اور بہتر طور پر سمجھتے ہیں، اور مستند اسلامی تاریخوں میں واقعہ کی ساری تفصیل موجود ہے! ان کی موجودگی میں اعتراض بے غیرتی اور بے حیائی کے سوا اور کچھ نہیں، اس پاکیزہ واقعہ کو بدمنظر بنانے میں صرف مستشرقین کی بدنیتی کو دخل ہے اس کے باوجود بھی دورِ جدید کے محقق علماء اسلام نے یورپ کو کافی وشافی جوابات دیدیئے ہیں جس کے بعد

اس مسئلہ پر مزید گفتگو عیسائیوں کی بے غیرتی اور بے حیائی ہے اور کچھ نہیں۔

حضرت قاری صاحب نے بھی رڑکی کے اس پادری کو تفاسیر اور تاریخ اسلام کے مستند حوالوں سے جو جواب دیا ہے وہی اصل حقیقت ہے تفسیر و تاریخ کی تفصیلات کو قاری صاحب نے اپنے مخصوص انداز بیان اور حکیمانہ نکتہ رسی سے اور زیادہ واضح، موثر، باوزن اور باوقار بنادیا ہے۔

حدیث رسول کا قرآنی معیار

آزادی سے پہلے پنجاب سے انکار حدیث کا فتنہ اٹھا تھا، اس گروہ کا کہنا تھا کہ احادیث کا یہ انبار غیر یقینی رطب و یابس اور متضاد باتوں پر مشتمل ہے، ان احادیث کی روشنی میں اسلام کی جو تصویر بنتی ہے وہ اسلام سے قطعاً مختلف ہوتی ہے جو قرآنی آیات کے رنگ و روغن سے تیار ہوتی ہے، اس لیے اگر اسلام کو اپنی اصل ہیئت پر باقی رکھنا ہے تو صرف قرآن کو معیارِ عمل بنانا ہوگا، احادیث کے اس سارے ذخیرہ کو آگ لگانا پڑے گا، انہوں نے عوام کے ذہن کو خراب کرنے کے لیے احادیث سے تضادات کو جمع کر کے احادیث پر عمل کو ناممکن ثابت کرنے کے لیے کئی کتابیں بھی لکھی تھیں "دو اسلام" ان کی مشہور کتاب ہے۔

جب یہ فتنہ شباب پر تھا اور بازار میں ان کی کتابیں آئیں تو اسی دور میں ان کے رد میں بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے گئے، تدوین احادیث کی تاریخ پر محققانہ کلام کیا گیا، احادیث کی صحت اور ان کے کلام رسول ہونے کو بدلائل قطعیہ ثابت کیا گیا اور بتایا گیا کہ احادیث کے ذخیرہ میں صحیح اور موضوع دونوں طرح کی روایتیں ضرور ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ غلط اور موضوع روایتوں کو رد کرنے کے ساتھ ساتھ صحیح حدیثوں کو بھی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے، احادیث رسول کے کلام رسول ہونے کی سند اور دلیل دنیا کے تمام مروجہ معیار تحقیق سے کہیں زیادہ مستند اور محقق ہے اور یہ معیار اتنا اونچا، بلند اور یقینی ہے کہ اس سے زیادہ کھری کسوٹی پر کوئی واقعہ پرکھا نہیں گیا اگر کوئی شخص احادیث کے معیار تحقیق اور اس کی تسلیم کردہ کسوٹی کی صحت پر یقین نہیں کرتا تو آج دنیا

کی پوری تاریخ جھوٹ کا پوت ہو کر رہ جائے گی کیوں کہ ان کا معیار تحقیق حدیث کے معیار تحقیق کے مقابلہ انتہائی گھٹیا اور غیر یقینی ہے حالانکہ ہر شخص تاریخ کی صحت پر یقین کرتا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ تاریخ سے کہیں زیادہ سچی کسوٹی پر پرکھی ہوئی احادیث کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کیا جاتا ہے، احادیث کی حقیقت کو جانچنے کے لیے فن بایوگرافی کو ایجاد کیا جو اس سے پہلے وجود میں نہیں آیا، چار لاکھ اشخاص کے پوست کندہ حالات مرتب کر کے لکھے گئے ان کے صدق و کذب کی پوری پوری چھان بین کی گئی جب ان کی صداقت، راست بازی کی تحقیق کر لی گئی تو ان کی زبان سے سنی ہوئی حدیث کو صحیح قرار دیا گیا ورنہ اس کے منہ پر مار دیا گیا ہے، موضوع روایتوں کے وجود سے انکار نہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ صحیح اور غلط احادیث میں تمیز نہ کی جا سکے اور قطعیت کے ساتھ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کیا جا سکتا ہے، تضادات، اسرائیلیات، بدمذہبوں اور زندیقیوں کی الحاقی باتیں کم علم والوں کے ذہن میں تذبذب اور تشکیک کا باعث بن سکتی ہیں، اہل علم جن کی پورے ذخیرہ حدیث پر مبصرانہ نگاہ ہے وہ کھوٹے اور کھرے کو اس کسوٹی پر پرکھتے ہیں جس سے زیادہ قابل اعتبار، یقینی سچی کسوٹی آج تک دنیا میں وجود میں نہیں آئی، فتنہ انکار حدیث نے زیادہ پر و بال نہیں نکالے اور جلد ہی اپنی موت آپ مر گیا، غالباً قاری صاحب نے بھی اسی دور میں یہ کتاب تحریر فرمائی ہے اور اپنے بلند علمی معیار سے کلام کیا ہے اور قرآن ہی سے احادیث کے واجب العمل ہونے کو جن جن طریقوں سے ثابت کیا ہے اور احادیث کی ساری قسموں کو آیات قرآنی کی روشنی میں مستنبط کیا اور اس کے درجہ اعتماد کو متعین کیا ہے حق یہ ہے کہ بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے، احادیث کی حجیت کو قرآن کی آیات سے جس باریک بینی اور الفاظ قرآنی کی معنوی وسعت کو نمایاں کرتے ہوئے جس گہرائی سے ثابت کیا ہے حق یہ ہے کہ یہ کام قاری صاحب کا ہی نکتہ آفریں دماغ کر سکتا تھا اور اسی نے کیا بھی۔

قاری صاحب نے گفتگو کا آغاز اس دعویٰ سے کیا ہے کہ دین کی دو اصلیں ہیں

قرآن اور سنت، ان کے علاوہ اجماع اور قیاس بھی حجت اور واجب العمل ہیں، مگر بذات خود اصل نہیں ہیں بلکہ بالواسطہ ہیں کیونکہ کوئی اجماع اور قیاس وہی معتبر ہے جو قرآن و حدیث کی تصریحات کے مطابق ہوں اس کے علاوہ کوئی اجماع اور قیاس قابل اعتبار اور واجب العمل نہیں،' پھر اس دعویٰ کو متعدد آیات قرآنی سے ثابت کیا ہے، اور دلائل کا مفصل ذکر کیا ہے ——— اور مثالوں سے واضح کیا ہے۔

آپ نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ حدیث کے بغیر قرآن کے صحیح اور حقیقی معنی مفہوم کو سمجھنا ممکن ہی نہیں اور اس کی ناقابل تردید دلیل بھی دی اور کہا کہ خدا کی ذات جس طرح لامحدود ہے اسی طرح اس کی صفات کمال بھی لامحدود ہیں اور انسانی قلب و دماغ، فکر و فہم اور عقل و فراست ہر لحاظ سے محدود و متناہی ہے اسی لیے انسان اس کا ادراک بغیر تحدیدات، تعینات اور تشخیصات کے نہیں کرسکتا اور اس کے لیے کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ محدود رہتے ہوئے لامحدود ذات وصفات تک رسائی پائے یا اس کا ادراک و معرفت کرلے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان ایک برزخ اور درمیانی طبقہ پیدا کیا جو ذات حق سے قریب تر اور تعینات کے لحاظ سے بندوں میں شامل اور کمال بشریت کا نمونہ رہتا ہے، انہیں کو ہم انبیاء و رسل کہتے ہیں، کمالات ربانی کے نمونے نبی کی ذات قدسی صفات میں ظہور کرتے ہیں تو عام بندوں کے لیے سہل ہو جاتا ہے کہ اس نبی سے وابستہ ہو کر حسب استعداد خدا تک رسائی حاصل کرلیں۔

حق تعالیٰ کی صفات کمالیہ میں ایک صفت صفت علم یا صفت کلام بھی ہے یہی علوم خداوندی کی ترجمانی اور تعبیر کرنے والی ہے اور اس صفت علم کا مظہر اَتم قرآن حکیم ہے جو اپنی اصولیت و کلیت، کمال جامعیت اور شئون الٰہیہ سے بھرپور ہونے کی وجہ سے جن سے یہ کلام وجود میں آیا ہے ذات خداوندی کی طرح لامحدود الحقائق، لامحدود المعارف اور لامحدود المطالب ہے جو ایک نوع نہیں بلکہ ماضی و مستقبل اور حال کی ہزار ہا انواع علوم پر حاوی و مشتمل ہے، اب ایسے کلام کا سمجھنا بلا خدا کی رہنمائی کے ممکن نہ تھا اور اس

کے سوا کوئی صورت نہیں کہ کوئی ایسا فرد کلام اور اس کی تفہیم کا واسطہ بنے جس کا متکلم تو ہم جیسوں میں سے ہو لیکن قلب صافی اور دماغ عالی کی جہت سے عرشیوں میں سے ہو، جس طرح ذات خداوندی تک بلا رسول کے واسطے کے ہماری رسائی ناممکن تھی اسی طرح کلام خداوندی تک بلا کلام رسول ہماری فہم کی رسائی ناممکن تھی، ہم اسی کلام رسول کو احادیث کہتے ہیں گویا حدیث پر عمل عین قرآن پر عمل اور منشاء خداوندی پر عمل ہے اور اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

آپ نے اپنے دعویٰ کو اور مدلل کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ قرآن کے الفاظ اور معانی دونوں منجانب اللہ ہیں، حضور ﷺ اس کے ناقل ہیں، نزول الفاظ، جمع الفاظ، اقراء الفاظ سب کچھ ذات باری کی طرف سے ہوا اور بیان معانی، شرح مطالب اور تعیین مرادات بھی خدا ہی کی جانب سے ہوئی، ظاہر ہے کہ جب پیغمبر کو بھی معانی و مراد کے سمجھنے میں بیان حق کے تابع رکھا گیا جن پر خود قرآن اترا تو امت کی کیا مجال ہے کہ اس کے فہم کو مطالب قرآنی پر حکم بنا کر چھوڑ دیا جائے کہ وہ سلسلہ معانی میں مدعی یا مجتہد بن جائے، قرآن کی آیتوں سے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کرتے ہوئے آپ نے یہ بات واضح کر دی کہ احادیث رسول درحقیقت مرادات قرآن ہیں، کلام رسول آیات قرآنی ہی کی تشریح ہیں اس کے سوا کچھ نہیں اب اگر کوئی احادیث کو ترک کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کو ترک کرتا ہے اگر احادیث پر ایمان نہیں تو اس کا قرآن پر بھی ایمان باقی نہیں رہا۔

آپ نے بعض اذہان کے ان شکوک کو بھی تفصیل سے بیان کر کے ان کا ازالہ کیا ہے جو ایسی احادیث کے موقعہ پر پیدا ہوتے ہیں کہ ان میں کسی ایسی بات کا حکم ہے جو قرآن میں مذکور نہیں صرف کلام رسول ﷺ میں ان کا ذکر ہے مثلاً حمار اہلی کی حرمت، واشمہ پر لعنت و ملامت وغیرہ، قاری صاحب نے اس کا اصولی جواب دیا ہے کہ قرآن میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ رسول جو لا کر دیں اسے لے لو اور جس سے روک دیں

رک جاؤ، اب جو احکام آپ نے ایسے دیئے ہیں جو بظاہر قرآن میں مذکور نہیں ہیں وہ بھی اس آیت کی وجہ سے بالواسطہ قرآن ہی کے احکام متصور ہوں گے، صحابہ کرامؓ سے اس طرح کے استدلالات کو احادیث کی کتابوں سے پیش کر دیا ہے۔

اس کے بعد قاری صاحب نے احادیث کی قسموں، غریب، خبر عزیز، خبر مشہور، خبر متواتر کو آیات قرآنی سے ثابت کیا ہے اور ان کا صحیح مقام اور درجہ متعین کیا ہے، یہ بحث بڑی لطیف، دلچسپ اور حقیقت آفریں ہے اور بہت تفصیلی ہے، اس حقیقت کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آیات قرآنی سے استخراج نتائج و شواہد اور استنباط مسائل پر قاری صاحب کی نگاہ کتنی دقیقہ رس اور نکتہ آفریں تھی، یہ متکلمانہ بحث اور اس کے ناقابل شکست عقلی دلائل انکار حدیث کے فتنے کے لیے آخری کیل سے کم نہیں۔

کلمہ طیبہ قاری صاحب کی ایک چھوٹی سی کتاب اسی نام کی ہے جو ایک ابھرتے ہوئے فتنہ کے سد باب کے لیے معرض تحریر میں آئی، آزادی سے کچھ دنوں بعد جب کہ مسلمانوں کا مستقبل غیر یقینی اور انتہائی خطروں میں گھرا ہوا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس سرزمین پر مسلمان نام کی کوئی چیز نہیں رہ جائے گی، پھر آہستہ آہستہ زندگی کے سورج کی ہلکی ہلکی کرنیں نظر آنے لگی تھیں اور یہ آس بندھ چلی تھی کہ شاید کچھ دن اور یہاں نغمۂ توحید گونجے گا، لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کا نغمۂ لاہوتی فضاؤں میں اپنا نورانی ایمان افروز ترنم بکھیر گیا کہ جنوبی ہند سے کسی بد بخت نے یہ شوشہ چھوڑا کہ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ جو حریم اسلام کے دروازے کی کنجی سمجھا جاتا ہے یہ صرف اہل عجم کی ذہنی اختراع ہے، قرآن و حدیث میں کہیں اس شکل میں اس کلمہ کا وجود ہی نہیں ہے اس پر مستزاد یہ کہ چونکہ کلمہ طیبہ کی موجودہ شکل عجم کے ذہن کی پیداوار ہے اس لیے عربی اصول و قواعد کے لحاظ سے بھی اس میں خامی ہے یہی وجہ ہے کہ نہ قرآن میں یہ کلمہ اس شکل میں پایا جاتا ہے اور نہ پورے ذخیرۂ احادیث میں، یہاں تک کہ کسی صحابیؓ کے قول سے بھی یہ ثابت نہیں ہے بلکہ اس کلمہ میں نہ عربیت ہے اور نہ شریعت بلکہ ایک ذہنی اختراع اور

بدعت ہے جس سے اسلام نے روکا ہے "البدعةُ ضلالةٌ و کلُّ ضلالةٍ فی النار"۔

کسی زمانے میں آریوں نے مسلمانوں پر یہ اعتراض کیا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد مسلمانوں پر دو محاذوں سے بیک وقت حملہ ہوا تھا، ایک محاذ پر عیسائی مناظرین حملہ آور تھے اور دوسرے محاذ سے آریہ سماجی مسلمانوں پر اعتراضات کے زہریلے تیر برسا رہے تھے اسی زمانہ میں آریوں کے مسموم ذہن نے یہ اعتراض پیدا کیا تھا لیکن اب کی بار یہ کھلے دشمن کی طرف سے نہیں بلکہ عبداللہ بن ابی کے سلسلۂ نسب کے کسی فرد نے یہ سوال اٹھایا تھا اس لیے یہ اور بھی خطرناک تھا۔

یہ کتاب قاری صاحب نے اسی اعتراض کے جواب میں لکھی ہے اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے، آپ نے گفتگو اس کلمہ کے مادہ سے شروع کی اور بتایا کہ اس کا اصل ماخذ کیا ہے، آپ نے اس کلمہ کے دونوں جزوں کو قرآن کی متعدد آیتوں سے نکال کر پیش کیا کچھ آیتوں میں جزو اول ہے اور کچھ آیتوں میں جزو ثانی موجود ہے، اس طرح دونوں اجزاء قرآن میں موجود ہیں، اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اس کلمہ کی موجودہ ہیئت ترکیبی اور جمع و ترتیب اور دو آیتوں کو ملا کر پڑھنے اور انہیں ایک جگہ جمع کر کے ایک کلمہ کہنے کا مسئلہ ہے اس کو قرآن کے اطلاق سے ثابت کیا ہے اور کہا کہ آیات قرآنی کے سلسلہ میں اتصال، انفراد، استقلال، عدم استقلال، اضافہ، عدمِ اضافہ، اجتماع، انفراد، نوشت و خواند اسی طرح کے اور بہت سے احوال اور تقدیریں جو اس کلمہ کو ادا کرتے وقت اس کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں ان سب کے بارے میں قرآن مطلق ہے، یعنی اس نے اس قسم کی صورتوں میں سے نہ کسی صورت کو متعین کر کے دوسری صورتوں کی نفی کی ہے اور نہ ان صورتوں میں سے کسی خاص صورت پر زور دے کر اسے حصر کے ساتھ متعین کیا ہے جس سے دوسری صورتوں پر قید اور پابندی عائد ہو جاتی ہو، بلکہ یہ سب صورتیں مساوی طور پر اس کے اطلاق کے تحت آجاتی ہیں اس لیے اصول تفسیر اور عام اصولِ شرعیہ کی رو سے یہ تمام تقدیریں اور صورتیں اس اطلاق کی وجہ سے جائز ہی رہیں گی بلکہ اس اطلاق

قرآنی کا ایک حال اور ایک مصداق بن کر قرآن کی مراد ثابت ہوں گی، جن پر حسب تصریحات اصول قرآن کی دلالت مانی جائے گی اور یہ سب احوال مدلولات قرآن ثابت ہوں گے، انہیں احوال میں سے ایک حال ان دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھنے کا بھی ہے تو یقیناً وہ بھی مدلول قرآن ہی مانا جائے گا، اس طرح کلمہ طیبہ کی ہیئت ترکیبی قرآن کی دلالت سے جائز اور شرعی ثابت ہو جائے گی اور لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ آیتوں کا مجموعہ بن جائے گا جو کلمہ کے مادہ کے بارے میں قرآنی نص ثابت ہوا اور اس کی ہیئت ترکیبی کے بارے میں قطعی دلالت کے ساتھ دال ثابت ہوا جس کو یا تو نص ہی کہا جائے یا ماخذ شمار کیا جائے جو ماخذ قریب ہونے کی وجہ سے نص ہی کے قریب قریب ہوگا۔

قاری صاحب نے اصولی بحث کر کے کلمہ طیبہ کی موجودہ ہیئت ترکیبی کی شرعیت کو ثابت کر کے اس کے بہت سے شواہد بھی احادیث سے پیش کیے ہیں، پھر آپ نے بدلائل قطعیہ یہ ثابت کیا ہے کہ کلمہ کے دونوں جزوں کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، اس کے لیے بھی آپ نے قرآن ہی سے استدلال کیا ہے، ایک آیت سے اخلاص عبادت اور دوسری آیت سے اتباع سنت کے وجوب کو ثابت کرتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا کہ دونوں مطلوب قرآنی لازم وملزوم ہیں، اخلاص عبادت بغیر اتباع سنت کے اور اتباع سنت بغیر جذبۂ اخلاص عبادت کے وجود میں نہیں آسکتا ہے، اگر عبادت میں اخلاص نہ ہو تو وہیں سے شرک کی سرحد ہو جائے گی اور اگر اتباع سنت کو ترک کر دیں تو وہیں سے ابتداع کا آغاز ہو جائے گا، شرک و بدعت ہی دو اصلیں ہیں جو دین کی عمارت کو منہدم کرتی ہیں اس لیے اخلاص عبادت اور اتباع سنت کا اقرار واعتراف لازم وملزوم ہو گئے اور جب دو حقیقتوں میں تلازم ہے تو ان کی تعبیروں میں بھی تلازم ضروری ہو جاتا ہے، کیونکہ معانی کا تلازم تعبیرات کے باہمی تلازم کے بغیر ممکن ہی نہیں، ظاہر ہے کہ اخلاص کی تعبیر جو شرک کی ہر قسم سے مانع ہے وہ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ہے اور اتباع سنت کی وہ تعبیر جو ہر قسم کی بدعت سے مانع ہو محمد الرسول اللہ ہے اب خواہ ان تعبیرات کو شہادت کے الفاظ

سے ادا کیا جائے یا اقرار وقول وغیرہ سے یا بلا کسی خاص لفظ کے اضافہ کے صرف اصل الفاظ میں ادا کیا جائے بہر حال لا الٰہ الا اللہ اور محمد الرسول اللہ میں تلازم باہمی ثابت ہوا اور حاصل تلازم اور حاصل جمع وہی کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ نکلتا ہے۔

قاری صاحب نے بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے کلمہ طیبہ کی وجہ تسمیہ کو آیات قرآنی سے نکالا اور متعدد احادیث سے کلمہ کی موجودہ ہیئت ترکیبی کو ثابت کیا ہے جن میں اسی جمع و ترتیب کے ساتھ یہ کلمہ مذکور ہے، کلمہ طیبہ کے شرعی وجود کو ثابت کرنے کے بعد کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت کے عمل استعمال کا صحیح معیار اور فرق اور مواقع استعمال کی تفصیل بھی پیش کر دی ہے اور بتایا ہے کہ جب اس کلمہ سے عہد و میثاق اور اعلان شہادت مقصود ہوتا ہے تو اس کے دونوں جملوں کو کلمات شہادت اُقر، اشہد وغیرہ سے مزین کر کے استعمال کیا جاتا ہے اور جب کلمہ کا قول محض، یا تکلم محض، یا ذکر خالص منظور ہوتا ہے تو اسے بغیر ان حروف روابط کے خالص قرآنی الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب کسی کو دائرۂ اسلام میں داخل کرتے ہیں تو چونکہ توحید و رسالت کا اقرار اور عہد و میثاق لینا مد نظر ہوتا ہے اس لیے کلمہ کے دونوں جملوں کو شہادت کیساتھ ادا کر دیا جاتا ہے اور کلمۂ شہادت کی تلقین کی جاتی ہے اور جب محض ذکر اللہ یا ذکر وحدانیت و رسالت کے رسوخ کے لیے کلمہ کا تکرار پیش نظر ہوتا ہے تو کلمہ طیبہ کی تلقین کی جاتی ہے جس میں ادوات شہادت کا اضافہ نہیں کیا جاتا۔

آخر کتاب میں قاری صاحب نے اس اشکال کو دور کیا ہے جو معترضین نے اس کی عربیت کے خلاف ہونے کی صورت میں پیش کیا تھا اور کہا تھا کہ عربیت اور اصول نحو کے لحاظ سے غلط ہے، دونوں جملوں کا ایک ساتھ موجودہ شکل میں استعمال صحیح نہیں ہے، آپ نے اولاً تو اس اعتراض کی بنیاد ہی منہدم کر دی کہ جن قواعد و اصول کو پیش نظر رکھ کر یہ اعتراض اٹھایا گیا ہے وہ خود اسی قرآن کی طرز ادا اور طرز تعبیر سے ماخوذ ہیں، اس لیے ان اصول و قواعد عربیت پر قرآن کی عبارتوں کو جانچنا کسوٹی پر سونے کو جانچنا نہیں بلکہ سونے پر کسوٹی کو پرکھنے کی الٹی منطق اور کھلی ہوئی حماقت ہے، یہ کلمہ اپنے اجزاء کے لحاظ سے قرآن میں موجود

ہے اور قرآن کے اطلاق کی رو سے ان اجزاء کو انہیں کی ہیئت کے ساتھ ترکیب دے کر یا ملا کر پڑھنا جائز ہے اور اپنی ترکیب کے لحاظ سے بعینہٖ احادیث میں موجود ہے اس کے بعد عربیت کی سند کے لیے کسی رسمی حجت کی ضرورت ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے۔

اس کے باوجود قاری صاحب نے کلمہ کی ہیئت کذائی کو درست اور صحیح ثابت کرنے کے لیے فن بلاغت کے قواعد و اصول پیش کر کے آپ نے ثابت کیا ہے کہ اصول نحو اور قواعد و اصول بلاغت کی رو سے بھی لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کی ہیئت ترکیبی درست صحیح اور فصیح ہے، اور اس پر کسی کلام کی گنجائش نہیں ہے، کتاب اپنے موضوع اور عالمانہ استدلال کے لحاظ سے منفرد ہے۔

التشبہ فی الاسلام

قاری صاحب کی یہ کتاب اسلامی تہذیب و تمدن اس کی خصوصیات اسکی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہے تہذیب کا ایک لفظ مختصر اپنی پنہائیوں اور معنوی وسعت کے لحاظ سے پوری انسانی زندگی کو گھیرے ہوئے ہے اور صرف مادی اور ظاہری زندگی اسکے دائرے میں نہیں آتی بلکہ اس کا اثر انسان کی داخلی زندگی، خیالات، جذبات اور رجحانات پر پڑتا ہے، تہذیب ایک قوم کو دوسری قوم سے ایک دور کو دوسرے دور سے ممتاز کرتی ہے تہذیب کا درحقیقت قوموں کی حیات و موت سے گہرا ربط و تعلق ہے اگر کوئی تہذیب فنا ہوگئی اور اس کا وجود مٹ گیا تو سمجھ لیجئے کہ ایک قوم مرگئی اس لیے اگر کوئی قوم اپنی تہذیب کی حفاظت کرتی ہے اور اس کو محفوظ رکھنے کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار رہتی ہے تو کوئی طاقت اس قوم کو نہیں مٹا سکتی، اگر کسی قوم کا حقیقی اور عملی وجود مٹانا ہے تو اس کی تہذیب کا گلا گھونٹ دو وہ قوم از خود مر جائے گی، اس کی تہذیب کو تہ و بالا کر دو اس قوم کو بغیر ایک قطرۂ خون بہائے قتل کر دو گے اور اس کے وجود کو فنا کے گھاٹ اتار دو گے اگر اس قوم کا مادی وجود باقی بھی رہ گیا تو بحیثیت ایک زندہ قوم کے اس کا کوئی وجود نہیں ہوگا اس کی حیثیت سیلاب میں بہتے ہوئے تنکے کی طرح ہو کر رہ جائے گی اس کی اپنی توانائیوں کا وجود ختم ہو جائے گا، اس کی

زندگی ایک بے مقصد زندگی ہی ہوگی اس کی حیثیت ایک ایسے کارواں کی ہو جائے گی جس کی کوئی منزل نہ ہو یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اسلامی تہذیب پر بہت زور دیا ہے اسلامی تہذیب میں کسی دوسری تہذیب کی آمیزش کی سختی سے ممانعت کی ہے تہدید آمیز لفظوں میں کہا گیا ہے من تشبه بقوم فهو منهم بانئ اسلام نے اس لیے اسلامی تہذیب کی بقا کے اصول وقواعد اور حدود مقرر کیے ہیں اور ان سے سرموانحراف کو اسلام بر داشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

قاری صاحب کی کتاب ''التشبہ فی الاسلام'' اسی اسلامی تہذیب کی خصوصیات اس کی اہمیت اس کے حدود کو روشنی میں لانے کی ایک کامیاب کوشش ہے، مصنف نے اپنی فطری دقیقہ رسی ونکتہ شناسی کی صلاحیتوں کی وجہ سے مسئلہ کو پوری جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے، مانعیت کے پہلو سے اسلامی تہذیب کے گرد ایک آہنی حصار قائم کرنے کی قابل قدر کوشش ہے۔

ایک قوم کا دوسری قوم کی تہذیب کو قبول کر لینا یا اپنی زندگی میں جاری وساری کر لینا اس قوم کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہوتا ہے یہ کس طرح ہوتا ہے؟ قاری صاحب نے اس کو احادیث وقرآن اور تاریخ کی روشنی میں بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے، آپ نے ان حدود کا بھی ذکر کیا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے کسی دوسری قوم سے ارتباط و تعلق رکھنا اسلام میں جائز ہے اور ان حدود سے تجاوز کرنا کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔

آپ نے متعدد آیات قرآنی واحادیث سے مسلمان قوم کا کسی دوسری قوم کا اثر لینے اور اسکے مخصوص افعال واشکال میں مشابہت اختیار کرنے کو اسلامی شریعت کے خلاف ثابت کیا ہے آپ نے مشہور حدیث من تشبہ بقوم فہو منہم کی معنوی وسعت کو بتاتے ہوئے ان حدود کی نشاندہی کی ہے جس سے آگے بڑھنا ایک مسلمان کے لیے ممنوع ہے مشابہت سے کیا مراد ہے اور کن چیزوں میں مشابہت ممنوع مفصل بیان کیا ہے آپ نے حضور اکرم ﷺ کے دور سے لیکر صحابۂ کرام تابعین وائمہ عظام کے دور

تک حوالوں کے ساتھ بتایا ہے کہ کس طرح ہمارے اسلاف دوسری قوموں کی وضع اختیار کرنے سے اور کتنی سختی سے روکتے تھے اور کتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر گرفت کرتے تھے تاکہ دوسری قوموں سے ادنیٰ تشبہ بھی پیدا نہ ہو۔

آپ نے بڑی وضاحت سے یہ بات بتائی ہے کہ غیر مسلموں سے مشابہت کا مطلب یہ نہیں کہ غیر اختیاری امور میں بھی مشابہت ممنوع ہے البتہ اختیاری امور میں تشبہ کی سخت ممانعت ہے مثلاً سر، داڑھی اور مونچھوں کے بالوں کے بارے میں خصوصی احکام ہیں کیونکہ اس کی وضع قطع میں آدمی کے قصد و اختیار کو دخل ہے اس لیے سر کے بال یورپین طرز کے رکھنا، جدید فیشنوں کے مطابق بنانا، سنوارنا، کٹوانا، یہودیوں کی طرح داڑھی رکھنا، عام غیر مسلموں کی طرح منڈوانا، یعنی موچھیں اظہار رعونت کے لیے رکھنا ان کو بل دینا داڑھی مونچھ دونوں صاف کرا دینا وغیرہ وغیرہ ان سب باتوں میں اسلامی شریعت کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنے کی اسلام اجازت نہیں دیتا اسی طرح عورتوں کو مردوں کی اور مردوں کو عورتوں کی وضع اختیار کرنا دونوں ممنوع ہے، ایک مسلمان کا لباس کیسا ہونا چاہیے، اس کی تراش خراش کیسی ہو اسلام نے اس کے کچھ بنیادی اصول مقرر کیے ہیں، مثلاً ریشمی لباس صرف عورتوں کے لیے ہے مردوں کو اس کا لباس ممنوع، لباس اظہار فخر و مباہات اور تکبر کی غرض سے نہ ہو، پاجامہ ٹخنوں سے نیچے نہ ہو، آستین اتنی لمبی نہ ہوں کہ انگلیاں ان میں ڈوب جائیں، عورتوں کا لباس اتنا باریک نہ ہو جس سے جلد کا رنگ جھلکے نہ اتنا چست ہو کہ اس سے بدن کی ساخت معلوم ہو اسلام میں ایسے کپڑوں کے استعمال کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے جو خوبصورتی اور گراں قیمتی میں مشہور ہوں اسی طرح وہ لباس بھی ممنوع ہے جو اپنی بدہیئتی میں مشہور ہو، ایسے لباس بھی استعمال کرنے سے روکا گیا ہے جو فساق، آوارہ مزاج بازاری اور بدنام افراد عموماً استعمال کرتے ہیں یا زندیق و بدمذہب لوگ پہنتے ہیں۔

مصنف نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ ایک شخص جس طرح کے لوگوں کا لباس اختیار

کرتا ہے بتدریج اس کا اندروں بھی اس سے متاثر ہوتا رہتا ہے اور انجام کار اسی ذہن و مزاج کا بن جاتا ہے جس طرح کے لوگوں کا اس نے لباس اور وضع اختیار کی ہے آپ نے مزید بتایا ہے کہ لباس درحقیقت انسانوں میں امتیاز کا بنیادی وسیلہ ہے آپ روزمرہ کی زندگی میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں ہر طبقہ کے لوگوں کو آپ صرف اس کا لباس دیکھ کر پہچان جاتے ہیں اور اس کی وضع قطع دیکھ کر اس کی حیثیت، اس کے رجحانات اس کی شرافت ورزالت، بدکرداری، نیک کرداری کا اندازہ کر لیتے ہیں، ظاہر کو دیکھ کر باطن کا اندازہ عام طور پر کیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا ہے۔

حضرت قاری صاحب نے آیات قرآنی واحادیث سے اپنے ہر دعویٰ کو مدلل کیا ہے اور جو کچھ بیان کیا ہے اس کو کتاب وسنت سے ثابت کیا ہے اور ہر بحث کو بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے اور بڑی باریک بینی سے اس تشبہ کے مسئلہ اور اس کی حدود کو بیان کیا ہے پوری کتاب شواہد و دلائل و براہین آیات قرآنی و احادیث سے بھری ہوئی ہے اپنے موضوع پر یہ ایک اہم کتاب ہے۔

فلسفہ نعمت و مصیبت یہ کتاب وجود باری کے منکرین کے جواب میں لکھی گئی ہے جب انہوں نے قاری صاحب سے کچھ سوالات کیے تھے،

جن دنوں ہندوستان میں جنگ آزادی شباب پر تھی اور بچہ بچہ کے دل و دماغ میں آزادی کا سودا سمایا ہوا تھا، اس جنگ میں شریک ہر طرح کے لوگ تھے، ہر فرقہ، ہر مذہب اور ہر طبقہ کے افراد اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے اس تحریک آزادی سے وابستہ تھے، جنگ آزادی کے سورماؤں میں وہ طبقہ بھی تھا جو روس کے انقلاب سے متاثر تھا جو اکتوبر ۱۹۱۷ء میں ہوا، اس انقلاب نے ان ہندوستانی نوجوانوں کو بے حد متاثر کیا جو ان دنوں یورپ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، روس کا یہ انقلاب درحقیقت کارل مارکس کے نظریۂ حیات کمیونزم کی کامیابی تھی یہ عملی نظریۂ حیات عملی وجود کا جامہ پہن چکا تھا، یہ ہندوستانی

نوجوان جب یورپ سے اپنی تعلیم مکمل کر کے آئے تو انہوں نے ہندوستان میں ایک مشنری کی طرح کمیونزم کی تبلیغ شروع کردی وہ خود عملی طور پر سب کے سب ملحد، دہریئے، دین سے بیزار، خدا دشمن تھے، کیونکہ کمیونزم صرف ایک سیاسی دستور ہی نہیں تھا بلکہ وہ مستقل طور پر ایک نظریہٗ حیات تھا جسکا دائرہٗ عمل انسانی زندگی کے داخلی و خارجی دونوں پہلوؤں تک وسیع تھا اس نظریہٗ حیات کو عملی حیثیت سے پیش کرنے والا کارل مارکس تھا اس نے اپنی کتاب کیپٹل میں لکھا ہے کہ دنیا میں جتنے بھی انقلابات آئے چاہے وہ بادشاہوں، قومی لیڈروں مذہبی رہنماؤں حتیٰ کہ رسولوں اور پیغمبروں نے وہ انقلاب پیدا کیا سب کی اساس معاشی مسائل پر تھی، ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک کے سیاسی انقلابات کی تہ میں ''روٹی روزی کی جنگ'' کار فرما تھی اس کے علاوہ کچھ نہیں، خدا، رسول، مذہب یہ سب روٹی روزی کے مسئلہ کو حل کرنے کی راہیں تھیں، اس کے سوا کچھ نہیں، مذہب کا وجود انسانی زندگی میں افیون کا نشہ ہے جو انسان کی قوت عملی کو سست اور بیکار کر دیتا ہے، اس لیے ایک طاقتور کے لیے ضروری ہے کہ مذہب سے بہت دور ہو، اور اپنی حدود مملکت سے اس کو دیس نکالا دیدے، اسی نقطہٗ نگاہ کی وجہ سے ہر کمیونسٹ ہندوستان میں خدا بیزار اور مذہب دشمن رہا، اور خود ان کی اپنی زندگی الحاد کا شکار تھی، لیکن ہندوستان جیسے مذہبی ملک میں اپنے اس عقیدہ کا برملا اظہار نہیں کر سکتے تھے اور وہ محتاط تھے لیکن اپنی تحریروں میں ڈھکے چھپے لفظوں میں بیان کرتے رہتے تھے، چونکہ ہندوستانی معاشرہ اتنا مربوط اور مستحکم تھا کہ کسی خاندان کے کسی جوان کو ہندوستان کے مذہبی ماحول میں دین بیزاری کے برملا اظہار کی ہمت نہیں تھی اس لیے وہ اپنی بدعقیدگی اور الحاد کو اپنے ہی تک محدود رکھتے تھے، زیادہ سے زیادہ اپنے بے تکلف دوستوں میں اپنا ہم نوا بنانے کے لیے اسکا اظہار کرتے رہتے تھے، اور ملک میں کھلم کھلا مذہب بیزاری کی تحریک نہیں چلائی گئی لیکن ذہنوں کو تیار ضرور کیا جاتا رہا اور نوجوان طبقہ اس سے متاثر بھی ہوتا رہا، تا کہ جب وقت آجائے کہ اشتراکی نظام بروئے کار لایا جائے تو آسانی کے ساتھ سمرقند و

بخارا اور ایشیا کو چک کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی طرح یک بیک مذہب کے خلاف طبل جنگ بجا دیا جائے اور مذہب کو دیس نکالا دے دیا جائے روسی انقلاب کی تاریخ ہمارے دعویٰ کی شاہد عادل ہے۔

آزادی سے پہلے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک یہ تحریک دہریت بڑے شباب پر تھی اسی زمانے میں کچھ لوگوں نے خدا کے وجود سے انکار پر مشتمل کچھ سوالات قاری صاحب کو لکھ کر بھیجے تھے جس میں ان سے ایسے جواب کی فرمائش کی گئی تھی جو عقل و درایت کی روشنی میں دیا گیا ہو، اور جواب اس کسوٹی پر پورا اترے، قرآن و حدیث سے کسی مسئلہ کو ثابت کرنا ان کے نزدیک کوئی وزن نہیں رکھتا تھا، ان کو یقین تھا کہ کارل مارکس نے جو تھیوری دنیا کے سامنے پیش کی ہے وہ فلسفیانہ نا قابل شکست دلائل سے مسلح ہے، بوسیدہ روایتوں، فرسودہ عقائد، اور دقیانوسی نظریہ رکھنے والے مولویوں میں کہاں سے وہ علم پیدا ہوگا کہ اس کا کوئی عقلی جواب دے سکیں اس لیے سوال نامہ میں اس بات پر پورا زور دیا گیا تھا کہ جو جواب دیا جائے وہ عقل کی میزان پر پورا اترے، محض قرآن و حدیث کا حوالہ دینا کافی نہیں ہے، کیوں کہ ان کے نزدیک ان دونوں کی کوئی قدر و قیمت اور کوئی حیثیت ہی نہیں تھی وہ سمجھتے تھے کہ پہلے کے ذہین لوگوں نے اپنے دور میں انقلاب برپا کرنے کے لیے یہ کتابیں لکھی تھیں اور اس کی وجہ سے انقلاب برپا کرنے میں وہ کامیاب بھی ہوئے لیکن ان کا دور اب ختم ہو چکا ہے اور نئے انقلاب کے لیے ایک نئے نظریۂ حیات کی ضرورت ہے اور وہ کمیونزم ہے۔

وہ سوالات جو قاری صاحب کو بھیجے گئے تھے اور ان کے رسالہ "مذہب کے آنسو" میں شائع بھی ہوئے تھے مختصر طور پر یہ تھے کہ —— اللہ اگر رحیم و کریم ہے تو اس کے رحم و کرم کا یہ تقاضا تو نہیں کہ انسان ہمہ وقت درد و غم اور آفات و مصائب میں گرفتار رہے، اگر انسان اپنے اعمال کی وجہ سے گرفتار بلا ہے تو آسمانی بلائیں پیہم اور ہر دم نازل ہوتی رہتی ہیں؟ یا رحم و کرم ہے یا ظلم و ستم؟ کہ خدا کسی بھی وقت رحم و کرم کی نگاہ ہی نہیں کرتا اور

اگر یہ آفات و مصائب انسانوں کے گناہوں کے نتیجہ میں آتی ہیں تو بچے، معصوم افراد نیک اور دین دار لوگ حتیٰ کہ بے قصور جانور تک اس خدائی عذاب کو بھگتنے کے لیے کیوں مجبور کیے جاتے ہیں ان کا کون سا گناہ ہے اور کون سا قصور؟ جس کی پاداش میں وہ مبتلائے درد و غم ہوتے رہتے ہیں؟ اور اگر یہ مصائب انسان کو عبرت و سبق دینے کے لیے آتی ہیں تو خدا کو ایسا ظالمانہ اور بے رحمانہ طریقہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی کوئی دوسرا آسان طریقہ اختیار کرتا جیسے ڈاکٹر کوئی بڑا آپریشن کرتا ہے تو کلوروفارم سنگھا کر پہلے بے ہوش کر دیتا ہے تب آپریشن کرتا ہے تاکہ مریض نشتر کی اذیت نہ محسوس کرے اگر روحانی اصلاح میں یہ بھی نہیں تو اس کو سوائے بے رحمی اور ظلم کے اور کیا کہا جائے گا، اور اس کی کمال قدرت بھی مشتبہ ہو جاتی ہے کہ اس طریقہ کے علاوہ اس کو کسی دوسرے طریقہ علاج پر قدرت ہی نہیں ہے اس سے زیادہ تو انسان ہی ہے کہ وہ رحم و کرم کا پتلا بن سکتا ہے وہ ایسی دوائیں ایجاد کرتا ہے اور طریقہ علاج کو کام میں لاتا ہے کہ اس سے اجتماعی وبائیں اور بیماریاں بھی کم ہو جاتی ہیں، کالرا، طاعون، چیچک، ملیریا کی وبائیں ڈاکٹروں کی محنت کے نتیجہ میں بڑی حد تک کم ہو گئیں اور انسانیت کو ان مصیبتوں سے انہوں نے نجات دلا دی ورنہ خدا تو پہلے مسلسل یہ بلائیں بھیجتا رہتا تھا۔

اور اگر یہ مصائب انسانوں کی آزمائش اور جانچ کے لیے ہیں تو اس کو علیم و خبیر بھی تو کہا جاتا ہے کونسا ایسا راز رہ گیا ہے کہ ہزاروں برس کے بعد بھی اس کو معلوم نہیں ہو سکا اور انسانوں کو مسلسل آزماتے چلا آرہا ہے، اگر انسان خدا کو چھوڑ کر اپنی عقل اور تجربہ کی رہنمائی میں کام کرے تو اس سے زیادہ آرام میں رہ سکتا ہے، جن ملکوں کی سائنس نے ترقی کی ہے آج ان کو دنیا کی ساری آسائشیں اور سہولتیں میسر ہیں وہ ہر طرح پرسکون اور مطمئن زندگی گذارتے ہیں، ان کا معیار زندگی ان کا رہن سہن ساری دنیا کے لیے باعث رشک ہے اگر وہ بھی خدا کے بھروسے پر بیٹھے رہتے تو دانے دانے کو محتاج رہتے، چیتھڑے لپیٹے رہتے، خدا سے دعائیں کرتے رہتے اور خدا ان کو سسک سسک کر مرتے

ہوئے دیکھتا رہتا اور ان کو اس سے چھٹکارا کی بات بھی نہیں سوچتا جیسا کہ عام طور سے مذہب کے نام لیوا ملکوں کے باشندوں کا حال ہے ان حالات و اسباب کی بنا پر اگر کوئی خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے تو کیوں قابل ملامت ہے اور اس کا قصور کیا ہے؟۔

قاری صاحب نے اپنی کتاب میں دو طرح کے جوابات دیئے ہیں ایک تو الزامی جواب ہے دوسرا تحقیقی، الزامی جواب میں آپ نے انہیں کے انداز پر بات پلٹ کر مسکت جواب دیا ہے بذات خود یہ جواب بھی خاموش کرنے کے لیے کافی ہے، آپ نے تحریر کیا کہ اگر ایک طرف آفات و مصائب آتی رہتی ہیں جن کی تم شکایت کرتے ہو تو انہیں کے مقابل بیشمار نعمتیں اور لطف و کرم کے بے پناہ احسانات بھی موجود ہیں اگر بیماری پھیلانے والے ایذا دینے والے جانور ہیں تو اس کے بالمقابل ایسے بھی جانور ہیں جو صحت بخش اور قوت آفرین ہیں اگر زمین پر آفات سماویہ آتی ہیں تو دوسری طرف فضاؤں کی نسیم جانفزا، فرحت بخش ہوائیں، بادلوں کی سخاوت، بارش کی حیات بخشی، دریاؤں کی حیات آفریں روانی عالم کے لیے صد الواں نعمتوں اور زندگیوں کا سہارا بھی موجود ہے غرض جتنی مصیبتیں آپ شمار کرا سکتے ہیں ان کے مقابل میں ان سے کہیں زیادہ ہم نعمتیں گنوا سکتے ہیں بلکہ ہر نوع میں جہاں مصیبت کا پہلو ہے وہیں اسی میں راحت و سکون کا بھی پہلو موجود ہے، اگر زہر جان لیوا ہے تو انہیں زہروں سے بہت سی بیماریوں کا علاج بھی کیا جاتا ہے اس لیے تم ان مصائب کیوجہ سے خدا کا انکار کرتے ہو تو ان نعمتوں پر خدا کے وجود کا اقرار کیوں نہیں کرتے؟ یہ کون سی منطق ہے کہ مصیبت بھیجنے کا فعل تو اس کا انکار کے لیے حجت ہو مگر اس کی نعمتیں نازل کرنے کا فعل اس کے اقرار کی حجت نہ ہو، ان آفتوں پر خدا کا شکوہ تو جائز ہو مگر ان کے مقابل اضداد یعنی نعمتوں پر اس کا شکریہ جائز نہ ہو، یہ عقل و فہم کا کیسا فیصلہ ہے؟ اور یک طرفہ فیصلہ کیوں ہے؟۔

الزامی جواب کو قاری صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں بڑی تفصیل سے تحریر فرمایا ہے اسکے بعد جو تحقیقی جواب دیا ہے وہ اردو میں کلامی مباحث کا ایک بے مثال

شاہکار ہے یہ جواب چھوٹے سائز کے ۲½ سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے، ترتیب مقدمات و استخراج نتائج کی ایک طویل بحث پر مشتمل ہے اور یہ بحث کتاب ہی میں پڑھنے کی چیز ہے، یہ جواب ایسے عقلی مقدمات پر مشتمل ہے اور ہر استدلال اتنا محکم اور ناقابل تردید ہے کہ اس کی صداقت کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں، وجود باری پر جتنے شبہات بھی وارد ہو سکتے ہیں ان کا مدلل و مبرہن جواب دیا ہے کتاب نوع بنوع مباحث طرز استدلال و استخراج نتائج کے اعتبار سے ایسی ہے کہ عوام کے بجائے اہل علم کے مطالعہ کی چیز ہے منکرین وجود باری میں اگر ضد کا مادہ نہیں ہے تو یقیناً ان کا دل ان دلائل پر مطمئن ہو جائے گا ورنہ ضد کے سامنے تو سر پر چمکتے ہوئے سورج کا بھی انکار کیا جا سکتا ہے۔

آفتاب نبوت قاری صاحب کی تقریریں، شیریں زبانی و حلاوت کے ساتھ الفاظ مرصع انداز بیان، جا بجا سدھا احادیث و آیات قرآنی کے ایک ایک لفظ سے نکتہ آفرینی کی خصوصیت کی وجہ سے ہر ایک کے لیے اپنے اندر بڑی دلکشی رکھتی تھیں وہ ایک فصیح و بلیغ خطیب کی حیثیت سے پورے ملک میں قابل رشک شہرت رکھتے تھے، یہ شہرت سطحی باتوں کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ ان کی تقریروں کی معنوی قدر و قیمت کی بنا پر تھی، ان کی ہر تقریر اپنے اندر ایسے علمی جواہر پارے رکھتی تھی جہاں تک عام اہل علم کی رسائی نہیں تھی، کچھ قدرتی طور پر آپ کا ذہن گہرائیوں میں ڈوب کر ایسے نادر و نایاب اور بیش قیمت موتی نکال لاتا تھا جو دوسروں کی دسترس سے باہر تھا اس لیے اگر ان کی تقریر کو قلمبند کر کے شائع کر دیا جائے تو کم ہی لوگ سمجھ پائیں گے کہ یہ سنبھل سنبھل کر لکھی ہوئی کتاب ہے یا کوئی برجستہ تقریر، مثال میں قاری صاحب کی یہی کتاب "آفتاب نبوت" پیش کی جا سکتی ہے۔

یہ قاری صاحب کی سیرت نبوی پر ایک عالمانہ تقریر ہے جو قلمبند کر کے شائع کر دی گئی ہے اور خود قاری صاحب کے قلم سے ہے، حسب دستور ابتداء میں ایک لمبی تمہید، خوبصورت الفاظ کے برمحل استعمال اور اس کی معنویت کے نئے نئے پہلو تراشنا استعارات

ومجازات کا ایک طویل سلسلہ جو ابتداء کتاب سے آخر تک یکساں ہے پایا جاتا ہے کتاب پڑھتے جایئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اہل علم مرصع عبارت میں شاندار تقریر سنا رہا ہے، انداز تحریر، انداز بیان اور لب ولہجہ سے ہم آہنگ ہے صاف پتہ چلتا ہے کہ لکھا نہیں جارہا ہے بلکہ بولا جارہا ہے، آفتاب نبوت ذات نبوی کا استعارہ کیا گیا تو آخر کتاب تک اس استعارہ کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور سیرت کے ہر ہر پہلو کو اسی آفتاب اس کے نور اور اس سے متعلق اشیاء و کیفیات وخصوصیات کے استعاروں میں گفتگو کی گئی ہے، اگر اس کو تصنیف مان لیا جائے تو کہا جائے گا کہ سیرت کے موضوع پر اپنی نوعیت کی یہ منفرد کتاب ہے جس میں تقریر وتحریر دونوں کی چاشنی موجود ہے، اس میں دو لذتیں ہیں ایک سے دل محظوظ ہورہا ہے اور دوسری سے قوت سامعہ لطف اندوز ہورہی ہے۔

قاری صاحب کا شمار ان علماء میں تھا جن کا اپنا ایک علمی مقام تھا اور وہ اپنے دل میں اصلاح وتبلیغ کا پاکیزہ جذبہ رکھتے تھے ان کی تقریر کا مقصد عوام وخواص کو اسلامی تعلیمات وروایات کی اہمیت وعظمت سے آگاہ کرنا، سیرت نبوی کے ان گوشوں کو روشنی میں لانا تھا جو دلوں میں سرکار دو عالم ﷺ کی قدر ومنزلت، علو شان، علو مرتبت کو جاگزیں کردیں وہ اپنے موضوع سے ایک لمحہ کے لیے بھی صرف نظر نہیں کرتے تھے، ذخیروں سے واقفیت کی بنیاد پر اپنی طویل تقریروں میں بھی جو اپنا موضوع سخن بنالیا اس سے سر موانحراف نہیں کرتے تھے جب تقریر ختم ہوتی تو ہر سننے والا محسوس کرتا کہ اپنے موضوع پر ایک سیر حاصل اور مفید بحث سے استفادہ کا موقع حاصل ہوا، اگر کوئی شخص تقریر کا خلاصہ بتانا چاہے تو دوسرے کو آسانی سے بتا سکتا کیوں کہ وہ ایک مربوط بیان اور علمی شاہکار ہوتا تھا میرے اس بیان کی وہ تمام لوگ شہادت دے سکتے ہیں جنہوں نے کبھی بھی قاری صاحب کی تقریر سنی ہے اور ان کے وعظ میں شریک ہوئے ہیں۔

''آفتاب نبوت'' کی تقریر داعیاً الی اللہ باذنہ وسراجاً منیراً آیت کی تفسیر وتشریح پر ہے اور حق یہ ہے کہ پوری تقریر ایک مرصع، شاندار اور خوبصورت سیرت پاک کا مرقع

ہے جو کتابی شکل میں آفتاب نبوت کے نام سے پیش ہے۔

مضامین کے مجموعے

میرے سامنے قاری صاحب کی جتنی تصانیف موجود تھیں میں نے ان کا تعارف پیش کر دیا ہے ان کے علاوہ ان کے مضامین کے بہت سے مجموعے بھی میرے سامنے ہیں ان میں اہم مضامین معجزہ کیا ہے؟ ''نسب اور اسلام'' میلاد النبی کی حقیقت، تصویر اسلام کے آئینہ میں، اردو کی شرعی حیثیت، سیرت قرآنی، اسلام کے دو امتیازی پہلو، فہم قرآن اور تعلیم مذہب کے دو بنیادی اصول سورہ فیل میں پرویزی تحریف خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ان میں بعض طویل مقالے کی حیثیت رکھتے ہیں جو کامل غور وفکر کے بعد سپرد قلم کیے گئے ہیں یہ تمام مضامین حکیم الاسلام کے حکیمانہ طرز استدلال، ٹھوس معلومات، مستحکم دلائل، آیات قرآنی سے استنباط مسائل، اور استخراج نتائج کے بہترین شاہکار ہیں لیکن فی الحال ان پر تبصرہ میرے موضوع سے خارج ہے اس لیے ان پر گفتگو نہ کر کے اتنی بات کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اگر اہل علم ان مضامین کا مطالعہ کریں تو وہ محسوس کریں گے کہ ان کے علم میں اضافہ ہوا، ان کی معلومات کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا، کیوں کہ قاری صاحب نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے سطحی طرز کلام اختیار نہیں کیا ہے، ان میں سے کوئی بھی مقالہ یا مضمون ان کی عالمانہ، محققانہ اور حکیمانہ شان سے فروتر نہیں ہے۔

آخری بات!!!!!

قاری صاحب ایک عظیم المرتبت علمی خانوادے کے فرد فرید ہیں اس خانوادے کا ہر فرد علم وفضل کا آفتاب و ماہتاب ہے اور کہا جائے کہ ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' تو اظہار واقعہ ہوگا، قاری صاحب کے جد امجد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے جس علم کلام کا علماء میں ذوق پیدا کیا تھا حضرت قاری صاحب کو اس سے حظ وافر ملا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی بیشتر کتابوں پر ان کا یہ متکلمانہ رنگ چھایا ہوا نظر آتا ہے، اس کی وجہ سے ان کی تصنیفات مرعوب کن، وقیع اور شاندار ہو جاتی ہے اور ان کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے، چوں کہ زبان پر قدرت

حاصل ہے اس لیے دقیق کلامی مباحث کو اردو میں سہل بنا کر پیش کرنے میں ان کو کمال حاصل ہے، البتہ زبان بالعموم وہ استعمال کی گئی ہے جو ہمارے عربی مدارس کی درسی تقریروں میں رائج ہے، جس کی وجہ سے زبان بوجھل ہو جاتی ہے، عربی زبان کے ایسے مغلق اور اجنبی الفاظ مسلسل استعمال کرتے ہیں جن سے اردو داں طبقہ بڑی حد تک نامانوس ہے جب کہ اردو کو سہل اور سادہ بنا کر اس میں علمی مباحث کو ادا کرنے کی جدوجہد کی جارہی ہے، شبلی نے اس دور میں اپنی کتابیں لکھ کر ایک روشن مثال قائم کردی ہے جب کہ اردو پر ابھی پورے طور پر نکھار بھی نہیں آیا تھا لیکن انہوں نے اپنی معرکۃ الآرا کتابیں لکھ کر ثابت کردیا کہ دقیق علمی مسائل بھی سلیس اردو میں اس طرح پیش کیے جا سکتے ہیں کہ اظہار مطالب کو ادنیٰ ٹھیس بھی نہیں لگ سکتی ہے، اردو زبان تو اس کے بعد اور بھی وسیع ہو چکی ہے اب ہر طرح کے مباحث کے لیے اس کے پاس ایک عظیم الشان ذخیرۂ الفاظ ہے، کہیں بھی قلم کو اردو کی تنگ دامانی کی شکایت لاحق نہیں ہوسکتی ہے، میں صرف ایک کتاب کے ایک صفحہ سے چند الفاظ بطور مثال پیش کرتا ہوں بعض الفاظ کا تلفظ بھی اردو داں طبقہ کو دشوار محسوس ہوگا مثلاً متفرنجانہ، مالوفات، زی دہیہ، تجمل وتزئین، فتنہ عمیاء، دور التباس مستقلاً بغتۃً، تدین، متشتت، مائدہ، باصرہ اہل نظر، وغیرہ جب اردو تحریر میں ان لفظوں کو استعمال کیا جاتا ہے تو یہ الفاظ اس طرح وحشت زدہ نظر آتے ہیں جیسے کوئی اجنبی بے تکلف دوستوں کی محفل میں گھس آئے۔

دوسری بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ ہے کہ قاری صاحب کی بیشتر کتابوں پر وعظ و تقریر کا انداز و بیان غالب ہے، مروجہ تقریروں کی طرح طویل ترین تمہید، بات اتنی دور سے شروع ہو جاتی ہے کہ معلوم نہیں ہوتی ہے کہ اصل موضوع سے کیا تعلق ہے ایک شخص کتاب کا موضوع معلوم کر کے کتاب اٹھاتا ہے اور چاہتا ہے کہ موضوع سے متعلق فوراً کچھ معلوم کرلے اور جب کتاب شروع کرتا ہے تو بڑی دور تک اس کی رسائی اصل موضوع تک نہیں ہوتی تو اکتاہٹ محسوس کرتا ہے حالانکہ اگر یہ تمہیدی صفحات کوئی پڑھ لے تو اصل

موضوع کے علاوہ بھی اس کی معلومات میں قابل قدر اضافہ ہوگا کیوں کہ بالعموم تمہید میں جو بحثیں اٹھائی گئی ہیں وہ بڑی عالمانہ اور حکیمانہ ہیں اس لیے اس کا وقت رائیگاں نہیں ہوگا لیکن انسان بڑا عجلت پسند واقع ہوا ہے اس لیے وہ جلد از جلد اپنے مطلب کی باتیں جاننا چاہتا ہے اس لیے طویل تمہید سے اس کے ذہن پر افسردگی طاری ہو جاتی ہے۔

حاصل کلام حضرت قاری صاحب علم و فضل کے بلند ترین مقام پر فائز تھے اس سے نیچے اتر کا باتیں کرنا ان کے لیے ممکن ہی نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ ان کی تقریر یا تحریر دونوں میں وہ علمی جواہر وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں جو عام کتابوں کے مطالعہ سے حاصل نہیں کیے جاسکتے ان کی تقریر و تحریر جہاں ان کے وسیع مطالعہ و معلومات کا پتہ دیتی ہیں وہیں یہ بھی یقین کرنے پر مجبور کرتی ہیں کہ قاری صاحب کو قدرت نے علماء متکلمین کا ذہن وقّاد عطا فرمایا ہے، اسی لیے ایک ایک لفظ سے معارف و حقائق کے اتنے نکتے خود پیدا کر لیتے ہیں جو کتابوں میں آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتے اس لیے اگر اہل علم حضرت قاری صاحب کی تصنیفات کو اپنے مطالعہ میں رکھیں تو ان کو علمی زندگی میں بڑی روشنی ملے گی، قاری صاحب کی یہ تصانیف درحقیقت اہل علم پر احسان عظیم ہے اور جب تک یہ کتابیں پڑھی جائیں گی ان کا نام نیک زندہ و پائندہ رہے گا اور جن نیک مقاصد و مقدس جذبات کے تحت یہ کتابیں وجود میں آئی ہیں ان کی وجہ سے امید ہے کہ قدرت نے اپنی رحمتوں، مغفرتوں اور انعامات سے یقیناً نواز دیا ہوگا اور رحمت خداوندی نے استقبال کرتے ہوئے ان کی روح سے کہا ہوگا ——— ادخلی فی عبادی و ادخلی جنتی۔

❁❁❁

حکیم الاسلامؒ اوران کی تصانیف

(از: محمد عمران قاسمی بگیانوی ر محلہ محمودنگر، مظفرنگر (یوپی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم. الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ الہ وصحبہ اجمعین. اما بعد:

دنیائے اسلام کی عظیم مذہبی اور روحانی یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند ایک تعلیم گاہ ہی نہیں بلکہ کروڑوں نفوس کی دینی رہنما اور ان کی علمی ومذہبی ضرورتوں کا ضامن اور نگہبان ادارہ بھی ہے۔ اس ادارے نے ایسی ایسی عظیم اور تاریخی شخصیات پیدا کیں کہ پچھلی قریب پانچ سو سال کی اسلامی تاریخ اس ادارے کی مردم سازی کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب جیسی سینکڑوں نابغہ روزگار شخصیات ہیں جن کی علمی سیرابی، دینی ذہن سازی اور ذوق وفہم کو اسلامی نہج پر ڈھالنے کا سہرا اسی تاریخی درس گاہ کے سر ہے۔

دارالعلوم دیوبند نے امت مسلمہ کی ہر موڑ پر دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اس کے فرزندوں میں جہاں محدث ومفسر ملیں گے وہیں حکماء اور متکلمین بھی دکھائی پڑیں گے، جہاں مصنفین واصحابِ قلم نظر آئیں گے وہیں واعظین وخطباء بھی اپنی قابل ذکر موجودگی درج کرانے میں پیچھے رہتے نہ ملیں گے، جہاں صوفی او رمتصوف ملیں گے وہیں جلسوں اور عام مجمعوں میں اپنی دھاک جمانے والے بھی کم

نہیں نکلیں گے، جہاں جذبۂ حریت سے سرشار ایک جماعت نظر آئے گی وہیں خانقاہ نشینوں اور اصحابِ باطن کی بھی ایک معتد بہ مقدار ملے گی، جہاں صاحب افتاء وقضاء ملیں گے وہیں اربابِ انتظام وحکومت بھی دستیاب ہوں گے، جہاں تاریخ داں اور وقائع نگار نظر آئیں گے وہیں زبان وادب کے ماہرین کی بھی کوئی کمی نظر نہ آئے گی۔ غرض یہ علم وادب کی تمام اصناف اور زندگی کے ہر میدان اور کارزارِ حیات میں یہاں کے فضلاء کی بھرپور اور قابلِ قدر خدمات ہیں۔

دارالعلوم دیوبند صرف تعلیمی ادارہ نہیں بلکہ ایک تحریک اور مستقل مکتبِ فکر کا نام ہے جو اہل سنت والجماعت کی راہِ حقیقت نما کا حامل اور سچا ترجمان ہے۔ مسلک دیوبند کی سب سے زیادہ جامع تشریح وتوضیح جس شخصیت کی تحریر وتقریر کے ذریعہ منظر عام پر آئی وہ حضرت حکیم الاسلام کی ذاتِ گرامی تھی۔

ماہر نفسیات کا کہنا ہے کہ ہر شخص کی تحریر وتقریر میں اس کی مزاجی خصوصیات پنہاں ہوتی ہیں۔ جب آدمی کوئی مضمون لکھتا ہے یا کسی جگہ اظہارِ خیال کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو بہت مشکل ہے کہ وہ اپنے جذبات وخیالات کا عکس اپنی تحریر وتقریر میں آنے سے روک سکے۔

اگر دیکھا جائے تو یہی وجہ ہے کہ شیر دل اور بہادر انسانوں کا ایک جملہ ہی بعض دفعہ اپنے مخاطبین وسامعین کے دل کی کایا پلٹنے کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ جن حضرات پر آخرت کا غلبہ ہوتا ہے ان کی تحریرات پڑھنے سے (جو اگرچہ پہلے سے ذہن میں موجود بھی ہوں) انسان کو رغبت الی الآخرۃ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اسی طرح اگر خدا سے بے زار اور دین سے دور لوگوں کی تحریرات اور ان سے کسی طرح کا لگاؤ اور انس انسان کو خدا سے دور اور دین سے بے زار کرنے میں کافی بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ انسان کی تحریر وتقریر میں اس کی ذہنی روش اور خیالات وافکار کا عکس ہوتا ہے، اور جب کوئی آدمی بہ نظر عقیدت اس سے مستفید ہوتا اور اخذِ افکار کرتا ہے تو وہ عکس اس کے قلب وذہن پر اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں رہتا۔

حضرت حکیم الاسلام کی تحریرات وتصنیفات کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ایک قاری اور اَخاذ طبیعت رکھنے والے انسان کیلئے جہاں ان میں بے شمار علمی جواہر اور درِ ثمینہ ملیں گے وہیں حضرت قاری صاحبؒ کے اوصاف، افکار، نظریات، توقعات اور ذہنی وخلقی کمالات اسکے سامنے آئیں گے۔

میں نے حضرت قاری صاحب کی کئی کتابیں دورِ طالب علمی ہی میں پڑھیں، اس وقت تو شاید ان گہرے علوم کا نصف حصہ بھی سمجھ میں نہ آیا ہو، تاہم اپنے قصورِ فہم اور کوتاہ علمی سے واقفیت بھی کوئی معمولی حصولیابی نہ تھی۔

بہتر ہوگا کہ "تحقیقاتِ حکیم الاسلام" کے مقدمہ میں اس ناچیز نے جو کچھ لکھا اس کی چند سطور کو یہاں نقل کردیا جائے۔

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی علمی، عملی، تصنیفی، خطابتی اور انتظامی حیثیت سے کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ حضرتِ والا کا نسبی تعلق اگرچہ اس خانوادے سے ہے جو برصغیر ہند، کل عالم اسلام بلکہ یورپ وافریقہ اور براعظم امریکہ تک اپنے فیضانِ علمی کے سبب وقعت وممنونیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، میری مراد بانیٔ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ' سے ہے۔ مگر حضرت حکیم الاسلام خاندانِ قاسمی کے گوہر نایاب ہونے کے ساتھ ساتھ بذاتِ خود بھی ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے۔

ان کی خوبیوں اور کمالات میں پیچیدہ سے پیچیدہ اور نازک سے نازک مسئلہ میں حکمِ شریعت اور علماءِ حق کے موقف کی مؤثر اور دلنشیں انداز میں تعبیر وتشریح، مخالفوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں اعلیٰ ظرفی ووسیع النظری، اپنے بڑوں کا ادب واحترام، ہم عصروں میں فرقِ مراتب کا لحاظ، چھوٹوں پر شفقت، بلند اخلاقی کی اعلیٰ مثال پیش کرنا ایسے اوصاف ہیں جو ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں جاکر کسی ایک شخصیت میں مجتمع ہوتے ہیں۔ بلا مبالغہ حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی تحریر وتقریر، حسن انتظام اور موافقین ومخالفین کا اعتراف اس

بات کا بیّن ثبوت ہے کہ حضرت حکیم الاسلام ایک نادرِ روزگار شخصیت تھے۔

کچھ سال پہلے میرا جذبہ اور تمنا تھی کہ حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی شخصیت پر کچھ لکھوں، اس سلسلہ میں کچھ سوانحی مواد بھی اکٹھا کیا، مآخذ ومراجع کی فہرست بنائی، مگر بعض عوارض کے سبب یہ کام انجام نہ پاسکا۔ گذشتہ سال جب ''حکیم الاسلام عالمی سیمینار'' کے انعقاد کا آوازہ بلند کیا گیا تو ایک بار پھر اپنے اُس ناتمام منصوبے اور دلی جذبہ نے کروٹ لی، طبیعت میں ایک تموج اور جوش پیدا ہوا اور خیال آیا کہ حضرت حکیم الاسلام کے سوانحی تذکرہ کی ترتیب کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہوسکتا ہے۔ لیکن جن مآخذ ومراجع سے استفادے پر اس کارِ عظیم کی تکمیل موقوف تھی اس کے لئے دیوبند میں ایک طویل مدت تک قیام ناگزیر تھا، جس سے میری معاشی مصروفیات مانع ہیں۔

''حکیم الاسلام عالمی سیمینار'' کی طرف سے اہل قلم حضرات کی خدمت میں مضامین ومقالات لکھنے کی فرمائش کرتے ہوئے جو دعوت نامہ ارسال کیا گیا اس میں مقالات ومضامین کے لئے رہنما عنوانات کی بھی خاصی لمبی فہرست تھی، اسے دیکھنے کے بعد اپنی کم علمی، قلم کی بے یاوری اور حضرت حکیم الاسلام کی عظیم شخصیت کا سوانحی حق ادا نہ ہوسکنے کا احساس دامن گیر ہوا۔ فہرست عنوانات دیکھ کر لگا کہ یہ میرے لئے ایک سامانِ تسلی بھی ہے کہ اگر انگلی کٹا کر شہیدوں میں نام لکھانے کا شوق ہی ہے تو وقت کے جید اہل قلم کے مضامین ومقالات منظر عام پر آجانے کے بعد مزید سہولت پیدا ہوجائے گی اور ان حضرات کے مقالات سے حضرت حکیم الاسلام کی زندگی کے بہت سے ایسے گوشے اور واقعات سامنے آجائیں گے جن تک عام طور پر رسائی نہیں ہوپاتی۔ اگر ضرورت سمجھی تو پھر کسی وقت اس منصوبہ کو جامۂ عمل پہنایا جاسکتا ہے۔

پھر ایک نیا داعیہ پیدا ہوا کہ حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی مطبوعہ تالیفات (جن میں سے نوے فی صد طبع ہونے کے بعد اب عام کتب خانوں سے ناپید ہیں) کو ایک جگہ جمع کرکے مجموعوں کی شکل میں شائع کیا جائے، تاکہ اس بیش بہا خزانہ کی حفاظت ہو

جائے۔اس ارادے کے ساتھ کتابوں کی تلاش شروع کی، حضرت کی کتابوں کی فہرست بنائی گئی جن کی تعداد اسّی سے زائد تھی۔لیکن جب کتابوں کو تلاشنا شروع کیا تو افسوس آمیز حیرت یہ کہ دارالعلوم کے کتب خانہ میں بھی رجسٹر کتب اکابر میں موجود کتابوں کی تعداد انتالیس تھی۔ستم بالائے ستم یہ کہ خاندانِ قاسمی کے پاس بھی حضرت کی کتابوں کا کوئی ذخیرہ نہ مل سکا۔بالآخر اِدھر اُدھر مختلف حضرات سے رابطہ، بڑی محنت، جدوجہداور کثیر مصارف کے بعد تقریباً سبھی کتابوں کے حصول میں کامیابی ہوئی۔

اس مرحلہ پر افسوس کے ساتھ بہت دکھ بھی ہوا کہ حضرت حکیم الاسلام کی ذات کے ساتھ جس ناقدری کا معاملہ کیا گیا، اس سے زیادہ لاپرواہی اس علمی سرمایہ اور گنج گرانمایہ کے ساتھ برتی گئی جس کی حفاظت واشاعت صرف دارالعلوم دیوبند، اہل خاندان حکیم الاسلام، دیوبند کے اشاعتی اداروں ہی کا فرضِ کفایہ نہ تھی بلکہ پورے حلقہ دیوبند اور اگراس سے بھی آگے بڑھا جائے تو اہل سنت والجماعت کے تمام مکاتبِ فکر یہ کی ذمہ داری بنتی تھی کہ شریعتِ حقہ اور علومِ ولی اللّٰہی کی شرح وتفسیر جس انداز میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے قلم سے ہوئی وہ عدیم المثال ہے، اس کی حفاظت وقدردانی سب کے لئے لازم تھی۔حضرت کی ایک ایک تحریر اس لائق ہے کہ اس کو صرف علماءِ کرام ہی حرزِ جان نہ بنائیں بلکہ مختلف درجات میں بنیادی نصاب یا خصوصی مطالعہ میں ان قیمتی تصانیف کو جگہ ملنی چاہئے۔آج جب کہ نئے نئے مصنّفین کی بھرمار ہے اوران کی لکھی کتابیں داخلِ درس کی جارہی ہیں، کیا ایسی استدلالی رنگ سے مصبوغ، تحقیق وتنقیح سے مزین، حکمت آفرینی سے بھرپور کتابیں اس کی حقدار نہیں کہ ان سے نئی نسل کو روشناس کرایا جائے؟ پوری جماعتِ دیوبند اس قرض سے سبکدوش نہیں ہوسکتی جو انھوں نے حضرت حکیم الاسلام کے گنجینۂ گرانمایہ سے فیض اٹھانے اوراسے نئی نسلوں میں عام کرنے کے بارے میں لاپرواہی برت کراپنے اوپر لادا ہے۔

(مقدمہ تحقیقاتِ حکیم الاسلام۔مرتبہ محمد عمران قاسمی بگیانوی)

اگر چہ مجھ جیسے ناقص العلم اور کوتاہ نظر کے لئے یہ کسی طرح موزوں نہیں کہ میں حضرت حکیم الاسلام کی تالیفات اور تحریرات پر قلم فرسائی کر کے اپنی ہرزہ سرائی میں اضافہ کا سامان کروں، چونکہ لامحالہ اس موضوع کا حق ادا کرنا تو درکنار یقین اس کا ہے کہ اپنی کم علمی اور بے شعوری کے سبب کہیں ان وقیع تحریرات کی شان میں کوئی گستاخی نہ ہو جائے۔ پھر بھی میں اپنی بساط بھر کوشش کروں گا کہ حضرت کی تالیفات کے تعارف میں حضرت ہی کے الفاظ کا سہارا لے کر دو چار تمثیلات پیش کروں تا کہ اہل نظر خود ہی مشاہدہ کر لیں کہ ان ''اوراقِ طیبہ'' میں علم کے کیا کچھ خزانے مدفون ہیں جن کے حصول کی ہر قدر شناس کو طلب اور خواہش ہونی چاہئے۔

جہاں تک کتابوں کی کتابت اور تصحیح کے دوران میں فہم نارسا نے کام کیا ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ:

۱۔ حضرت کے یہاں قوتِ استدلال اس قدر مضبوط ہے کہ اپنی بات کہنے اور اپنے موقف کی وضاحت میں نقلیات سے لے کر عقلیات تک دلائل و شواہد کے انبار لگا دیتے ہیں، جس سے مخاطب صرف علمی طور پر ہی نہیں بلکہ ایک ذہنی طمانینت کے ساتھ اس بات کو قبول کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

۲۔ دوسری خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ اپنے مافی الضمیر کو ایسے دل نشیں اور معجزانہ اسلوب میں پیش کرتے ہیں کہ عبارت کے سادہ ہوتے ہوئے بھی بلند سے بلند مضامین کو بیان کر جاتے ہیں جسے پڑھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ ایسے دقیق مضمون کو کیسے آسان انداز میں بیان کر دیا۔ چنانچہ حضرت کی تحریر و تقریر کی یہ انفرادیت ہے کہ مضامین بلند اور طرزِ تفہیم آسان و دلچسپ۔

۳۔ حضرت حکیم الاسلام کی تحریر و تقریر کی ایک واضح خصوصیت یہ ہے کہ آپ جس موضوع پر زبان و قلم وا کرتے ہیں اس کو ایسے انداز سے بیان کرتے ہیں جیسے اس کی پوری ترتیب اور سانچہ پہلے سے حد درجہ منظّم آپ کے ذہن میں تیار اور موجود تھا۔ ایسا

معلوم ہی نہیں ہوتا کہ برجستہ تحریر و تقریر کی اتنی زبردست پکڑ اس موضوع پر ہو سکتی ہے، یہ مضامین کی آمد کی شان ہے آورد کی نہیں، اور اگر یہ کہا جائے کہ اس میں قوتِ مطالعہ اور حافظہ و یادداشت کا دخل ہے تو بھی یہ منفرد کمال ہی کہا جائے گا کہ آپ نے قرآن وحدیث کے علوم اور اسلاف کرام کی تشریحات وتوضیحات کو اس طرح گھول کر پی لیا تھا کہ وہ آپ کے ذہن و مزاج کا حصہ بن گئی تھیں۔ اسی لئے ان کے بیان کے وقت ادنیٰ قسم کا تکلف و بار آپ کی طبیعت کو محسوس نہ ہوتا تھا۔

۴۔ ایک خصوصیت یہ بھی مستفاد ہوتی ہے کہ آپ جس موضوع پر کلام کرتے تھے تو براہِ راست اس پر پہنچنے سے پہلے مخاطب کی ذہن سازی کے لئے تمہیدی طور پر کچھ اصول وضوابط اور کلیات بیان فرماتے تھے اور انہیں کلیات واصول پر تفریعات کرتے ہوئے زیرِ نظر موضوع اور اصل مقصد پر آتے تھے۔ اس طرح بات مخاطب کے ذہن میں بیٹھتی چلی جاتی تھی۔ اس سلسلہ میں ''مسئلہ قربانی پر ایک نظر'' ہی کو دیکھ لیجئے جو ایک مختصر سی تحریر ہے، مگر اپنے موضوع پر نہایت جامع۔

۵۔ حضرت کی تحریروں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ آپ کسی شبہ والزام کے جواب دینے میں صرف الزامی وتحقیقی جوابات ہی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ مخاطب کی ذہنیت اور منصوبہ کو سامنے رکھتے ہوئے آگے بڑھ کر اس کے مزعومات ومعتقدات پر اعتراضات قائم کر کے اس کے مسلک و مذہب کی حقیقت بھی واضح کرتے تھے۔ جیسا کہ ''اسلام کا اخلاقی نظام، دار العلوم کا ایک فتویٰ اور اس کی حقیقت، ڈاڑھی کا فلسفہ، معیارِ حق، اجتہاد اور تقلید، شرعی پردہ، شہید کربلا اور یزید، سورۂ فیل میں پرویزی تحریف'' وغیرہ رسائل میں صاف نظر آتا ہے کہ صرف متعلقہ مسئلہ ہی کو واضح نہیں کیا بلکہ فریق مخالف کے مزعومات، معتقدات اور اساسِ استدلالات پر بھی بھرپور وار کیا ہے۔

۶۔ حضرت حکیم الاسلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ آپ سائل ومعترض کی صرف تحریر ہی نہیں پڑھتے بلکہ اس کے اصل منشاء اور ذہن کو بھی پڑھ لیتے ہیں، اور ایک حاذق

طبیب کی طرح اس کے شبہ واعتراض کے علاج کے لئے ہر وہ نسخہ تجویز کرتے ہیں جو اس مرض کا شافی علاج ہو۔ آپ صرف اس کے اعتراض وشبہ ہی کا جواب نہیں دیتے بلکہ اگر اس کے ذہن میں کوئی کجی، زیغ اور نیت میں فتور ہوتا ہے تو اس کی بھی اصلاح کرتے ہیں۔ اس کو یہ بھی یاد دلاتے ہیں کہ یہ شبہ واعتراض اس کی شان کے مطابق ہے یا اس سے فروتر۔ ''ڈاڑھی کی شرعی حیثیت، نکاح وطلاق عقل وشرع کی روشنی میں، شرعی پردہ، دارالعلوم کا ایک فتویٰ'' وغیرہ کتب میں یہ رنگ خوب واضح ہے۔

۷۔ حضرت حکیم الاسلام کی تحریر وتقریر کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ وہ اصل مسئلہ کی تنقیح ووضاحت، الزامی وتحقیقی جوابات اور سائل کی کمزوریوں کی نشاندہی اور اس کے معتقدات کے لچرپن کے اظہار کے ساتھ ساتھ آخر میں اس کی صحیح رہنمائی بھی کرتے ہیں، اور اس شاہراہِ عمل پر لانے کی کوشش کرتے ہیں جس پر چل کر کامیابی اور فلاح یقینی ہے۔ مثلاً ''بریلوی حضرات کی طرف سے پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ'' کے آخر میں دیوبندی بریلوی اختلاف کی خلیج کو پاٹنے کی جو ایک مخلصانہ دعوت دی اور اس اختلاف کو عوامی سطح پر لانے کے نقصانات اور اس کے خاتمہ کے لئے اپنے دلی جذبہ اور تڑپ کا اظہار کیا وہ اپنے اختصار کے باوجود ایک ''مثالی تحریر اور دعوتِ فکر'' ہے۔ اسی طرح ''شہید کربلا اور یزید'' کے آخر میں شیعہ حضرات کی خدمت میں جو چند سطریں تحریر کیں ان میں ایک مرکزی نقطہ کی طرف توجہ دلائی کہ آج حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخی کی گئی جو آپ اور ہم، سب ہی کے لئے کس قدر تکلیف کی بات ہے، اور اس کے دفاع اور جواب دہی کے لئے ہم سب ہی کھڑے ہوگئے ہیں، یہ بڑے ہی دکھ کی بات ہے کہ کسی کے دینی مقتدا اور مذہبی پیشوا کی شان میں گستاخی کرکے ان کے متبعین کو رنج وتکلیف میں مبتلا کیا جائے۔ یہی بات شیعہ حضرات کو سوچنی چاہئے کہ جب وہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی شان میں گستاخی کرتے ہیں تو اہل سنت والجماعت کے دل پر کیا گذرتی ہوگی۔

اسی اصول پر عمل کرتے ہوئے حضرت حکیم الاسلام خود بھی کسی کے دینی مقتدا اور پیشوائے مسلک کی شان میں بے جا نازیبا کلمات کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں۔ جو تحریریں ایسی ہیں کہ کسی کے اعتراض والزام کے جواب میں لکھی گئی ہیں، ان کے آخر میں اس کا اعتذار اور معذرت کا اظہار بھی کرتے ہیں، اور احتیاطاً طلب معافی بھی۔ واضح فرمادیتے ہیں کہ ویسے تو دانستہ کسی کی ذات پر حملہ کرنا میرا مقصد نہیں ہے لیکن الزام کے جواب میں اگر کہیں کوئی نامناسب لفظ یا غیر مہذب پیرایہ سرزد ہوگیا ہو تو اس کے لئے میں معافی کا طلب گار ہوں کہ دل سے کسی کی کردارکشی میرا منشاء نہیں ہے۔ ساتھ ہی اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ جہاں بات احقاقِ حق یا ابطالِ باطل کی ہو وہاں حضرت ادنیٰ نرمی برتنا بھی گوارا نہیں کرتے، اور برتنا بھی نہیں چاہئے، کیونکہ اس سے یا تو علم واستدلال کی کمزوری کا اظہار ہوتا ہے یا مداہنت پائی جاتی ہے۔

۸۔ یہ بات تو معروف ہی ہے کہ حضرت قاری صاحب کو حکمت قاسمیہ سے مناسبت ہی نہیں بلکہ وہ اس کے ترجمان وشارح بھی ہیں۔ علمی دنیا پر آپ کا یہ بڑا احسان ہے کہ آپ نے علومِ نانوتوی اور فلسفۂ ولی اللّٰہی کو دقیق اور غامض اصطلاحوں سے باہر نکال کر سہل الحصول بنادیا ہے۔ آپ کی تحریر سادہ ہے مگر مضمون کی بلندی یہ کہ حضرت نانوتوی، حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت امام غزالی حکمت آفرینی کا بھرپور عکس جھلکتا ہے۔ بلکہ بعض کتابوں میں تو طرزِ تحریر، اظہارِ بیان اور الفاظ وتعبیرات تک میں اس قدر یکسانیت اور مشابہت ہے کہ حضرت نانوتویؒ کی تحریر کا گمان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کی کتاب ''فلسفہ نعمت ومصیبت'' کو پڑھئے تو مضامین کی بلندی کے ساتھ طرزِ تحریر میں بھی حضرت نانوتوی کا مکمل عکس جھلکتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی حضرت حکیم الاسلام کی تحریر وتقریر میں بہت سی خصوصیات ہیں، جن کا احاطہ کرنا مجھ جیسے کم علم کا کام نہیں۔ حضرت کی کتابوں کے مطالعہ کے دوران اپنے فہم نارسا کے مطابق جو چند باتیں ذہن نے اخذ کیں انہیں ہی اپنے ان ٹوٹے پھوٹے

اور بے ربط الفاظ میں نذرِ قارئین کر دیا۔ ورنہ یہ دریا تو وہ ہے کہ جس کی کوئی تھاہ نہیں۔

مضمون طوالت کی طرف بڑھ رہا ہے اس لئے میں حضرت حکیم الاسلام کے تحریری نمونوں میں سے صرف چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ جنہیں "مشتے نمونہ از خروارے" کہنا چاہئے۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے جو اُن کی دینی کمزوری اور اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کی دلیل ہے، کہ قربانی کرنے کے بجائے اگر اس کی رقم خیرات کر دی جائے تو نہ صرف یہ کہ اس سے غریبوں کی زیادہ مدد اور خبر گیری ہو سکتی ہے، بلکہ اہل وطن کے اس اعتراض سے بھی بچا جا سکتا ہے کہ قربانی (یعنی ذبح جانور) کرنا بے رحمی ہے۔ (نعوذ باللہ)

چنانچہ کئی سال قبل کی بات ہے کہ جنوبی ہندوستان میں بقرعید کے دن مہاویر جینتی کا تہوار ہونے کے سبب وہاں کے بعض نام نہاد مسلمانوں نے قربانی نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اخبارات نے اسے نمایاں اہمیت دی۔ گویا انہوں نے ایک بے بنیاد مذہب کے خود ساختہ شعار کا احترام کیا مگر شریعتِ اسلامیہ کے ابدی قانون کو پس پشت ڈال دیا۔ اعاذنا اللہ منہ۔

اسی مسئلہ کو واضح کرتے اور معترضین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے "مسئلہ قربانی پر ایک نظر میں" حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا:

مسئلے کی شرح سے پہلے ایک اصول سمجھ لیجئے اور یہ اصول جس طرح تکوینی ہے اسی طرح تشریعی بھی ہے، وہ یہ کہ خدا تعالیٰ نے اس کائنات کا ذرہ ذرہ دو چیزوں سے ملا کر بنایا ہے ایک روح، ایک جسم۔ یعنی ہر چیز کی ایک صورت ہے، ایک اس کی حقیقت۔ ایک شئے کی ہیئت ہے اور ایک اس کی ماہیت ہے۔ یا یوں کہئے کہ اس کا ایک ظاہری حصہ ہے اور ایک باطنی، غرض تمام انسان، کل حیوانات، نباتات، جمادات کی جہاں ایک صورت ہے وہاں اس کی ایک حقیقت بھی ہے، ایک اس کا بدن بھی ہے اور ایک اس کی روح ہے، اور ہر بدن میں خدا تعالیٰ نے اس کے مناسب روح ڈالی ہے۔

جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اس کائنات کی کوئی

بھی چیز باقی نہیں رہ سکتی، جب تک اس کا بدن اور روح ملے ہوئے نہ ہوں، گویا بدن کی بقاء موقوف ہے روح پر اور روح کی بقاء بدن پر، اگر اپنے بدن کو توڑ پھوڑ کر خستہ خراب کر دیا یا وہ خود ہی قدرتی طور پر خراب ہو گیا اور اس میں سکت باقی نہ رہی تو پھر اس میں روح نہیں ٹھہرتی بلکہ پرواز کر جاتی ہے، اسلئے کہ بدن ہی روح کو سنبھالے رکھتا ہے۔

مثلاً انسان میں اگر روح ہے تو وہ انسان ہے ورنہ لاشہ ہے جو بیکار ہے۔ پھر جس طرح مجموعۂ بدن کی مجموعہ روح ہے اسی طرح بدن کے ہر ہر جزء کی ایک روح ہے جو اسی جزء کے ساتھ رہ سکتی ہے، اگر اس جزء کو ختم کر دیا جائے تو یہ روح بھی نہ رہے گی، یہ نہ ہوگا کہ بدن کے ایک جزء کو ختم کر دیں تو اس کی روح کسی دوسرے جزء میں پہنچ جائے۔ مثلاً آنکھ ہے اس کی روح قوتِ بینائی ہے، اگر آنکھ پھوڑ دی جائے تو یہ نہیں ہوتا کہ دیکھنے کی قوت مثلاً ناک میں آجائے بلکہ یہ قوت باقی ہی نہیں رہتی، اسی طرح ناک ہے اس میں سونگھنے کی قوت ہے وغیرہ۔

غرضیکہ خداوند تعالیٰ نے جس قدر قویٰ پیدا کئے ہیں ان میں قوت اور روح بھی پیدا کر دی ہے اور یہ دونوں مل کر کائنات کا حصہ بنتے ہیں، اگر دونوں کو الگ الگ کر دیا جائے تو اسی حقیقت کو موت کہتے ہیں اور اس حقیقت سے کائنات کی تمام اشیاء ختم ہو جاتی ہیں۔

ایک دوسرا اصول اور سمجھ لیجئے جو اسی سے متعلق ہے کہ بدن کے اندر جو قوتیں چھپی ہوئی ہیں ان کی پہچان ان ابدان ہی کے ذریعے کی جاتی ہے، مثلاً قوتِ بینائی کی شناخت آنکھ سے کی جاتی ہے اور قوتِ سماعت کی کان سے۔ غرض یہ صورتیں ان قوتوں کے تعارف کا ایک ذریعہ ہیں، اگر یہ صورتیں نہ ہوں تو یہ تعارف ختم ہو جائے۔ اس اصول کا حاصل یہ ہوا کہ بدن ذریعہ ہے روح کی پہچان کا۔

اب تیسرا اصول اور سمجھ لیجئے کہ اگر آپ روح تک کوئی اثر پہنچانا چاہیں تو وہ بدن ہی کے ذریعہ پہنچ سکتا ہے، اس عالم میں براہِ راست روح کو متاثر کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ مثلاً اگر آپ روح پر گرمی کا اثر کرنا چاہیں تو بدن کو آگ کے سامنے لے جائیں

گے جب پہلے بدن گرم ہو جائے گا اس کے بعد روح کو گرمی پہنچے گی، اور ٹھنڈک پہنچانا چاہیں تو آپ بدن پر پانی ڈالیں گے یا اس پر برف ملیں گے یا وضو کریں گے وغیرہ۔ غرض ہر تاثیر کیلئے بدن ذریعہ ہے بغیر بدن کے اثرات نہیں پہنچ سکتے۔.........

اور یہ تینوں اصول جس طرح تکوینی ہیں اسی طرح تشریعی بھی ہیں، یعنی اعمالِ شرعیہ میں بھی ایک صورت ہے، ایک روح اور بغیر صورت کے روح کا باقی رہنا ناممکن ہے۔ اسی طرح اگر روح تک کوئی اثر پہنچانا چاہیں تو وہ صورت ہی کے ذریعہ پہنچ سکتا ہے اسکی مثالوں سے شریعت بھری پڑی ہے۔.........تو یہ جو "قربانی" ہے اس کی بھی ایک صورت ہے اور ایک روح، صورت تو جانور کا ذبح کرنا ہے اور اس کی حقیقت ایثارِ نفس کا جذبہ پیدا کرنا ہے، تقرب الی اللہ ہے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ روح بغیر جانور کو ذبح کئے کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ بات پہلے معلوم ہو چکی کہ ہر صورت میں اس کے مطابق روح ڈالی جاتی ہے، نماز میں نماز کی روح، زکوٰۃ میں زکوٰۃ کی روح اور قربانی میں قربانی کی روح ڈالی جاتی ہے۔ غرض خدا تعالیٰ نے اس کی جو صورت مقرر کر دی ہے وہی اختیار کرنا پڑے گی تب وہ روح اس میں ڈالی جائے گی، اگر وہ کسی چیز کی قربانی طلب کریں تو قربانی دینی ہوگی۔

.........اب اگر آپ نے قربانی کے بجائے صدقہ کیا تو صدقہ سے جاں نثاری کا تقویٰ کیسے حاصل ہوگا؟ کیوں کہ صدقہ کا تقویٰ تو اور طرح کا ہوگا۔ اسی طرح اگر آپ نے قربانی کے بجائے نماز پڑھ لی تو نماز سے عاجزی اور بندگی کا تقویٰ تو ملا مگر قربانی کا نہ ملا۔ پس اگر کوئی شخص قربانی نہ کرے اور صدقہ دیدے تو قیامت کے روز اس کو اس صدقہ کا ثواب مل جائے گا مگر قربانی کا مطالبہ رہے گا، اور یہ سوال ہوگا کہ قربانی کیوں نہیں کی، بالکل اسی طرح جیسے کوئی نماز تو پڑھتا رہا اور روزہ نہ رکھا، تو نماز کا مطالبہ نہ ہوگا مگر روزہ کا مطالبہ ہوگا کہ روزہ کیوں نہ رکھا تھا؟

اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ آپ نے ایک نوکر رکھا جس کے ذمہ آپ نے کھانا پکانے اور کھانا کھلانے کی خدمت رکھی۔ اب اس نوکر نے یہ کہا کہ میں نے کھانا تو پکایا

نہیں مگر گھر کو صاف کر کے آئینہ بنادیا، ہر چیز قرینے سے رکھ دی، جھاڑ و بھی دی، فرش بھی دھویا، جالے بھی صاف کیئے، آپ جب گھر پر پہنچے اور دیکھا کہ ملازم نے گھر کو بہت صاف ستھرا کر رکھا ہے تو یقیناً بہت خوش ہوں گے، مگر جب کھانے کے وقت آپ کو معلوم ہو گا کہ اس نے کھانا نہیں پکایا تو یقیناً آپ اس سے باز پرس کریں گے کہ کھانا کیوں نہیں پکایا؟ تو کیا ملازم جواب دے سکتا ہے کہ صاحب میں نے تو گھر صاف کر دیا اب کھانے کا مطالبہ کیسا؟ ظاہر ہے کہ اس سے یہی کہا جائے گا کہ میاں جو کام تمہارے سپرد کیا تھا وہ تم نے کیا نہیں اور ایک ایسا کام کیا جو فی الجملہ اگر چہ اچھا ہے مگر وہ تمہارے سپرد نہیں تھا، اس لئے تم کو یہ کام کھانے پکانے کے بعد کرنا چاہیئے تھا۔ اسی طرح صدقہ وخیرات اور عبادات نافلہ ہیں اور قربانی واجب ہے، تو صدقہ دینے سے اس کا مطالبہ باقی رہے گا۔

غرض آپ جو صورت اختیار کریں گے اسی کی روح اس میں ڈالی جائے گی جیسے انسان کی صورت میں انسان کی روح اور حیوان کی صورت میں حیوان کی، پھر قربانی کی روح صدقہ میں کیونکر آسکتی ہے؟ اس لئے قیامت میں ہر ایک عمل کی مختلف صورتیں ہوں گی، مثلاً جو شخص مسجد بناتا ہے اس کو جنت میں مکان ملنا ہے، روزہ دار کے لئے قیامت کے دن دستر خوان بچھایا جائے گا۔ اسی طرح قربانی کے متعلق ارشاد ہے کہ:

إنّه ليا تي يوم القيٰمة بقرونها واشعارها واظلا فها۔

یعنی قیامت کے دن قربانی کا جانور اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں کے ساتھ موجود ہوگا۔

اس جگہ ان اجزاء کا ذکر ہے جن کو ہم بیکار سمجھ کر پھینک دیتے ہیں، یعنی اس کے رذی اجزاء پر بھی ثواب واجر دیا جائے گا تو جو اعلیٰ چیز یعنی گوشت ہے اس پر کیوں ثواب نہ ملے گا؟ اس لئے اگر کوئی قربانی ہی نہ کرے تو قیامت میں ثواب کی یہ خاص صورت کیسے حاصل ہوگی؟

اسی طرح ”نظریہ دو قرآن پر ایک نظر“ میں ایک اصولی ضابطہ یوں بیان فرماتے ہیں:

جزئیات کا حسن و قبح کلیات کے تابع ہے

وجہ یہ ہے کہ جزئیات یا فرعیات کسی بھی دائرہ کی ہوں اور کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہوں خود ان کا حسن و قبح بذاتہ کوئی معیاری حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ان کی خوبی وخرابی کا معیار درحقیقت وہ کلیات یا اصول ہوتے ہیں جن کے سلسلہ سے وہ پیش کی جاتی ہیں۔ مثلاً اگر ایک شخص نماز کے شرعی فضائل بیان کرے، مگر خود نماز کو ذکر اللہ اور قربِ الٰہی کے بجائے پہلوانی کے نقطۂ نظر سے دیکھ کر ایک جسمانی ورزش قرار دے تو اگرچہ یہ فضائل خود اپنی جگہ کتنے ہی صحیح ہوں مگر اس خاص نقطۂ نظر کے ماتحت غلط ہو جائیں گے۔ اس لئے بات صحیح ہونے کے باوجود اصولاً کذبِ محض اور خلافِ واقعہ ہو جائے گی۔ یا اگر ایک شخص حج کے شرعی محاسن پر تقریر کرے مگر خود حج کو سیاسی نقطۂ نظر سے محض ایک بین الاقوامی کانفرنس تصور کرتا ہو جو تبادلۂ افکار یا مظاہرۂ اجتماعیت کے لئے منعقد کی گئی ہو، نہ کہ مظاہرۂ عشق ومحبتِ خداوندی کے لئے، تو یہ سارے فضائل اس نقطۂ نظر سے غلط ٹھہر جائیں گے، اگرچہ خود یہ فضائل صحیح اور منصوص بھی ہوں، کیونکہ زاویۂ نظر بدل جانے سے ان کا استعمال بے محل ہو گیا اور وہ کذبِ محض ہو گئے۔

یا اگر ایک شخص قربانی جیسی عبادت کے مناقب تو شرعی بیان کرے مگر خود وہ قربانی کو فدیۂ نفس یا بدلِ جان سمجھنے کے بجائے معاشی نقطۂ نظر سے محض غریبوں کی خبر گیری کا ایک اقتصادی پہلو تصور کرتے ہوئے اس کی غرض وغایت صرف اعانتِ فقراء و مساکین بتلائے اور اس لئے خون بہانے کے بجائے پیسے خرچ کر دینے کو کافی ہی نہیں بلکہ ضروری سمجھے تو فضائلِ قربانی پر اس کا یہ سارا بیان غلط ٹھہر جائے گا، کیونکہ نقطۂ نظر کے بدل جانے سے یہ فضائل قربانی کے فضائل ہی نہ رہے۔

یا اگر ایک شخص علم کی ضرورت وفضیلت پر قرآنی آیات پیش کر کے ایک مدلل اور معقول تقریر کرے مگر عمرانی نقطۂ نظر سے یہ علم اس کی نگاہ میں فلسفہ وسائنس یا ہندسہ

وریاضی ہو تو یہ ساری تقریر اس لئے غلط ہو جائے گی کہ منصوص فضائل کی یہ تقریر اُس نے خود اپنے زاویۂ نگاہ سے کی ہے نہ کہ قرآنی نقطۂ نظر سے۔ گو فضائل کی آیات وروایات اپنی جگہ بالکل حق اور درست ہوں۔

بہر حال نقطۂ نظر کی تبدیلی سے جزوی مسائل کی نوعیت بدل جاتی ہے کیونکہ اُن کی صحت وسقم اور حسن وقبح کا مدار اُس کلیہ اور اصولی نقطۂ نگاہ پر ہوتا ہے، جس کے ماتحت یہ جزئیات سامنے لائی جاتی ہیں۔ یہ علمی اور نظری فرق ایسا ہے جیسا کہ عمل کے دائرہ میں شرعی حسنات خبثِ نیت یا بے محل استعمال سے سیئات بن جاتی ہیں۔ مثلاً غیبت میں سچ ہی بولا جاتا ہے غلط بیانی نہیں کی جاتی مگر پس پشت عیب بیانی چونکہ موجبِ فتنہ وفساد ذات البین اور بے محل ہوتی ہے اس لئے یہ سچ قبیح بن جاتا ہے اور اس سے وہ جھوٹ ہزار درجہ بہتر ثابت ہوتا ہے جو مصالحت ذات البین کے لئے بول دیا جائے۔

پس سچ فی نفسہٖ حسن ہے مگر سلسلۂ استعمال قبیح ہو جانے سے وہ بھی قبیح ہو جاتا ہے۔ پس فضائل ہوں یا احکام اپنے حسن وقبح میں اپنے کلیات ونظریات کے حسن وقبح کے تابع ہوں گے، خود ان کا ذاتی حسن وقبح معتبر نہ ہوگا کہ صرف اُسے ہی اثباتِ مدعا کی کافی دلیل سمجھ لیا جائے۔

ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رہے کہ جزئیات جمع کر کے نقطۂ نظر بنانا یا کلیہ اور اصول قائم کرنا فہم اور ذوق کے تابع ہوتا ہے، اس لئے نظریہ کی خوبی وخرابی درحقیقت ذوق ووجدان کی صحت وسقم کے تابع ہے، اگر مذاق ہی سلیم یا شرعی نہ ہو اور وہ ذہنیت ہی مستقیم نہ ہو جس سے نظریات اُبھرتے ہیں، بلکہ شرعی حیثیت سے زیغ اور کجی لئے ہوئے ہو، تو ظاہر ہے کہ نظریات اور استنباط کردہ اصول بھی اُسی زیغ اور کجی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے نکلیں گے اور اس سے پیدا شدہ یا حکم کردہ تمام جزئیات وفرعیات اسی ایک جامع فیصلہ سے غلط ٹھہر جائیں گی کہ ان کا کلیہ اور نظریہ اور اُن نظریات میں سمایا ہوا ذوق غلط اور ٹیڑھا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس نقطۂ نظر بنانے والی قوت یعنی ذوق اور ذہنیت

کی اصلاح وتقویم پر سب سے زیادہ زور دیا ہے اور اسی اصلاحی عمل کا نام تزکیہ رکھ کر اُسے نبوت کے فرائض چارگانہ میں سے ایک اساسی اور بنیادی فریضہ قرار دیا ہے۔

عام طور پر ہر شخص کے ذہن میں یہ خلش رہتی ہے کہ مذاہب ومسالک ہوں یا تنظیمیں اور تحریکیں، ہر جگہ یہ تعصب دیکھنے کو ملتا ہے کہ اس جماعت کے لوگ اپنے افراد کی تحریرات اور قول وعمل کو محمل حسن پر محمول کرتے ہیں اور دوسری جماعت اور مسلکِ غیر کی کوئی خامی اور کمزوری مل جائے تو اس کی مناسب توجیہ بھی کرنا گوارا نہیں کرتے۔ اس سلسلہ میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے ایک بیش قیمت اصول بیان کیا۔ جس سے نہ صرف یہ اعتراض ہی ختم ہو جاتا ہے بلکہ ایک ضابطہ کی طرف رہنمائی بھی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ''دار العلوم کا ایک فتویٰ'' میں رقم طراز ہیں:

بہرحال یہ اصول کہ ہر شخص پر بولے جانے والے کلمات کے معنی اس شخص کی زندگی کو سامنے رکھ کر لئے جائیں، ایک سائنٹفک اور قدرتی اصول ہے جس سے شریعت اور عرف دونوں نے کام لیا ہے، اور یہ اصول بندہ اور خدا دونوں ہی کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔

حضرت نانوتویؒ کے کلمات کو محمل حسن پر محمول کرنے کی وجہ

اس اصول کے سامنے آجانے کے بعد اگر علمائے دیوبند نے حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کے ان کلمات کو توجیہ وتاویل کر کے بھی محملِ حسن پر اتارنا چاہا جن کو مخالفین نے برے محمل پر محمول کر لیا تھا تو یہ کوئی تعصب یا گروہی جذبہ نہیں، بلکہ اصولِ مذکورہ کی روشنی میں ان کا دینی فرض تھا کہ وہ ایسا کرتے کہ انہوں نے عبارت ہی کو نہیں دیکھا بلکہ عبارت والے کی زندگی کو بھی دیکھا، جس میں ان برے عقائد کے لئے کوئی گنجائش ہی نہ تھی، جن کو مخالفین نے ان کی طرف منسوب کر کے ان کی عبارتوں کو ان محملوں پر حمل کیا تھا۔ اس لئے حضرت کی عبارات کے وہ معنی نہیں لئے جن کو ان کی اعتقادی، اخلاقی اور حالی وقالی زندگی خود دفع کر رہی تھی، اگر خدانخواستہ حضرت

والا کی وہ زندگی نہ ہوتی تو پھر بلا شبہ ہمیں کسی توجیہ وتاویل کی حاجت نہ تھی، پھر بھی اگر تاویل کی جاتی تو وہ تعصب محض ہوتا۔

پس حضرت کے کسی مبہم یا موہم قول کی توجیہ وتاویل درحقیقت تاویل ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی سے ان کے قول کی تفسیر ہے جو فی نفسہٖ معقول اور قدرتی ہے۔

مولانا مودودی کی عبارات وکلمات کو محمل حسن پر نہ اُتارنے کی وجہ

لیکن مولانا مودودی صاحب کی وہ عبارتیں جن سے متبادر مفہوم کے لحاظ سے صحابہ یا ائمہ یا علماء وصلحاء کا استخفاف نکلتا ہے جب سامنے آئیں گی تو وہ بھی اُس اصول پر پرکھی جائیں گی، جن پر ہم سلف وخلف کی عبارتوں کو کستے چلے آ رہے ہیں۔

مودودی لٹریچر میں صحابہ کرام اور اسلافِ امت کی توہین وحرف گیری

مودودی لٹریچر میں صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین، علمائے راسخین اور اولیاءِ متقین کے بارے میں ان کی غلطیاں پکڑنے اور نقد وتبصرہ کی توہین آمیز عبارتیں بلا شبہ موجود ہیں جن کی توجیہ وتاویل کی خود انہیں بھی مدافعت کے طور پر ضرورت محسوس ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً صحابہ کرام کے بارے میں مودودی صاحب نے تحریروں میں کہا ہے کہ:

> ''صحابہ پر بسا اوقات بشری کمزوریوں کا غلبہ ہو جاتا تھا اور وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کر جاتے تھے۔ ایک دوسرے کو جھوٹا کہہ جاتے تھے۔''

اور یہ کذب کی نسبت چونکہ نقد وتبصرہ اور جرح کی مد میں کر رہے ہیں جیسا کہ بشری کمزوریوں کا عنوان اس کا شاہد عدل ہے، اس لئے اس لفظ کو تعدیل پر بھی محمول نہیں کر سکتے، کہ ثلث کذبات والی حدیث کے مطابق یہاں بھی کذب کو کسی توریہ یا تعریض پر محمول کر لیا جائے، اس لئے مودودی صاحب کے زعم کے مطابق یہ وہی کذب ہو سکتا ہے جو آدمی کو مجروح کر دیتا ہے۔ پس بنامِ جرح آپ نے بشری کمزوریوں کے

عنوان سے صحابہ کی طرف کذب کو منسوب کیا اور وہ بھی اس شان سے نہیں کہ بشری کمزوریاں احیاناً یا اتفاقاً ہی ان سے سرزد ہو جاتی تھیں بلکہ ''بسا اوقات'' کے لفظ سے یعنی اکثر و بیشتر ایسا ہوتا تھا، پھر بسا اوقات بھی محض ان کمزوریوں کا صدور ہی نہیں ہو جاتا تھا بلکہ ان کا غلبہ بھی ہوتا تھا، جس سے مغلوب ہو کر گویا وہ ان کمزوریوں سے رک جاتے تھے اور معاذ اللہ وہ عام اتقیاءِ امت جیسے بھی نہ تھے کہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝

(سورہ اعراف: ۲۰۱)

ترجمہ: جو لوگ تقویٰ اختیار کرتے ہیں جب انہیں شیطان کی طرف سے کوئی برائی پہنچتی ہے تو وہ چونک اٹھتے ہیں اور پھر بصیرت سے کام لیتے ہیں۔

ہی کے مصداق بن جاتے۔

ان عبارتوں کے متبادر معنی محض تنقید کے نہیں، بلکہ توہینِ صحابہ کے ہیں جو یقیناً کلام کا ایک برا محل ہے۔ مسلمانوں نے اس پر شور مچایا اور مودودی صاحب کی ان عبارتوں کو گمراہی اور گمراہ کن بتلایا تو مودودی حضرات کو شکایت ہوئی کہ اگر ان عبارتوں کا کوئی محملِ حسن لے لیا جاتا تو تمہارا کیا نقصان ہو جاتا؟ مثلاً یہی تاویل کر لیتے کہ اس عبارت سے کوئی نکتہ چینی یا توہین مقصود نہ تھی صرف بیانِ حال اور تاریخی طور پر ایک حقیقت کا اظہار پیش نظر تھا، جیسے اخباروں میں مراسلات کے عنوان کے نیچے لکھ دیا جاتا ہے کہ:

''ایڈیٹر کا نامہ نگاروں کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں''

یعنی محض خبر کی اشاعت مقصود ہے کسی کی ہمنوائی مقصود نہیں، گو بشری کمزوریوں کے لفظ کے بعد یہ تاویل اس عبارت میں چل نہیں سکتی تھی، لیکن ہم نے اس سے قطع نظر کر کے ان کی اس قسم کی عبارتوں کو اسی اصول پر جانچا کہ ہر شخص کے کلام کا مطلب اس کی مجموعی زندگی اور اعتقادی و اخلاقی حیات کو سامنے رکھ کر لیا جانا چاہئے۔ سو ہم نے دیکھا کہ اس کا بنیادی عقیدہ اور دستوری اصولِ موضوعہ یہ ہے کہ:

''رسولِ خدا کے سوا کسی کو معیارِ حق نہ بناؤ۔''

اس عقیدہ سے تو مودودی حضرات اور تمام صحابہ رسولِ خدا سے اخذ کرنے اور براہِ راست اپنے کو اس معیارِ کامل پر پرکھنے میں مساوی درجہ میں آئے اور انہیں کوئی مجبوری نہ رہی کہ وہ صحابہ کے آگے جھکیں یا ان کی بات بلا چون و چرا مان لیں۔

پھر اسی عقیدہ کا دوسرا اصولی جزو یہ ہے کہ:

''رسولِ خدا کے سوا کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھو۔''

اس اصول سے انہیں صحابہ پر تنقید و تبصرہ اور ان کی خطائیں پکڑنے اور ان کے خطا وصواب پر حکم لگانے کا حق ملا، ظاہر ہے کہ ان دو اصولوں کے بعد صحابہ پر ان کی تنقید محض نامہ نگار کی رائے یا کوئی تاریخی نظریہ کی حد تک نہیں رہتی جس کے حق میں انہیں محض ناقل کہہ کر ان کی ان تنقیدی عبارتوں کی تاویل کر لی جائے، بلکہ حقیقی معنی میں تنقید ثابت ہوتی ہے جو انہوں نے شرما کر نہیں کی بلکہ اپنے اصول کے مطابق ایک جائز حق سمجھ کر کی، اور مساویانہ انداز سے کی، کیونکہ معیارِ کامل کے سامنے مودودی حضرات اور صحابہ برابر کے درجہ کے افراد تھے۔

پھر اسی عقیدے کا تیسرا جزو یہ ہے کہ:

''رسولِ خدا کے سواء کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلاء نہ ہو۔''

اس اصول پر نہ صرف یہ کہ وہ صحابہ کے مساوی ہو گئے تھے اور انہیں تنقید کا حق ہی مل گیا تھا، بلکہ ان سے مستغنی بھی ہو گئے، اور نہ صرف استغناء و یکسوئی بلکہ لفظِ ابتلاء سے یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ یہ ذہنی غلامی ایک ابتلاء اور روگ بھی ہے جس کا کاٹ ڈالنا ضروری ہے۔ اس صورت میں مساویانہ تنقید سے گذر کر انہیں یہ بھی حق مل گیا کہ وہ اس روگ کا مادہ ختم کرنے کے لئے تنقید کا جس قسم کا بھی لب ولہجہ اور اندازِ تنقید اختیار کریں کر سکتے ہیں۔ جب وہ صحابہ کے دبیل (دبے ہوئے، احسان مند) نہیں، ان سے مستغنی بھی ہیں، ان کی برابری بھی ہے اور ان کی غلطیاں بھی پکڑ سکتے ہیں، تو اس صورت میں جو

بھی صحابہ کی غیر معمولی عظمت بیان کر کے ان کی ذہنی غلامی پر زور دے گا، تو روافض کی طرح اس کا ردِ عمل یہی ہوگا کہ ان پر تیز لفظوں میں تنقید و تبرا گوئی سے کام لیا جائے اور اس غیر معمولی عظمت و توقیر کے مقابلہ میں تحقیر و بیزاری کا اظہار کیا جائے تا کہ یہ ذہنی غلامی کا روگ اور ان حضرات سے دلوں کی مرعوبیت کا مادہ ختم ہو۔

اس بناء پر اگر غلامانِ صحابہ نے یہ کہا کہ صحابہ سب کے سب بلا استثناء متقن اور عدول ہیں، لہٰذا ان کی روایت و درایت پر کلی اعتماد کرو تو ادھر سے ردِ عمل یہ ہوا کہ انہیں تو جھوٹ بولنے سے بھی گریز نہ تھا، اور ان پر تو بشری کمزوریوں کا غلبہ بھی ہو جاتا تھا، وہ تو ایک دوسرے پر جذباتی چوٹیں بھی کر جاتے تھے، گویا وہ خود ہی ایک دوسرے کی عظمت نہیں کرتے تھے، تو تم کیوں اس ذہنی غلامی اور مرعوبیت کے روگ میں گرفتار ہو رہے ہو، تم ان کا واسطہ چھوڑ کر براہِ راست معیارِ کامل پر اپنے کو کیوں نہیں پرکھتے۔

مولانا مودودی کے اصول و عقائد ان کے کلام میں تاویلات کے لئے سدِ راہ

بہر حال مودودی حضرات نے اپنے ان اصولِ سہ گانہ کی روشنی میں اگر صحابہؓ پر اسی انداز سے زبان کھولی جس انداز سے وہ اپنے دور کے کسی مولوی پر کھول سکتے تھے، اور کافی کھولی تو وہ اپنے عقیدہ کی رو سے مطمئن ہیں کہ انہوں نے صحابہؓ پر لے دے کر کے ان پر توہین آمیز لہجہ میں تنقید کر کے اور ان پر طنز آمیز انداز سے جھوٹ بولنے کا اتہام لگا کر کوئی برا کام نہیں کیا، کہ اسکی تاویل کی جائے۔

پس ان کی ان عبارتوں کے متبادر معنی اگر توہینِ صحابہ کے ہیں تو ان میں تاویل کی گنجائش یوں نہیں رہتی کہ جب ان کا مطلب مودودی حضرات کی اس اعتقادی اور اخلاقی زندگی ہی کو سامنے رکھ کر لیا گیا تو ان اصول و عقائد نے ان میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی، بلکہ اس توہین و حرف گیری کو اور اصولی شکل دیدی، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مار مر کے کچھ تاویل کر بھی لے تو اسے یہ اعتقادی زندگی خود رد کر دے گی۔ اس لئے ہم نے اگر مودودی صاحب کی ان عبارتوں کی تاویل نہیں کی تو یہ ہمارا قصور نہیں، انہوں

نے اپنے اصول کی رو سے خود نہیں چاہا کہ ان عبارتوں میں تاویل کی جائے۔ اگر وہ یہ چاہتے کہ ان عبارتوں کا محمل توہینِ صحابہ نہ لیا جائے بلکہ انہیں مدحِ صحابہ پر محمول کیا جائے تو وہ اپنے اس بنیادی عقیدہ میں پہلے خود ترمیم کرتے، اور اس بنیادی دفعہ کا محملِ حسن ظاہر کر دیتے، تو ان جزوی عبارتوں کا محملِ حسن خود ہی پیدا ہو جاتا۔ پس جو چیز آپ اپنے بارے میں خود نہیں چاہتے اس کا مطالبہ دوسروں سے کیوں کرتے ہیں؟ وہ دوسرے غریب آخر کریں کیا جب کہ انہیں کسی تاویل کا راستہ ہی نہ دیا جائے، ورنہ یہ تو ''مدعی سست گواہ چست'' کی سی مثال ہو جائے گی۔

مندرجہ ذیل تحریر میں حضرت حکیم الاسلام نے نہ صرف اس پر قلق کا اظہار کیا ہے کہ اہل علم و فضل اور اہل اللہ کے کلام پر بلا سوچے سمجھے رائے زنی کرنا اور اپنی ناپختہ عقل کو بنیاد بنا کر ان پر حرف گیری بہت خطرناک اور بے جا جسارت ہے، جس سے ہدایت و توفیق سلب ہو جاتی اور اللہ والوں کی محبت دل سے نکل جاتی ہے، بلکہ ساتھ ہی ساتھ اس پر اپنی دلی تڑپ کا اظہار کیا کہ علمی اختلافات کو اہل علم کو اپنی باہمی گفت و شنید سے حل کرنا چاہئے، عوامی سطح پر اس اختلاف کو نہ لانا چاہئے اور آپس میں نقطہ ہائے متحد کو تلاش کر کے باہمی وحدت و اتفاق کی راہیں ہموار کرنی چاہئیں۔ حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

کس قدر جسارت کی بات ہے کہ کسی کے بھی کلام کو اور خصوصاً اہل علم و فضل اور اہل اللہ کے کلام کو لفظاً یا معناً بگاڑ کر عوام کو ان کے خلاف نفرت دلائی جائے اور بدظن بنا کر مشتعل کیا جائے۔ اُنہیں یہ حدیث پیش نظر رکھنی چاہئے کہ:

مَنْ عَادیٰ لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ۔

ترجمہ: جو شخص میرے کسی ولی سے عداوت کرتا ہے میری طرف سے اس کو اعلانِ جنگ ہے۔

حق تعالیٰ ہدایت دے اور صراطِ مستقیم پر چلائے آمین۔

موجب حیرت یہ ہے کہ ان علماءِ حق نے اپنی عبارتوں سے اپنی مراد بار بار واضح کر دی اور کسی نجی گفتگو یا شخصی مراسلت اور خط و کتابت سے نہیں بلکہ مطبوعہ کتابوں اور

رسالوں سے اور بصورت اعلان واشتہارات سے منظر عام پر بھی لاتے رہے، ساتھ ہی یہ بھی کھول دیا کہ جو غلط مطلب ان کی عبارتوں سے لیا جارہا ہے وہ کبھی ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آیا، نہ وہ ان کا عقیدہ ہے نہ ان کے بڑوں کا ہے، بلکہ بعض اکابرؒ نے عنوان بھی تبدیل کردیا کہ ایہامِ توہین یا تحریفِ مضمون کا شائبہ بھی باقی نہ رہے پھر بھی ان کی عبارتوں کو توڑ موڑ کر ان میں اپنا مطلب ڈالنا اور ڈالتے رہنا اور اس پر مبنی کرکے بار بار تکفیروں کی تجدید کرتے رہنا آخر کس طرح سنجیدہ قلوب میں جگہ پائے ہوئے ہے، دیانت کا تقاضا تو یہ تھا کہ مراد واضح ہو جانے پر کھلا اعلان کیا جاتا کہ جہاں تک ان عبارتوں کا تعلق ہے مراد اور منشاء واضح ہو جانے کے بعد ہمیں مراد پر کوئی اعتراض باقی نہیں رہا، اس لئے ہم تکفیر سے رجوع کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ عنوان کے بارہ میں یہ کہا جاسکتا تھا کہ اس مراد کیلئے یہ عنوان ہمارے نزدیک غلط اختیار کیا گیا ہے۔

سو جن حضرات نے عنوان بھی بدل دیا ان کے بارہ میں تو صاف دلی سے کہا جاتا کہ ان کے بارہ میں کوئی خلجان نہیں رہا، اس لئے اس مسئلہ کی حد تک اختلاف ختم ہو گیا۔

حیرت پر حیرت یہ ہے کہ ان بزرگوں نے اپنی جو مراد واضح فرمائی وہ بریلوی حضرات ہی کے عقیدہ کے مطابق تھی، اس اتفاقِ مقصد کو تو کم سے کم سراہا جاتا اور کسی خلش کی بناء پر اس اظہارِ اطمینان کی گنجائش نہ تھی تو کم سے کم سکوت ہی اختیار کیا جاتا اور سوچا جاتا کہ جو بات ان حضرات نے ایضاحِ مراد کرتے ہوئے کہی ہے، وہی جب کہ ہمارا بھی عقیدہ ہے تو ہم کم سے کم خود اپنے عقیدہ کے خلاف زبان کیسے کھولیں؟ یا پھر اس اعلان کا ہلکے سے ہلکا درجہ اور وسعتِ صدر کا ایک اچھا مقام یہ تھا کہ ہمارا اور مسائل میں حضراتِ دیوبند سے اختلاف قائم ہے مگر ان عبارتوں کی مراد کے بارے میں اب کوئی اشکال نہیں رہا جبکہ ان کی مراد وہی واضح ہوئی جو خود ہمارا بھی عقیدہ ہے، یا اس عقیدہ سے قریب تر ہے کہ یہ خود انھیں کے مسلک کی تائید ہوتی، لیکن نہ تو بیانِ مراد کو وقعت دی گئی، جبکہ متکلم کے کسی بھی کلام کا مطلب عقلاً ونقلاً وہی لیا جاتا ہے جس کی متکلم خود صراحت کرے،

نہ توافقِ مسلک ہی کی کوئی قدر کی گئی جس میں خود ان کی بھی تقویت تھی اور نہ ہی اس وحدتِ مقصد سے وحدتِ ملت ہی کو کوئی اہمیت دی گئی جبکہ اسلافِ ملت اور اتحادِ ذات البین کے بارہ میں بکثرت شرعی تاکیدیں وارد شدہ ہیں، اور افتراق وتفرقہ کو حالقہ فرما کر اس سے ڈرایا گیا ہے۔

اسلئے اس کے سوا کوئی اور کیا سمجھے گا کہ ان حضرات کے یہاں اختلاف برائے اختلاف اور اس کی تجدید وتاسیس ہی پیش نظر ہے اور جان بوجھ کر ایک جماعت سے لوگوں کو بدظن بنا کر اسے بدنام اور رسوا کرنا یا آزار پہنچانا ہی مطمح نظر ہے۔

اس سے اگر قلوب دکھ اور درد محسوس کریں تو کر سکتے ہیں، لیکن ہم لوگ اگر یہ دکھ درد محسوس کریں تو اپنی کسی بدنامی یا رسوائی کے خیال سے نہیں، ہم چیز ہی کیا ہیں کہ اپنی کسی رسوائی یا بدنامی کا غم لے کر بیٹھیں اور خواہ مخواہ مدعی بنیں، مگر یہ خدا ساز واقعہ ہے کہ ان کی کوئی بدنامی اور رسوائی واقع بھی نہیں ہوئی اور نہ ہی انہیں کوئی آزار پہنچا، کیونکہ اس پون صدی کے عرصہ میں جب سے یہ تکفیر وتوہین کا بازار گرم ہوا، دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ یہ حضرات اربابِ عبارات "لا يضرهم من خالفهم ولا من خاذلهم" کے صحیح مصداق ثابت ہوتے رہے، اور ہوا یہ کہ انھیں کا تعلیمی سلسلہ عالمگیر ہوا اور مشرق ومغرب کے لوگوں نے ان سے کتاب وسنت کی سندیں لینے میں اپنی عزت محسوس کی۔ انھوں نے ہی تبلیغی نظام قائم کئے اور یورپ وایشیاء اور افریقہ وامریکہ تک ان کی تبلیغی صدائیں پہنچیں، جن سے ہزار ہا ہزار افراد دیندار اور تہجد گزار بنے۔ انہی سے طریقت اور بیعت وارشاد کے سلسلے ہند وبیرون ہند میں ہمہ گیر طریق پر پھیلے جن سے ہزاروں کے نفوس کی اصلاح ہوئی اور لوگ چشتیت، قادریت، سہروردیت اور نقشبندیت سے آشنا ہوئے، نہ انہوں نے کسی کو کافر بنا کر اپنا مقام پیدا کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی کسی کی تخریب پر اپنی تعمیر کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اس لئے بدنامی کا حرف ان کے حق میں اپنا کوئی معنی بھی پیدا نہ کر سکا، بلکہ ہر طرف حق تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل وکرم سے نیک نام رکھا اور اس نیک نامی

کو مختلف دینی راستوں سے عالمگیر بنادیا۔

اس لئے ان تکفیروں اور زبردستی کے اتہامات سے نہ وہ اس لئے دلگیر ہیں کہ وہ رسوا ہو گئے، نہ اس لئے کہ انھیں کوئی آزار پہنچا، بلکہ یہ رنج وقلق مسلمانوں کے تفرقہ اور شیرازہ بکھر جانے اور بہت سے مسلم عوام اور سادہ لوح افراد کے صحیح علم اور سلفِ صالحین کے مسلک سے محروم کردیئے جانے پر ہے، جو درحقیقت پوری قوم کا ضرر ہے۔ نیز اس بناء پر ہے کہ ہر جماعت میں کچھ نہ کچھ خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور کم وبیش مخلصین بھی ہوتے ہیں، لیکن افتراق کی نحوست سے ہر ایک کی خوبی سے دوسرا محروم ہے، ساتھ ہی اس بناء پر بھی ہے کہ بریلوی ہوں یا دیوبندی، تمام بنیادی باتوں، اقرارِ توحید، عظمتِ نبوت، عظمت صحابہؓ، حنفیت، طریقت، سلاسلِ طریقت، اولیاء اللہ سے انسلاک، سلسلۂ بیعت وارشاد، عقیدت ومحبت اہل اللہ وغیرہ میں اشتراک کے باوجود اس قسم کے مزعومہ بلکہ بہ تکلف آوردہ جزئیات کے ذریعہ افتراق بلکہ عناد آمیز فرقت اور بکرات ومرات اس کا احیاء وتجدید جہاں پوری قوم کا ضعف اور آزار ہے وہیں وہ اعداء اللہ اور اعداءِ دین کے لئے سبب تضحیک واستہزاء بھی بنا ہوا ہے، جس سے پوری قوم کے وقار اور عزت پر اثر پڑ رہا ہے۔

آج عوامی مناظروں کے چیلنج تو دیئے جاتے ہیں اور دوسرے لفظوں میں عوام کو خواص پر مسلط تو کیا جارہا ہے جس سے عوامی سطح پر فتنہ ابھرتا اور نکھرتا جارہا ہے، اور نتیجہ میں عوام دین سے بیزار ہی ہوتے چلے جارہے ہیں، جنہیں اہل دین کے خلاف اشتعال دلا کر اکسا دیا جاتا ہے، لیکن یہ نہیں ہوتا جو ہونا چاہئے تھا کہ قوم کی مجموعی عزت وآبرو کی خاطر چند سنجیدہ علماء ان لوگوں کو بلائیں جن پر انہیں اعتراضات ہیں اور خود انہیں سے پوچھیں کہ وہ کس حد تک ان سے الگ ہیں، اور کس حد تک شریکِ عقیدہ وعمل ہیں۔ مشترک حصے کو "اساس" قرار دے کر بقیہ کے لئے اگر اس میں کسی حجت کے سبب توافق نہ ہو سکے، حدود متعین کی جائیں جس سے کم سے کم منافرتِ باہمی اور تعصبات کی آگ تو دھیمی پڑ جائے اور عوامی سطح کی اشتعال انگیزیاں کسی حد تک اعتدال پر آجائیں اور ایک

دوسرے سے قریب ہو کر کسی با حجت گفت و شنید کا راستہ پڑ جائے۔

تجربہ ہے کہ بہت سی بدظنیاں اور غلط فہمیاں جو بُعد سے پیدا ہوتی ہیں قرب سے خود بخود ختم ہو جاتی ہیں، اور وہ منافرت جاتی رہتی ہے جو افہام و تفہیم اور خیر جوئی سے ہمیشہ مانع رہی ہے۔ پھر بھی اگر اختلاف باقی رہتا ہے تو وہ حجت کا ہوتا ہے جو مضر نہیں۔

جو میں نے پہلے عرض کیا کہ حضرت حکیم الاسلام لوہے کو گرم دیکھ کر اس پر مناسب موقع چوٹ کرنے میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اپنی کتاب "شہید کربلا اور یزید" میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے موقفِ حق کی وضاحت اور یزید کے ناحق پر ہونے کی تفصیلی روشنی ڈالنے کے بعد شیعہ حضرات کو بھی درسِ ہدایت دینے سے نہیں چوکے۔ فرماتے ہیں:

آخری گزارش۔ شیعہ حضرات سے

آخر میں ایک آخری گزارش یہ ہے کہ عباسی صاحب کی اس کتاب سے یقیناً حضراتِ شیعہ کو دُکھ پہنچا ہے اور قدرتاً پہنچنا چاہیے تھا، لیکن اس میں ان کے لئے جہاں دُکھ کا سامان موجود ہے، وہیں عبرت کا سامان بھی مہیا ہے، اور وہ یہ کہ جب کسی کے معتقد فیہ کو بدعنوانی کے ساتھ بُرا بھلا کہا جائے تو معتقدین کے دلوں پر کیا کچھ گذرتی ہے۔ شیعہ حضرات اس سے عبرت پکڑیں کہ عباسی صاحب نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شان میں جو کچھ بھی کلمات کہے وہ یقیناً اس سے بہت کم اور ہلکے ہیں، جو حضراتِ شیعہ حضراتِ صحابہ کرام خصوصاً شیخین کے بارے میں استعمال کرتے ہیں، لیکن اس پر یہ شیعہ حضرات بلبلا اُٹھے، تو وہ اس سے اندازہ کرلیں کہ جب وہ حضراتِ شیخین اور دوسرے حضرات صحابہ کرامؓ کی نسبت بدگوئیاں اور بدتہذیبی کے ساتھ سبّ و شتم کرتے ہیں تو سُنّیوں کے دلوں پر کیا گذرتی ہوگی۔ اگر ان کے نزدیک عباسی صاحب کا یہ اقدام جو انھوں نے حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں کیا، خلافِ تہذیب اور دلآزار ہے، تو انھیں سوچ لینا چاہیئے کہ وہ خود جو تہذیب سے انتہائی گرا ہوا اور سبّ و شتم پر مشتمل دل آزار رویّہ سُنّیوں کے مقتداؤں کے بارے میں رکھتے اور اُسے مذہب بھی سمجھتے ہیں،

سنیوں کے لئے کس درجہ دلآزار اور دُکھ دینے والا ہے۔ اگر عباسی صاحب کا رویہ قابلِ ملامت وانسداد ہے، تو شیعہ حضرات کی یہ سبّ وشتم کی روِش کیوں قابل انسداد نہیں؟

پس آج حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو اُن پر گذری، وہ اسی کو سامنے رکھ کر شیخین اور صحابہؓ کے بارے میں جو سُنّیوں پر گذرتی ہے، اپنی روِش پر نظرِ ثانی فرمائیں۔

اہل سنت والجماعت کا مسلک ہی چوں کہ مسلکِ اعتدال ہے اور وہ کسی ایک بھی صحابی نام کے کسی فرد کے بارے میں ادنٰی بے ادبی جائز نہیں سمجھتے اس لئے خوارج ہوں یا شیعہ، وہ دونوں کی سنتے ہیں اور دل مسوس کر رہ جاتے ہیں، اُف نہیں کرتے، کیوں کہ ان کے یہاں مذہب ہے ردِّ عمل نہیں، وہ اپنے دل کا غم بدکلامی سے ہلکا نہیں کر سکتے، کیوں کہ شیعوں کے مقتدا ہوں یا خارجیوں کے وہ خود ان کے مقتدا ہیں، اگر اپنے مقتداؤں کی توہین کا انتقام ان کے مقتداؤں کی توہین سے لیا جائے تو آخر وہ کس کے مقتدا ہیں؟ اس لئے ایک سنّی گالی کا جواب گالی سے دے ہی نہیں سکتا اور اس کے لئے بجز صبر کے کوئی چارۂ کار نہیں۔ وہ بجز اس کے کہ خوارج وشیعہ اور ان کے ہم مزاج حضرات کے مقابلہ میں ہر بدکلامی سے بچتے ہوئے شائستگی کے ساتھ حقیقت پیش کرتا رہے اور کر ہی کیا سکتا ہے؟ اس کے یہاں تو یزید بھی اگر مستحقِ لعنت وملامت ہو تو وہ پھر بھی اپنے مسلک کا رشتۂ اعتدال ہاتھ سے نہ دیتے ہوئے عملاً لعن طعن سے بچتا ہی رہے گا، چہ جائے کہ شیعہ یا خوارج کے مقابلہ میں ان حدود سے باہر ہو جائے، کیوں کہ اس کے یہاں نہ مدح میں اطراء (مبالغہ) کوئی پسندیدہ چیز ہے، نہ مذمت میں غلو اور مبالغہ مناسب۔

اسی طرح جو لوگ ہر ہر چیز میں حکمِ فرض وواجب سے کم کو مستحکم دلیل ہی تسلیم نہیں کرتے، وہ انہیں یاد دلاتے ہیں کہ وہ جس سے محبت کا دم بھرتے ہیں اس کے ساتھ صرف ضابطہ اور خانہ پری کا تعلق رکھنا ہی دلیل محبت نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر رابطہ اور تعلق پر آنا چاہئے۔ کچھ ذائقہ مقاماتِ عشق کا بھی چکھنا ضروری ہے۔ فرماتے ہیں:

عشقِ محمدی کا تقاضا ڈاڑھی رکھنا ہے، منڈانا نہیں

آخر میں یہ عرض کیے بغیر نہیں رہا جاتا کہ واجب وفرض اور سنت کی بحث اپنی جگہ صحیح لیکن یہ سب چیزیں استدلالی ہیں، گرویدگانِ بارگاہِ نبوت کے لئے حجتوں کی یہ کاوشیں درکار نہیں، ان کے لئے تو صرف اتنی حجت کافی ہے کہ فلاں فعل محبوبِ دوعالمؐ نے انجام دیا ہے اور فلاں فعل سے اجتناب فرمایا ہے۔ اس فعل واجتناب کی استدلالی نوعیت کچھ بھی ہو اور صفتِ حکم وجوب ہو یا سنت ومستحب، عاشق کا مذہب تو یہ ہے کہ جو آپ سے ثابت ہے وہ اطاعت ہے اور جس سے آپ کا احتراز ثابت ہے وہ معصیت ہے۔ استدلالیوں کے لئے یقیناً معصیت یہی ہے کہ اس سے صراحتہً روکا گیا ہو لیکن عشاق کے نزدیک معصیت یہ ہے کہ اس سے ان کے عشق پرور دل میں کھٹک پیدا ہوتی ہو، عاقل کے نزدیک طاعت ومعصیت افعال ہیں، لیکن عاشق کے نزدیک جذبات واخلاق ہیں، وہاں گنہگاروں سے کہا گیا ہے کہ جو بُرا فعل کرے وہ گنہگار ہے:

يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ۔

یعنی جو جہالت سے بُری حرکت کرے وہ گنہگار ہے۔

مگر عشاق سے کہا گیا ہے کہ:

اَلْاِ ثْمُ مَا حَاكَ فِيْ صَدْرِكَ۔

جو تمہارے سینہ میں کھٹک پیدا کرے وہی گناہ ہے۔

پس وہاں تو حرکات وسکنات پر نیکی وبدی کا حکم لگتا ہے اور یہاں خیالات پر، وہاں عملی دنیا پر حکم لگے گا اور یہاں فکری وجذباتی دنیا پر، پس استدلالیوں کے یہاں فتویٰ مفتی سے لیا جائے گا، لیکن عشاق کے یہاں فتویٰ خود اپنے ضمیر سے طلب کیا جائے گا۔

اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ وَاِنْ اَفْتَاكَ الْمُفْتُوْنَ۔

اپنے دل سے فتویٰ پوچھو مفتی کچھ بھی فتویٰ دے۔

عقلاء تو قضاء ہی گنہگار ہوں گے اور یہ عشاق دیانتاً بھی عاصی ٹھہریں گے، اُن کے یہاں شرعی گنجائشیں یعنی رخصتیں مذہب ہوں گی۔ پس اس اصول پر جب کہ ڈاڑھی شعارِ محبوب ثابت ہوئی اور مقدارِ قبضہ بھی اسی کے ساتھ لگی ہوئی ثابت ہوگئی تو اس کے ثبوت کا استدلالی مرتبہ کچھ بھی ہو اور اس کی صفتِ حکم واجب و فرض یا سنت و مستحب کوئی بھی ہو، عاشق کے اتباع و پیروی کے لئے مطلقاً فعل فعلِ محبوب ثابت ہو جانا ہی سب سے بڑی دلیل ہے، اگرچہ مفتی اُسے سنت بھی کہے تب بھی عاشق اُسے فرض ہی کہے گا۔ عملی زندگی کا نقشہ سنت و مستحب تک کو عملی فرض بنا لینے سے بنتا ہے، ان کے مراتب کا فرق نکالنے سے نہیں بنتا علاوہ ازیں سنت و مستحب اور واجب و فرض کی اصطلاحیں عمل کرانے کے لئے نہیں ہیں، بلکہ حکم کا مرتبہ بتانے کے لئے ہیں، جن کا اثر حکم سے انکار یا پہلوتہی کے موقعہ پر ظاہر ہوتا ہے، نہ کہ عمل پر آمادگی کے موقعہ پر۔ پس عملی طور پر جب تک مستحبات کو عملی فرض اور عملی واجب نہ سمجھ لیا جائے عملی زندگی کا نقشہ ہی نہیں بن سکتا، بنابریں عمل کیلئے عاقل ہونا ضروری نہیں مگر عاشق ہونا ازبس ضروری ہے، لیکن دعوائے عشق کے بعد عمل کے میدان میں افعالِ نبویؐ اور احکامِ رسالت کے مراتبِ فعلیت دریافت کرنا اس دعویٰ کی تکذیب اور قلتِ حجت کی دلیل ہوگی، جو عشاق کے مذہب میں خود ایک معصیت ہے۔

عشاق کے حق میں ڈاڑھی بڑھانے کیلئے ضمیر کی آواز بھی کافی ہے

غرض محبت کے دائرہ میں ترکِ معصیت ضمیر کی آواز سے ہوتا ہے، قانون سے نہیں ہوتا۔ کسی چور کو نہیں دیکھا گیا کہ اس نے تعزیراتِ ہند کی دفعات ٹٹول ٹٹول کر اور وکلاء سے ممنوعاتِ قانون کے مراتبِ ممنوعیت پوچھ پوچھ کر چوری سے توبہ کی ہو، بلکہ جب بھی کی ہے ضمیر کی آواز پر ہی کی ہے، بنابریں اس ناکارہ کے خیالِ ناقص میں محبانِ بارگاہِ نبوت اور عشاقِ باطن بالخصوص سلسلۂ بیعت و ارشاد کے افراد کو جن کی زندگی سرتاپا عمل و پیروی ہوتی ہے، ان قانونی موشگافیوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ ڈاڑھی اور

اس کی مقدار کیلئے محض ثبوت کافی ہے، وجوب کی ضرورت نہیں اور جذباتِ عشق کے بعد ضمیر کی آواز کافی ہے۔ مفتی کے فتویٰ اور واجب وسنت کی تنقیح کی حاجت نہیں، لیکن جب وجوب بھی موجود ہو اور مفتی کا فتویٰ بھی تب تو ان عشاق کیلئے ریش تراشی ڈبل معصیت ثابت ہوگی۔

معترض کے ذہن کو پڑھ لینے اور اس کی اندرونی کیفیت تک پر چوٹ کرنے نیز اس کی بنیادی غلطی پر متنبہ کرنے میں بھی حضرت کو مہارت حاصل ہے۔ ایسی ہی ایک نامعقول اور مبغوض تحریر پر رد کرتے ہوئے صاحبِ تحریر کی اس طرح خبر لیتے ہیں:

تاریخی ریسرچ کے معنی درحقیقت مختلف تاریخی روایات کو اپنے محل پر چسپاں کر کے واقعہ کی اصل قدرِ مشترک کا سراغ لگانا اور مؤرخ کے اصل رخ کو نظر انداز کیے بغیر اصل واقعہ کو نمایاں کرنا ہے، نہ کہ اس سے ہٹ کر تاریخی ٹکڑوں کا اپنے ذہنی نظریات سے جوڑ لگانا۔

پس جس طرح شرعی ریسرچ کے معنی اس کے سوا دوسرے نہیں کہ کتاب وسنت کی مراد کے دائرہ میں رہ کر اس کے مخفی گوشوں کو کھولا جائے اور مختلف نصوص اور آیات و روایات کو اسی مراد کے مختلف پہلوؤں سے وابستہ کر کے ان پر چسپاں کر دیا جائے، اسی طرح تاریخی ریسرچ کے معنی بھی یہی ہوسکتے ہیں کہ معتمد اور مستند مورخین کے کلام کو ان کے دائرۂ مراد میں رہ کر کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں، اس کے مختلف پہلوؤں کے حسب حال تاریخی ٹکڑے ان کے ساتھ جوڑے جاتے رہیں، جس سے مؤرخ کی مراد زیادہ سے زیادہ داشگاف ہو کر اصل واقعہ تفصیل سے سامنے آجائے جسے مؤرخ بتلانا چاہتا ہے، اگر مورخ کے خلافِ مراد اس کے کلام کے ٹکڑوں کو اپنی مرادات ونظریات پر چسپاں کرنے کی سعی کی جائے تو وہ تاریخی ریسرچ کے بجائے اپنی نظریاتی ریسرچ ہو جائے گی۔ اور اس سے اپنا مطلب تو ضرور نکل آئے گا لیکن تاریخی واقعہ پردۂ خفا میں رہ جائے گا۔ جسے تاریخی ریسرچ نہیں کہا جاسکتا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ تاریخ کا ایک ٹکڑا اگر کسی نظریہ کی پشت پر آ بھی جائے اور بقیہ تاریخی حصے اسے ادا کر دیتے ہوں تو یہ تاریخ نہیں منصوبہ بندی ہے، یورپ کے محققین

تاریخ کا یہ خاص فن ہے کہ وہ ملکوں اور مذہبوں کی تاریخ اپنے مقاصد اور نظریات کو سامنے رکھ کر ترتیب دیتے ہیں، تاکہ قوموں کے مزاجوں کو پرکھ کر انھیں اپنے مقاصد میں استعمال کر سکیں، اسلئے وہ قیاسات کو بھی روایات کی صورت سے پیش کر دیتے ہیں اور ایک خاص نقطۂ نظر کے اردگرد تاریخی ٹکڑوں کو گھماتے چلے جاتے ہیں، اس سے ان کا کام تو نکل جاتا ہے، مگر فن یا وہ خود لوگوں کی نگاہ میں مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ بہرحال یہ نوعیت واقعات کی تاریخ کی نہیں ہوتی بلکہ اپنے ذہنی مقاصد کی تاریخ کی ہوتی ہے۔

اس زیر نظر تاریخی ریسرچ میں بھی چوں کہ بنیادی نقطۂ نظر یزید کو خلیفۂ ارشد اور تقی ونقی ثابت کر کے اس کے مقابلہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو باغی اور خروج کنندہ دکھلانا تھا، اس لئے تاریخ کے متعدد ٹکڑے اپنے سیاق وسباق سے کاٹ کر اس مخصوص نقطۂ نظر کی تائید کے لئے استعمال کر لئے گئے ہیں اور اپنے مزعوم کے خلاف تاریخ کی واضح اور کھلی تصریحات تک سے اعراض کیا گیا ہے، اس لئے ہم تاریخی طور پر بھی اس ریسرچ کو غیر مشتبہ اور صاف تاریخ کا مقام دینے کے لئے تیار نہیں۔

لیکن محض اتنی بات بحث وتنقید کی مقتضی نہ تھی۔ دنیا میں ہزاروں تاریخیں غلط اور مشتبہ لکھی گئی ہیں اور بہت سے اربابِ اغراض نے تاریخ کے راستہ سے اپنے کام نکالے ہیں، لیکن نہ ہم ان سب کے ذمہ دار ہیں اور نہ ہم پر دنیا کے ہر ہر تاریخی نظریہ اور اس کی حجتوں کی تنقیح وتحقیق یا تائید وتردید ضروری ہے، لیکن اس ریسرچ کا اثر چوں کہ عقائد ملت پر پڑتا ہے اور اس سے مذہب کے کتنے ہی اہم اجزاء مشتبہ ٹھہرتے ہیں اس لئے ضرورت محسوس کی گئی کہ تاریخی پہلو سے زیادہ اسے مذہبی اور دینی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے، اور مذہب وعقیدہ واضح کر کے اسی کے معیار سے اس تاریخ کو رد یا قبول کیا جائے۔ کیوں کہ ہم یہ کہہ کر سبکدوش نہیں ہو سکتے کہ یہ ایک تاریخی ریسرچ ہے، اس میں عقائد ومذہب کو لے کر بیٹھنا خلطِ مبحث ہے، جب کہ یہ تاریخ ہی درحقیقت ایک عقیدہ کی تاریخ ہے اور اس کا ذکر قدرتاً عقیدہ ہی کا ذکر ہے، اس لئے کسی عقیدہ کی تاریخ کا ذکر

کرتے وقت عقیدہ کے ذکر کو روکا جانا خود اس تاریخ کو ناقابل ذکر ٹھہرانا ہے، کیوں کہ ہر واقعہ طلب عقیدہ اپنے واقعہ سے لازمی طور پر وابستہ اور وہ واقعہ اس کے ساتھ لازم ملزوم ہوتا ہے، جو کسی حالت میں بھی اس سے جدا نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے عقیدہ سے متعلقہ تاریخ عقیدہ کے عین مطابق ہونی چاہیے، اگر تاریخ عقیدہ کے موافق ہے، تو وہ اس کی تاریخ اور اس کی تائید ہے، اور تائید سے روکا جانا کوئی عقلی اصول نہیں اور اگر تاریخ عقیدہ کے خلاف ہے، تو وہ عقیدہ کی تاریخ نہیں بلکہ اس کی تردید ہے، تو اس صورت میں عقیدہ کی صفائی پیش کر کے اس کی مخالف تاریخ کو رد کیا جانا کوئی بے موقعہ کام نہیں۔

بہر دو صورت کسی عقیدہ کی تاریخ کا ذکر آنے پر اس عقیدہ کا کسی بھی نوعیت سے ذکر آنا ناگزیر ہے، اس لئے اس تاریخی ریسرچ کے سلسلہ میں ان دونوں شخصیتوں سے متعلق معتقدات کا تذکرہ خلطِ مبحث نہیں بلکہ ایک ناگزیر تذکرہ ہوگا، جس کی رو سے اس تاریخ پر تنقید کی جائے گی اور عقیدہ و تاریخ میں تقابل کے وقت عقیدہ کو اصل رکھا جائے گا اور تاریخ اس کے تابع ہوگی۔

خلاصہ یہ ہے کہ دینی معاملات کے سلسلہ میں عقیدہ سے تاریخ اخذ کی جائے گی، تاریخ سے عقیدہ نہیں بنایا جائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ عقیدہ خدا اور رسول کی خبر سے بنتا ہے اور اس سے متعلقہ واقعہ کی بنیادیں بھی خدا اور رسول ہی کے کلام میں یا مندرج ہوتی ہیں یا اس کا مقتضا ہوتی ہیں اور دونوں صورتوں میں وہ منصوص ہی کے حکم میں ہوتی ہیں، جب کہ عقیدہ کے مطابق ہوں، اس لئے عقیدہ کو تاریخ کے تابع بنا دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ معاذاللہ خدا و رسول لوگوں کے تابع ہو جائیں، جو غلط بھی ہے اور شوخ چشمی بھی ہے۔ پس عقیدہ تاریخ کے تابع نہیں، بلکہ تاریخ کو عقیدہ کی پابندی کرنی پڑے گی، ورنہ تاریخ کے معیار سے اگر عقائد کا رد و قبول کیا جانے لگے تو وہ عقائد کیا ہوئے فلسفیانہ نظریات بن جائیں گے، جن میں زمانہ کی بدلتی ہوئی تاریخ سے روزانہ رد و بدل ہوا کرے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح مذہب و مسلک اختیاری چیز بن جائے گی، جن کا نہ اتباع ضروری ہوگا،

نہ اتباع میں کسی فلاح و بہبود اور نجات کا یقین ضروری رہے گا۔
اس لئے عقیدہ کے خلاف تاریخ تاریخ نہ ہوگی تخیل ہوگی اور عقیدہ کے تحفظ کے ساتھ اس کا رد کر دیا جانا یا مؤوّل کیا جانا ہی شرعی تقاضا ہوگا۔
مضمون طویل ہوتا جارہا ہے۔ آخر میں دو ایک نمونہ جاتی تحریریں ایسی پیش کرنے کو جی چاہتا ہے جن سے یہ واضح ہو جائے کہ گنجلک سے گنجلک اور دقیق سے دقیق مضمون کو آسان اور قریب الفہم انداز اور دل نشیں پیرایہ میں نذرِ قارئین کر دینے کے فن میں بھی حضرت حکیم الاسلامؒ مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ میں یہاں علم غیب اور تقدیر جیسے اہم اور نازک موضوع پر لکھی گئی حضرت کی گرانقدر تالیفات "علم غیب" اور "مسئلہ تقدیر" سے چند اقتباسات نقل کر کے اپنی بات کو ختم کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:

علم غیب کی تعریف

اس سے جہاں یہ ثابت ہوا کہ علم غیب صرف حق تعالیٰ کی چیز ہے، وہیں علم غیب کی جامع تعریف بھی نکل آئی کہ:
"علم غیب وہ ہے جو بلا واسطۂ اسباب ہو، جب بھی وہ بالواسطہ آئے گا تو وہ حقیقی معنی میں علم غیب نہ ہوگا بلکہ علم غیب کی ہو بہو حکایت اور من وعن نقل ہوگی اور سب جانتے ہیں کہ علم کے عادی وسائل میں سے وحیٔ الٰہی بھی ایک وسیلہ ہے بلکہ اولین وسیلہ ہے، جس کے توسط سے عالم بشریت کے علم کی ابتداء ہوتی ہے، کشف ہو یا الہام، فراست ہو یا وجدان، سب بعد کے وسائل اور وحی کے دستِ نگر توابع میں سے ہیں، خود اصل نہیں، اس لئے عادتاً حصولِ علم کا سب سے پہلا، سب سے زیادہ قطعی اور یقینی وسیلہ یہی وحیٔ الٰہی ہے۔ جسکے ذریعہ سے انسان علم سے آشنا ہو کر عالم کہلاتا ہے۔
پس جیسے سمع و بصر، عقل و خرد، حدس و تجربہ، کشف و الہام، علم کے کھلے اور چھپے ذرائع ہیں جن کے راستہ سے عالم الغیب والشہادۃ اس ظلوم وجہول انسان کو علم سے سرفراز فرماتا ہے، ایسے ہی وحی بھی ایک رفیع المنزلت اور لطیف ترین وسیلۂ علم ہے، جو صرف انبیاء علیہم السلام جیسے لطیف الاجسام، لطیف الارواح، لطیف القلوب اور لطیف

الاسرار مقدس گروہ کو عطا ہوتا ہے، اور وہ اس کے واسطہ سے علوم الٰہیہ، مرضیاتِ خداوندی اور شرائع ربانی کو جذب کرتے ہیں، یا ان کی پاکیزہ ارواح غیب کے عالم کی طرف رخ کرتی ہیں، جو عام نگاہوں سے اوجھل اور تمام علوم وکمالات کا سرچشمہ ہے۔ وہاں انھیں حقائق اور ملکوت کا روحانی مشاہدہ ہوتا ہے، اور وہ ان سے علم اخذ کر کے دنیا کو دیتی ہیں، جس سے دنیا میں روشنی پھیلتی ہے، اور جن وبشر عالم کہلائے جانے کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ وحی کے سوا دوسرے وسائل کسبی ہیں، جنھیں مشق ومحنت اور ریاضت ومجاہدہ سے حاصل کر کے حصولِ علم کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے، لیکن وحی الٰہی نبوت کے بغیر نہیں ہوتی اور نبوت محض ایک موہبتِ الٰہی ہے جو بہ انتخابِ خداوندی منتخب افرادِ بنی آدم کو دی جاتی ہے، اس لئے وحی بھی ایک موہبۂ ربانی ہے جو بلا کسب ومجاہدہ محض عطاءِ الٰہی سے مخصوص نفوسِ قدسیہ کو دی جاتی ہے۔ اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہ۔

اس لئے وحی کا علم قطعی اور یقینی ہوتا ہے جس میں شک کی ادنیٰ گنجائش نہیں ہوتی کہ اس کی بنیاد انتخابِ الٰہی اور عطائے ربانی کی طاقتوں پر ہے جس میں زوال یا اضمحلال کی کوئی صورت نہیں، اور وحی کے سوا ہر وسیلۂ علم سے حاصل شدہ علم یقینی اور غیر یقینی دونوں جہتوں میں منقسم ہوسکتا ہے کہ اس کی بنیاد خود بشری قوت پر ہوتی ہے، جو کمزور بھی ہے اور ممکن الزوال بھی ہے۔ لیکن اس کسب اور وہب کے فرق سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وحی اور غیر وحی دونوں علم کے وسائل ہیں، جو عادتاً بنی آدم کو دیئے گئے ہیں، جن میں سے بعض وسائل بلا استثناء ہر انسان کو حسبِ لیاقت عطا ہوئے، جیسے سمع وبصر اور عقل وخرد وغیرہ، اور بعض مخصوص طبقات کو ملے ہیں، جیسے کشف والہام وغیرہ اور بعض اخص طبقہ کو دیئے گئے جیسے وحیٔ خداوندی جو انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور ہم علم غیب کی روشنی میں عرض کر چکے ہیں کہ اس کے معنی بلا واسطہ سببِ علم کے ہیں، اس لئے پیغمبر کی خبر سے ہمیں اگر وہی علم حاصل ہو جو ان کو ہوتا ہے، تو وہ علم غیب نہ ہوگا، کیوں کہ وہ ایک عادی سبب سے بالواسطہ پہنچا، اس لئے اسے حکایت وبیانِ غیب کہا جائے گا، حقیقی علم

غیب نہیں کہا جائے گا، کیوں کہ علم وحی کے وسیلہ سے پہنچا ہے، اور علم غیب وہ ہے جو عادی اسباب کے واسطہ سے سامنے نہ آئے۔

غیب کے لغوی اور اصطلاحی معنی میں فرق

اس سے نمایاں ہو جاتا ہے کہ علم غیب کے معنی لغت میں تو کسی مخفی شئے کے جان لینے کے ہیں، لیکن شریعت میں علم غیب کا لفظ لغت نہیں بلکہ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے، جس کے معنی چھپی ہوئی یا غائب اشیاء کے جان لینے کے نہیں بلکہ اس علم کے ہیں جو عادی وسائل کے واسطہ کے بغیر خود بخود حاصل ہو، یعنی وہ اسبابِ عادیہ سے غائب ہو، اور جو اُن کے ذریعہ نمایاں نہ ہو۔

مثلاً ہم حواسِ خمسہ کے ذریعہ محسوسات کا علم حاصل کریں تو اسے علم غیب نہیں کہا جائے گا، گو علم سے پہلے محسوسات ہم سے غائب اور مخفی تھیں، اور بلحاظِ لغت ان کے علم کو علمِ غیب کہنے کی گنجائش ہے، لیکن پھر بھی وہ اصطلاحی علمِ غیب نہ ہوگا، کیوں کہ ان محسوسات کا علم ہم نے ان اسباب کے ذریعہ حاصل کیا جو عادۃً اس علم کے حصول کے قدرتی اسباب ہیں۔ یا مثلاً ہم نے سوچ بچار، عقل وتدبر، اور فکر ونظر سے چند نامعلوم نتائج معلوم کر لئے جو بلاشبہ ہمارے لحاظ سے غیب تھے، لیکن نہیں کہا جائے گا کہ ہمیں علم غیب حاصل ہو گیا، کیوں کہ ان نتائج کا ادراک ہمیں فکر ونظر اور سوچ بچار کے وسیلہ سے ہوا، جو اس کام کے حاصل کرنیکے طبعی اسباب مانے جاتے ہیں، اور اسبابِ طبعیہ کے توسط سے جو علم حاصل ہوا اُسے اصطلاح میں علم غیب نہیں کہا جاتا۔

یا مثلاً تجربہ سے ہمیں بہت سی مخفی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں، جو ناتجربہ کاروں کو معلوم نہیں ہوتیں، مگر پھر بھی ان مخفیات کے علم کو علم غیب نہیں کہیں گے، کیوں کہ تجربہ خود آلاتِ علم میں سے ہے جو عادۃً تجرباتی علوم کے لئے بطور سبب اور وسیلہ کے استعمال ہوتا ہے۔

یا مثلاً اہل اللہ اور اولیائے کرام کو کشف والہام کے ذریعہ کسی بات کا علم ہو جائے جو یقیناً ایک مخفی امر تھا تو لغۃً تو اسے غیب کہہ سکیں گے، کہ غیبی امور کا انکشاف ہوا، لیکن

شرعاً علم غیب نہ کہیں گے، کیونکہ کشف والہام بھی بہر حال حصولِ علم کا ایک قدرتی اور عادی وسیلہ ہے، جو مخصوص افراد کو دیا جاتا ہے، اور وہ اس کے ذریعہ بڑے بڑے اسرار پر مطلع ہوجاتے ہیں۔

بہر حال علم کے حسی وسائل ہوں یا معنوی، کھلے ہوئے ذرائع ہوں یا چھپے ہوئے، ان سے حاصل شدہ علم کو شرعاً علم غیب نہیں کہا جائے گا، اور ظاہر ہے کہ جب اصطلاحاً علم غیب وہی ہوگا جو عادی وسائل سے بالاتر ہوکر بلا توسطِ اسباب از خود ہو، تو حاصل یہ نکل آیا کہ علمِ غیب بجز ذاتِ بابرکاتِ خداوندی اور کسی کے لئے نہیں ہوسکتا، کیونکہ غیر خدا کو جب بھی علم ہوگا اور جیسا بھی ہوگا، وہ عطاءِ الٰہی ہوگا، اور مذکورہ وسائل میں سے کسی نہ کسی وسیلہ کے واسطہ سے ہوگا، خواہ وحی سے ہو یا کشف والہام سے، تجربے سے ہو، یا حواس سے ہو، یا عقل وخرد سے، یعنی ظاہری وسائل کے راستہ سے ہو یا باطنی اور معنوی اسباب کے طریق سے۔

اس لئے علم غیب خاصہ خداوندی نکل آتا ہے، اور یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ کسی بھی بشر کو علم غیب حاصل نہیں، جب کہ کوئی بھی غیر اللہ بلا توسطِ اسباب خود بذاتہٖ عالم نہیں ہوسکتا، خواہ انبیاء ہوں، یا اولیاء، ملائکہ ہوں یا ارواحِ قدسیہ، یہ الگ بات ہے کہ انبیاء اور بالخصوص سردارِ انبیاء ﷺ کا علم تمام مخلوقات کے علم سے بدرجہا زائد وفائق ہے، اسلئے کسی پیغمبر پر بھی عالم الغیب کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ قرآن حکیم نے علم غیب کو حصر کے ساتھ جگہ جگہ صرف اللہ ہی کی ذات کی طرف منسوب اور اسی کے ساتھ مخصوص بتلایا ہے۔ فرمایا:

فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ۝

ترجمہ: تو کہہ دے کہ غیب کی بات اللہ ہی جانے، سو منتظر رہو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔

قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ، وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ۔

ترجمہ: تو کہہ کہ خبر نہیں رکھتا جو کوئی ہے آسمان اور زمین میں چھپی ہوئی چیز کی مگر اللہ، اور اللہ

کے پاس ہے چھپی بات، آسمانوں کی اور زمین کی، اور اسی کی طرف رجوع ہے ہر چیز کا۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ۔

ترجمہ: اور اسی کے پاس کنجیاں ہیں غیب کی کہ ان کو کوئی نہیں جانتا اس کے سوا۔

وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ۔

ترجمہ: اور اگر میں جان لیا کرتا غیب کی بات تو بہت کچھ بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھ کو برائی کبھی نہ پہنچتی۔

مسئلہ تقدیر میں اس اہم گوشہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہ شر کے خلق کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف ہونا اس کی شان کے مناسب نہیں، فرماتے ہیں:

قدریہ نے خدا کے خلقِ افعال پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ اگر بندے کو خالقِ افعال نہ مانا جائے بلکہ اسے کاسب کہہ کر اس کے افعال کا خالق خدا کو تسلیم کر لیا جائے تو خدا جہاں خالقِ خیر ٹھہرے گا وہیں خالقِ شر بھی قرار پائے گا، اور یہ بلاشبہ خدا کی شانِ تنزیہہ کے خلاف ہے کہ اسے شرور و مفاسد کا موجد اور خالق تسلیم کیا جائے۔ اور شرور کی نسبت اس کی بارگاہِ رفیع کی طرف کی جائے۔ لیکن اہل سنت کی طرف سے کہا جا سکتا ہے کہ بندہ کے کسب کرنے پر اس کے افعال کو پیدا کر دینا ظاہر ہے کہ عطاءِ وجود ہے اور عطاءِ وجود کسی حالت میں بھی مذموم نہیں بلکہ اعلیٰ ترین صناعی اور مخلوق پر انتہائی احسان ہے کہ اسے وجود جیسی بے بہا دولت بخش دی اور ساتھ ہی اسے اپنے مکنونِ جوہر اور طبعی خاصیات دکھلانے کی آزادی دی، اور موقعہ بخشا۔

یہ دوسری بات ہے کہ پیدا شدہ چیز خواہ وہ افعالِ خلائق ہوں یا خود خلائق اپنی ذات سے بری ہو یا اچھی، مگر وجود بخشنا ہر صورت میں خوبی ہی خوبی اور وجود دینے والا بہر صورت مستحقِ مدح و ثناء ہی رہے گا کہ اس نے اپنا عجیب و غریب کمال دکھلایا جو کسی اور سے نہ بن پڑتا تھا۔

مثلاً ایک شعبدہ گر اپنی ٹوکری کے نیچے چند کنکریاں چھپا کر اس پر اپنا ڈنڈا پھراتا

ہے اور ڈگڈگی بجاتا ہے، اور منٹ بھر میں ایک چلتا پھرتا کبوتر نکال کر دکھلا دیتا ہے جس پر تماش بین متعجب اور مسرور ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں وہی شعبدہ گر اس ٹوکری کے نیچے سے ایک رسی چھپا کر نکالتا ہے تو وہ دوڑتا بھاگتا سانپ بن جاتی ہے جس سے تماش بیں متوحش اور خوف زدہ ہو کر بھاگنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کبوتر مرغانِ حرم میں سے ہے ایک بے ضرر اور پاک جانور ہے اور سانپ بدطینت اور موذی جانور ہے، ایک اچھا اور ایک برا، لیکن تماش بینوں کی نگاہ میں شعبدہ باز دونوں صورتوں میں اچھا باکمال اور مستحقِ مدح وانعام ثابت ہوتا ہے، کیونکہ اس نے تو ہر صورت میں اپنا کمال ہی دکھلایا اور اشیاء کو وجود ہی دیا اور وجود دینا بہر صورت انعام کا مستحق ہے۔ کبوتر کو دیا جائے یا سانپ کو، نیز کبوتر اپنی ذات سے اچھا سہی اور سانپ برا سہی مگر مجموعۂ تماشہ کے لحاظ سے دونوں خیر ہی خیر ہی ہیں، کیونکہ تماشہ کا کمال بغیر ان مختلف انواع کے نمایاں کئے بغیر پورا نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے شعبدہ گر کی طرف کسی صورت میں کوئی بری نسبت نہیں ہو سکتی۔

ایک معمار تعمیر مکان کے سلسلہ میں شہ نشین بناتا ہے جس میں گلدستے اور آرائش کے سامان رکھے جاتے ہیں اور بیت الخلاء بھی بناتا ہے جہاں منوں نجاستیں ڈالی جاتی ہیں۔ ایک شئے اپنی ذات سے اچھی، اور ایک بری۔ مگر معمار ہر صورت میں قابل تعریف اور مستحقِ ثناء وصفت ہے کیونکہ اس نے تو بہر صورت اپنی ایجاد اور وجود بخشی کا کمال ہی دکھلایا، نیز مجموعۂ مکان کی نسبت دونوں چیزیں اچھی، کیونکہ مکان کا کمال ان انواع کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا تھا۔

تخلیق شر اللہ تعالیٰ کیلئے باعثِ اتہام والزام نہیں

اسی طرح حق تعالیٰ خالقِ خیر بھی ہے اور خالقِ شر بھی، خالقِ ایمان بھی ہے اور خالقِ کفر بھی، خالقِ تقویٰ بھی ہے اور خالقِ فجور بھی، اور ان میں سے ہر خیر اپنی ذات سے اچھی اور شر اپنی ذات سے برا، مگر وجود دہندہ اور پیدا کنندہ دونوں کے لحاظ سے صاحب خیر باکمال اور مستحقِ ثناء وصفت ہے کہ اس نے بہر حال وجود بخشی کی جو احسان ہی احسان اور انعام ہی

انعام ہے۔ نیز اس نے ان دونوں نوعوں کے لحاظ سے فیاضی ہی کی، ہر نوع کو اپنی ذاتی خاصیت دکھلانے اور اپنے انجام تک پہنچنے کا موقع دیا اور ادھر مجموعۂ عالم کے اعتبار سے ان میں سے کوئی چیز بھی شر نہیں کہ مجموعۂ کمال ان ساری انواع کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا تھا۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن

اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

پس خالق جل مجدہ کی طرف نہ بایں معنی شر کی نسبت ہوتی ہے کہ وہ وجود بخشندہ ہے، نہ بخشش وجود شر ہے نہ شر کی نسبت، اور نہ بایں معنی شر کی نسبت ہوتی ہے کہ اس نے مجموعہ عالم اور کارخانہ تکوین کو مختلف المزاج اشیاء سے رونق بخشی کہ مجموعہ کو اشتات سے مزین کرنا نہ شر ہے نہ شر کی نسبت، پھر نہ بایں معنی شر کی نسبت ہوتی ہے کہ مختلف الخاصیات اشیاء کو اپنی خاصیات دکھلانے میں اس نے آزادی دی اور کسی شئے کو آزادی دینا اور اسے اس کی حد کمال پر پہنچنے کا موقعہ دے کر اس کے انجام اور اس کے صحیح ٹھکانے پر پہنچا دینا نہ شر ہے نہ شر کی نسبت۔

اسی حقیقت کو ذرا اور گہری نظر سے دیکھنے کے لئے اُسی وجود و عدم کے نظریہ کی روشنی میں دیکھئے تو یوں نظر آئے گا کہ یہ عالم جبکہ مجموعۂ وجود و عدم ہے جیسا کہ ابھی ثابت ہوا، تو اسے اور اس کے تمام اجزاء کے عدمات کو وجود کا لباس پہنانے سے قدرتاً اس سے دو قسم کے امور ظاہر ہو سکتے ہیں۔

ایک طرف تو اس کے عدمات کے سانچوں میں وجود ڈھلنے سے وجود کے کمالات کھلیں گے جو اس طرف کی خصوصیات کے لحاظ سے بقدر وجود مخصوص رنگ کے ہوں گے اور دوسری طرف اس کی اصلی جبلت عدم کے مکتومات عدمی نقائص کی صورت میں نمایاں ہوں گے، اور ان دونوں رنگوں کے سامنے آنے ہی سے اسی شئے کی ماہیت اور نوعیت دنیا کے سامنے واشگاف ہوگی، اور ادھر اللہ کی صناعی کا کمال کھل کر اسکی مختلف صفات وشئون نمایاں ہوگی، شئے کے وجودی کمالات ظاہر ہونے سے تو خود وجود کا کمال سامنے آئے گا

کہ وہ مختلف مظاہر مین نمایاں ہوا، اور خود اس طرف کے عدمی نقائص کھلنے سے وجود کے اظہار معنی کھول دینے کا کمال سامنے آئے گا کہ اس نے اپنی مخفی نورانیت اور روشنی سے اس شئے کی جبلی اور مخفی کمزوریاں سامنے کر دیں گویا وجود ایک نور ہے، جس کی حقیقت یہ ہے کہ:

ظاهر بنفسه مُظهر لغيره۔

خود نمایاں اور دوسرے کو نمایاں کر دینے والا۔

پس ایک صورت میں تو وجود اپنے باطن کو کھولتا ہے تو خیر و خوبی نمایاں ہوتی ہے، اور ایک صورت میں وہ اپنے مظہر و مورد کے باطن کو کھولتا ہے جو عدمی تھا تو شر و خرابی واضح ہوتی ہے، اور اس طرح ظہور و اظہار کی بوقلمونیاں دنیا کے سامنے آ کر ایجادِ ربانی کے کمالات واشگاف کرتی رہتی ہیں۔ مثلاً ایک انسان کے عدم العلم پر جب علمِ خداوندی کا وجودی پرتو پڑے گا اور یہ شخص عالم کہلائے گا تو ظاہر ہے کہ وہ عالم الکل اور علام الغیوب تو بن ہی نہ جائے گا جبکہ عدم العلم کا نقص بھی بوجہ عدمِ اصلی اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ پس بقدرِ استعداد اس کا عدمِ علم یعنی جہل اس میں قائم رہے گا۔ پس جس حد تک علمی کمال اس سے ظاہر ہوگا وہ تو علمِ الٰہی کا ظہور ہوگا، جو اس کے ظرف کے مناسب وضع و انداز لئے ہوئے ہوگا کہ علمِ الٰہی نے اس میں جلوہ افروزی کر کے خود اپنے کو اس کے روزنِ جہل سے نمایاں کیا، اور جس حد تک اس سے جہالت سرزد ہوگی وہ خود اس کے جاہل نفس کا جبلی شر ہوگا مگر وہ کھلے گا علم کے ظہور کے بعد ہی، کہ اس کے بغیر نہ اس کے عدم کا چرچا ممکن تھا نہ عدمِ علم کا۔ پس بصورتِ کمالاتِ علمی تو علمِ الٰہی خود نمایاں ہوا، اور بصورتِ نقائص جہل علم نے اس شخص کی جاہلانہ جبلت کو نمایاں کیا۔

پہلی صورت اللہ کے کمالِ لطف و کرم کی ہے کہ کس فیاضی سے اس ظلماتی مخلوق میں اپنا نورِ علم چمکایا اور کوئی ادنیٰ بخل روا نہ رکھا، اور دوسری صورت اللہ کے کمالِ عدل و انصاف کی ہے کہ مخلوق کے ہر مکنون جوہر اور اس کی ہر طبعی اور جبلی خاصیت کو خواہ وہ کتنی ہی گندہ کیوں نہ تھی، نمایاں ہونے کا موقع دیا اور اس پر کوئی بھی پابندی عائد نہ فرمائی۔ اگر مخلوق

بے اختیار تھی تو اضطراراً اور اگر بااختیار تھی تو اختیاری انداز سے اسے کھل کھیلنے کا موقع بخشا۔ اس کی فیاضیوں کے سامنے مطلقاً ہر مخلوق بہرہ یاب ہے خواہ وہ شر ہو یا خیر۔ وہ ہر ایک کو موقع بخشتا ہے کہ وہ اپنے طبعی آثار و غوامض کھول کر اپنے نتیجہ تک پہنچ جائے۔ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝

اس سے واضح ہوا کہ مسئلہ تقدیر میں خیر و شر اور بالخصوص تخلیقِ شر خدا کے لئے کسی اتہام والزام کا باعث تو کیا ہوتی، مزید اظہارِ کمالات اور ظہورِ خیرات کا باعث ہے، وہ شر کو اگر پیدا کرتا ہے تو شر اس کی ذاتِ پاک کے پاس نہیں پھٹک سکتی، ادھر سے صرف وجود ملتا ہے اور اس وجود یافتہ کی برائی کو کھول کر اپنی بھلائی اس میں شامل کر دیتا ہے، نہ یہ کہ اسے کوئی برائی بخشتا ہے۔ پس کسی برے کو سامنے لاکر اسے بھلائی سے مقرون کرنا اور برائی نہ دینا، آخر کون سے اصول سے شر کہا جائے گا اور یہ نسبت اللہ کی جناب میں کب بری ہے کہ اس کی وجہ سے اہلِ سنت کو مطعون کیا جائے۔

بات بہت طویل ہوگئی لیکن مجھے امید ہے کہ حضرت کے علوم کی یہ جھلک شائقین اور قدردانِ علم کو اس پر مجبور کرے گی کہ وہ حضرت کی تالیفات سے استفادہ کریں اور اس خزانہ عامرہ سے بھرپور فائدہ اٹھائیں جس کا ایک معمولی سا نمونہ ان اقتباسات کی شکل میں یہاں پیش کیا گیا ہے۔

حضرت کی تالیفات کے اس علمی خزانے کی انہیں خصوصیات کے پیشِ نظر میری دلی خواہش تھی کہ یہ قیمتی ذخیرہ شائقین اور تشنگانِ علوم کے لئے مرتب ہو کر منظرِ عام پر آجائے تو ایک بڑی خدمت ہوگی۔ اس کام کی اہمیت اور اس کے وقیع ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں، اگر اس کو پیش کرنے میں کوئی خامی رہ جاتی ہے تو پیش کرنے والے کی کم استعدادی اور بے سلیقگی کہی جائے گی، چونکہ یہ تو قیمتی جواہر ہیں، ہر حال میں قیمتی اور بیش بہا ہی رہیں گے اگر ان کو سلیقہ سے مرتب نہ کیا جائے تو اس سے ان کی قدر و قیمت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

میں ایک بار پھر ان افادات کی جلد اول میں لکھی گئیں مقدماتی سطور کا ایک حصہ

نقل کرتا ہوں جو مناسب موقع بھی ہے اور اظہارِ مدعا کے لئے کافی بھی۔

بہر حال میں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا تو سب سے اہم مسئلہ کتابوں کی فراہمی کا تھا، اس سلسلہ میں جن حضرات نے میری طرف دستِ تعاون بڑھایا ان میں جناب مولانا فرید الدین صاحب (استاذِ حدیث وقف دارالعلوم دیوبند)، جناب الحاج محمد اسعد صاحب (سفیر وقف دارالعلوم دیوبند)، جناب مولانا مفتی نسیم احمد صاحب رحمانی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ میرے خصوصی مشیروں میں جناب مولانا محمد اسلام صاحب قاسمی (استاذِ حدیث وقف دارالعلوم دیوبند)، مفسر قرآن حضرت مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی دہلوی، جناب مولانا محمد عبد اللہ صاحب گورکھپوری (کنوینر ''حکیم الاسلام عالمی سیمینار) شامل ہیں۔ میں ان سب حضرات اور باقی معاونین کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے حسبِ ضرورت اور عند الطلب مجھے مفید مشوروں سے نوازا اور میری رہنمائی فرمائی۔ جزاھم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء۔

میں نے حسبِ موضوع متعدد رسائل کو اپنی فہم نارسا سے ایک مجموعہ کا نام دیا ہے، اس کو ایک اضافی قید اور تفننِ طبع سمجھئے ورنہ حضرت حکیم الاسلام کی ہر تحریر ایسی جامع ہوتی ہے کہ اس کو کسی ایک عنوان میں محدود کرنا آسان نہیں، اس میں مختلف رنگ جھلکتے ہیں۔

ایک وضاحت یہ بھی کرتا چلوں کہ حضرت کی تالیفات کی سابق اشاعتوں میں اگر کسی اہل قلم کی کوئی رائے اور تقریظ تھی تو میں نے اسے جوں کا توں باقی رکھا ہے، اسلئے کہ ظاہر بات ہے کہ اس تحریر کا پس منظر، غرض وغایت اور اہمیت وافادیت جس مؤثر انداز میں ان کے قلم سے ادا ہو سکتی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے، چونکہ ان کو تحریر کے ساتھ ساتھ صاحبِ تحریر سے بھی جو قرب ولقاء حاصل تھا وہ بذاتِ خود ایک اضافی شرف ہے۔ حضرت حکیم الاسلام کی شخصیت اور کمالات پر انکی رائے ایک وثیقہ اور تاریخی نوٹ کی حیثیت رکھتی ہے۔

آج کے ہوش ربا دورِ گرانی اور علمِ دین سے توجہی کے ماحول میں کسی ایک شخصیت پر کتابوں کی اتنی بڑی سیریز کی اشاعت کی ذمہ داری اٹھانا ہر کسی کے بس کی

بات نہیں، کوئی بڑے دل والا اور بزرگانِ دین کی کتابوں کی اشاعت کا جذبہ رکھنے والا ہی اس بڑے صرفہ کا متحمل ہوسکتا تھا۔ اس وقت دینی کتابوں کی اشاعت اور قرآن پاک کی خدمت میں جو نمایاں نام فرید بک ڈپو، دہلی نے پیدا کیا وہ اتنی قلیل مدت میں شاید کوئی اور پیدا نہیں کرسکا۔ ادارہ کے مینیجنگ ڈائریکٹر برادرِ محترم جناب الحاج محمد ناصر خاں صاحب کے سامنے جب اس منصوبے کا ذکر کیا گیا تو انھوں نے نہ صرف اسکی اشاعت کا بارِ گراں اٹھانے کا یقین دلایا بلکہ اسے اپنی خواہش بنا کر تقاضا کیا کہ یہ کام ضرور اور بہت جلد ہونا چاہیے۔ ان کی سرپرستی مل جانے کے بعد اتنے بڑے پروجیکٹ پر کام کرنا آسان نظر آرہا ہے۔ میں ان کی اس قدردانی اور علم دوستی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انھیں مبارک باد دیتا ہوں کہ وہ اپنے ادارے سے ایسی عظیم اور بابرکت شخصیت کی کتابوں کو شائع کررہے ہیں۔ اس کا ظاہری و باطنی نفع انشاء اللہ تعالیٰ وہ خود اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرمائیں گے۔

مجھے اب تک متعدد کتابوں کی کتابت، تصحیح اور ترتیب کا موقع ملا ہے، مجھے خوشی ہے کہ حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی ان مؤلفات اور بے مثال تحریرات کی نہ صرف تصحیح وترتیب بلکہ کتابت وسیٹنگ کی بھی توفیق ملی۔ کمپیوٹر میں کتابت کی اغلاط اور سیٹنگ کی بدزیبی معروف ہے، پھر بھی میں نے کوشش کی ہے کہ یہ مجموعہ حتی الامکان کتابتی اغلاط سے مبرا اور سیٹنگ کی خامیوں سے پاک رہے۔

اہل قلم حضرات جانتے ہیں کہ عبارت کے اندر بعض جگہ اعراب لگانے سے مطلب کے افہام وتفہیم میں کس قدر سہولت ہوجاتی ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ جس طرح رموزِ اوقاف کی رعایت کیے بغیر بعض مرتبہ قرآن کریم کی عبارت کے معنی کچھ کے کچھ ہوجاتے ہیں، اسی طرح مضاف مضاف الیہ وغیرہ تحریری قواعد کا سہارا لئے بغیر اردو عبارت کی توضیح میں بڑی مشکل پیش آتی ہے اور بہت سی بار قاری دھوکہ کھا جاتا اور عبارت کے مفہوم کے سمجھنے میں غلطی کرجاتا ہے۔ میں نے حسبِ موقع اعراب، قومہ اور

فل اسٹاپ لگا کر عبارت کو واضح کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اگر کوئی پیراگراف زیادہ بڑا تھا تو مضمون کے ربط و تسلسل کا خیال رکھتے ہوئے اس میں نئے پیراگراف (اقتباسات) بھی بنائے ہیں۔ کیونکہ پورے صفحہ میں اگر ایک بھی پیراگراف نہ ہو تو عام طور پر یہ امر بارِ طبیعت کا سبب بنتا ہے۔ بے عیب تو خدا کی ذات ہے اپنی کوشش میں کوئی کمی نہیں کی۔ و الغیب عند اللہ۔

حضرت حکیم الاسلام کی تالیفات میں کام کرنے سے میرا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ یہ انمول خزانہ گم نامی اور نایابی کے سمندر سے نکل کر ایک بار پھر قدردانوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ حضرت حکیم الاسلام کی تصنیفات کی قدر وہی حضرات جانتے ہیں جو بحرِ علم و حکمت کے اصل شناور ہیں۔ چونکہ بات بہت طویل ہوگئی اس لئے میں حضرت کی تحریری خوبیوں کی مثال دینے سے گریز کروں گا، انشاء اللہ کسی اور موقع پر کچھ لکھنے کی کوشش کروں گا۔ مختصر یہ کہ وہ احکامِ شریعت کی تشریح اور حکمت بیانی کے لئے کتاب وسنت کے علاوہ، سلفِ صالحین اور اسلامی شخصیات کے احوال و آثار سے جس طرح تمثیل و تطبیق دیتے ہیں، اس سے ایک طالب کے اندر جو شعور اور سلیقہ پیدا ہوتا ہے، بعض مرتبہ وہ سیکڑوں صفحات کے مطالعہ سے بھی جنم نہیں لے سکتا۔

ایک چیز یہ بھی قابلِ عرض ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی تالیفات وافادات کی اشاعت جن اداروں سے ہوئی ان میں مکتبہ ''تاج المعارف'' دیوبند کو چھوڑ کر باقی اداروں نے تصحیح کا وہ معیار قائم نہیں رکھا جو اِن اہم کتابوں کا حق تھا۔ چنانچہ سابقہ اشاعتوں میں اغلاط کی کثرت ہے۔ پھر بھی علمی دنیا پر ان اداروں کا احسان ہی ہے کہ انہوں نے اس علمی خزانے کی حفاظت کی اور اپنے اداروں سے ان کی اشاعت کر کے اصحابِ ذوق کو سیراب کیا۔ یہاں ایک شخصیت کا ذکر کئے بغیر نہیں رہا جاتا جس نے حضرت حکیم الاسلام کے ان علمی جواہر پاروں کو سمیٹنے میں بھرپور کردار ادا کیا، انھوں نے تلاش کر کر کے حضرت کی تحریروں کو چھاپا اور ان کو ضائع ہونے سے بچایا۔ میری مراد

ماہنامہ دارالعلوم کے فاضل مدیر جناب مولانا سید ازہر شاہ قیصر صاحب مرحوم (صاحبزادہ جناب حضرت علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ) سے ہے۔ شاہ جی ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ کب حضرت مہتمم صاحبؒ کی کوئی تحریر ان کے ہاتھ لگے اور وہ اس کو ماہنامہ دارالعلوم کے صفحات پر سجا کر اہل علم کی خدمت میں پیش کریں۔ حضرت شاہ جی کی وجہ سے بہت سی نادر تحریریں پردۂ گمنامی سے منصۂ شہود پر آئیں۔ جزاہ اللّٰہ خیرًا واعلی اللّٰہ درجاتہ۔ تصحیح کے اعتبار سے بھی ہم نے کوشش کی ہے کہ یہ اشاعت سابقہ اشاعتوں سے فائق ثابت ہو۔ والامر بید اللّٰہ۔

یہاں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ جب میں نے قریب دو جلدوں کا مواد تیار کر لیا اور تصحیح کے آخری مرحلہ میں پہنچا تو میں نے اپنے کام کا پورا خاکہ حضرت مولانا محمد سالم قاسمی دامت برکاتہم (صاحبزادہ حضرت حکیم الاسلامؒ، و مہتمم دارالعلوم دیوبند وقف) اور دہلی میں عالم بے نظیر، خطیب بے بدل حضرت مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی دہلوی کی خدمت میں پیش کیا۔ ہر دو حضرات نے اس درجہ میری اس کاوش کو سراہا اور دعائیں دیں کہ اس سے جہاں قلبی مسرت اور اس کام کے عنداللہ اپنے لئے ذخیرۂ آخرت بننے کی امید قوی ہوئی وہیں بعض بلند تعریفی الفاظ سے شرمندگی بھی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اُن کے ان کلماتِ دعائیہ اور حسن ظن کو میری اصلاحِ اعمال اور مغفرت کا سبب بنا دے۔ آمین!

حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب دامت برکاتہم نے طبیعت کی ناسازی اور سیمینار کے ضمن میں مسلسل اسفار کے باوجود پہلی ہی ملاقات کے بعد اپنے تاثرات کو قلم بند کرنے کا وعدہ فرمایا اور تاریخ موعودہ کو جب میں نے فون کر کے معلوم کیا کہ کل آپ سفر میں جائیں گے، میں نے آپ سے فلاں سلسلہ میں چند کلمات تحریر کرنے کی درخواست کی تھی، تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مولانا نے فرمایا کہ مجھے یاد ہے اور میں نے آپ کے لئے تحریر لکھ دی ہے، اس وقت میں اسے ہی صاف کر رہا ہوں آپ شام میں آجائیے۔ چنانچہ میں حاضر ہوا۔ آنموصوف نے اولاً خود اپنے مضمون کو پڑھ کر

سنایا نیز اسی عنوان کو باقی رکھنے پر زور دیا۔ ساتھ ہی فرمایا کہ قلم پر یہ شعر آ گیا اس لئے اسی سے ابتدا کردی گئی، طبیعت پر انبساط تھا، فرمایا کہ یہ شعر بھی میرا ہی ہے۔

میں نے رسائل کو حسب موضوع منتخب کر کے ان کے مجموعہ کو الگ الگ ناموں سے موسوم کیا ہے۔ حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہم العالی نے میرے رکھے ہوئے ناموں کو نہ صرف پسند فرمایا بلکہ ان کو ''جذاب'' اور ''دل کش تدوین'' جیسے بلیغ الفاظ سے تعبیر فرمایا اور اپنے متبرک قلم سے مجموعوں کے اسماء کو نقل فرما کر مہر تصدیق ثبت فرمادی۔ جو میرے لئے بڑے اعزاز کی بات ہے۔

مفسر قرآن حضرت مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی دامت برکاتہم نے جب جلد اول کا مسودہ اور پروگرام کا خاکہ ملاحظہ فرمایا تو کہنے لگے ''بھائی آپنے تو بہت اہم اور بڑے کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔''

اس کے بعد فرمایا کہ میں ضرور اس پر اپنی رائے لکھوں گا۔ چنانچہ چند دن کے بعد برادرم محمد صادق صاحب (ساکن گلی گڑھیا، یکے از متعلقین حضرت مولانا دہلوی) کا فون آیا کہ حضرت مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی نے مضمون لکھ کر مجھے دیتے ہوئی فرمایا کہ اُن کی اس اہم خدمت کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے میں نے تفصیلی مضمون لکھا ہے، ان (راقم) سے کہنا پورا مضمون شائع کریں۔ حضرت مولانا دہلوی نے اپنے مضمون میں اپنی یادداشتوں کا بھرپور استعمال کیا ہے، ان باتوں کا سینہ سے سفینہ کاغذ پر آجانا بھی شائقین کے لئے باعث معلومات ہی ہوگا۔ میں میرے لئے ان حضرات کے کلمات ایک سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جناب الحاج محمد اسعد صاحب مؤلف ''حضرت حکیم الاسلام دارالعلوم کی ایک مظلوم شخصیت'' کے اصرار پر اب میں اپنے اس پروگرام کا خاکہ ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں، جس کے تحت منصوبہ یہ ہے کہ حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی تمام دستیاب تحریریں یکجا ہو کر ایک بار پھر منظر عام پر آئیں اور تشنگانِ علوم کی پیاس بجھانے کے ساتھ ساتھ متعلقین ومنتسبین حکیم الاسلام اور حکمت قاسمیہ کے قدردانوں کے لئے سامانِ تسلی ہوں۔

میں نے ان تحریرات کو مختلف مجموعوں کی شکل میں مرتب کیا ہے جیسا کہ اس کا اظہار پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ پروگرام حسب ذیل ہے۔ اب تک چار جلدیں مکمل ہو چکی ہیں بقیہ جلدیں زیر تکمیل ہیں۔ امید ہے کہ انشاء اللہ نومبر میں ہونے والے "حکیم الاسلام عالمی سیمینار" کے موقع پر منظر عام پر آ جائیں گی۔

(۱) تحقیقاتِ حکیم الاسلام

صفحات ۶۲۴ (۱۳ مقالات و تالیفات)

○ حدیث رسول کا قرآنی معیار	○ اجتہاد اور تقلید
○ معیارِ حق	○ شرعی پردہ
○ حضرات صحابہ کا مقام	○ تصویر اسلام کے آئینہ میں
○ میلاد النبی کی شرعی حیثیت	○ نسب اور اسلام
○ مسئلہ تقدیر	○ راکٹ اور اسلام
○ معجزہ کیا ہے؟	○ چاند سورج وغیرہ کی گردش
○ علم غیب	

(۲) تنقیحاتِ حکیم الاسلام

صفحات ۵۶۸ (۱۰ مقالات و تالیفات)

○ کلمہ طیبہ قرآن و سنت کی روشنی میں	○ نظریہ دو قرآن پر ایک نظر
○ شہید کربلا اور یزید	○ عرب اسرائیل جنگ کا ثمرۂ تلخ
○ اسرائیل کتاب و سنت کی روشنی میں	○ حقیقت مذہب و سائنس
○ سورۂ فیل میں پرویزی تحریف	○ دار العلوم کا ایک فتویٰ اور اسکی حقیقت

○ بریلوی حضرات کی طرف سے پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ	○ حضرت تھانویؒ کی ایک عبارت کی توضیح

(۳) توضیحاتِ حکیم الاسلام

صفحات ۶۶۴ (۱۶ مقالات وتالیفات)

○ کلماتِ طیبات	○ فہم قرآن اور تعلیم مذہب کے دو بنیادی اصول
○ تحریک وتبلیغ کی کامیابی	○ دینی دعوت کے قرآنی اصول
○ مسئلۂ قربانی پر ایک نظر۔	○ غلافِ کعبہ اور غلافِ قرآن
○ عالم برزخ	○ سمتِ قبلہ معلوم کرنے کا اسلامی طریقہ
○ مسلم پرسنل لاء کے شرعی اصول	○ اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام
○ اردو زبان کی شرعی حیثیت	○ بانیٔ دارالعلوم دیوبند
○ دارالعلوم دیوبند کا بنیادی اصول ومسلک	○ علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج
○ آزادیٔ ہند کا خاموش راہنما دارالعلوم دیوبند	○ حضرت مولانا نانوتویؒ کی آبِ حیات

(۴) تشریحاتِ حکیم الاسلام

صفحات ۵۹۲ (۱۰ مقالات وتالیفات)

○ عالمی مذہب	○ عالم انسانیت کا مکمل قانون، اسلام
○ اسلام اور عالمی امن واخوت	○ اسلام کے دو امتیازی پہلو جامعیت اور اجتماعیت
○ اسلام کا اخلاقی نظام	○ اسلام اور فرقہ واریت

○اسلام اور سائنس	○اسلام میں حج کی اہمیت
○ڈاڑھی کی شرعی حیثیت	○نکاح کی حقیقت

(۵) تجلیاتِ حکیم الاسلام

صفحات ۵۹۲ (تین وقیع تالیفات)

○اسلامی تہذیب وتمدن (التشبہ فی الاسلام)
○اسلام اور مغربی تہذیب (تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام)
○فلسفہ نماز

(۶) کمالاتِ حکیم الاسلام

صفحات ۵۹۲ (پانچ حکمت ریز تالیفات)

○ نکاح وطلاق عقل وشرع کی روشنی میں	○فطری حکومت
○انسانیت کا امتیاز	○حفظانِ زندگی اور عجائباتِ برزخ
○فلسفہ نعمت ومصیبت مکمل	

(۷) سیرتِ خیر الانام لحکیم الاسلام

آفتاب نبوت اول ودوم	سیرت رحمۃ للعالمین
شان رسالت	خاتم النبیین
سیرتِ قرآنی	پیغامِ حیات

(۸) افاداتِ حکیم الاسلام

فضائل یوم جمعہ	یادِ حق
تحفۂ مومن	وداع النبی
خطبہ صدارت جمعیۃ العلماء مراد آباد	خطبہ استقبالیہ صد سالہ اجلاس دارالعلوم
خطبہ صدارت مسلم پرسنل لاء (اجلاسِ اول)	وعظ یوسفی
مسلمان اور شرک (سورہ کافرون کی روشنی میں)	مقامِ نبوت اور اس کے آثار و مقاصد
حکمتِ قاسمیہ	نماز اور حج
بقائے باہم کا سیکولرزم	تعمیر ملت اور تنظیم امت
عید الفطر اور اجتماعیتِ کبریٰ	مراقبہ ذات بحت
آستانۂ خداوندی اور کاشانۂ نبوی میں چند دن	جمعیۃ علمائے ہند کی تنظیم اور اتحاد کا ایک پیغام
رسالۃ المساجد	علمی سوالات

(۹) تواریخ و شخصیاتِ حکیم الاسلام

یادِ ایام (اپنے بارے میں ایک ریڈیائی تقریر)	مختصر تاریخ دارالعلوم دیوبند
تاسیس دارالعلوم دیوبند	دارالعلوم دیوبند ایک نظر میں
پچاس مثالی شخصیات	روایات الطیب

مشاہیر امت	علمائے ہند کی شاندار تاریخ کا ایک ورق
یادِ خلیل	علامہ کی یاد (علامہ بلیاوی)
حیاتِ انور (علامہ کشمیری)	ایک جامع شخصیت (مولانا مدنی)
مولانا سید حسین احمد مدنی	مضمون مفتی شفیع صاحب
مضمون علامہ شبیر عثمانی	مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی
آہ! احمد غریب	ملک معظم شاہ فیصل مرحوم

(۱۰) مشاہداتِ حکیم الاسلام

سفرنامہ برما	سفرنامہ افغانستان
سفرنامہ مقاماتِ مقدسہ و تأثر سفر مصر	سفر حج کے یادگار تاثرات
مکتوب حجاز	فیوض الحرمین
دیارِ مقدس سے واپسی پر......	پاکستان میں چند روز
سیر کشمیر	سفرنامہ یورپ

(۱۱) منظوماتِ حکیم الاسلام

عرفانِ عارف	آنکھ کی کہانی
جنونِ شباب	ارمغان اجلاس صد سالہ
جذباتِ الم	دعاء نامہ تہنیت شامہ
نعت نبی اکرم	

(۱۲) تقریظاتِ حکیم الاسلام

مقدمہ فتاویٰ دار العلوم دیوبند	مقدمہ انوار قاسمی

مقدمہ سوانح قاسمی	مقدمہ مکتوباتِ شیخ الاسلام
مقدمہ الجمعیۃ کا شیخ الاسلام نمبر	مقدمہ تفسیر کشف الرحمٰن (کلامی معجزہ)
مقدمہ اخلاق وآداب	مقدمہ موضح القرآن
مقدمہ چہل حدیث	مقدمہ حیات الصحابہ
مقدمہ نقش دوام	مقدمہ العجالۃ النافعہ
مقدمہ انوار الباری	مقدمہ فیض الباری
مقدمہ الادب المفرد	مقدمہ زجاجۃ المصابیح
مقدمہ سیرت مبارکہ (مصنفہ مولانا محمد میاں)	مقدمہ اخلاق وآداب

(۱۳) ارشاداتِ حکیم الاسلام

مجالس حکیم الاسلام	ملفوظات حکیم الاسلام

اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ وہ اس عظیم خدمت کی تکمیل میرے لئے آسان فرمائے اور اسے میرے لئے، اور میرے والدین کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین۔

جناب محترم الحاج محمد اسعد صاحب (رکن شعبۂ تنظیم ترقی وقف دار العلوم دیوبند) کے حکم پر ان کی وقیع تالیف کے لئے یہ پراگندہ اور بے ترتیب سی تحریر حاضر خدمت ہے۔

گر قبول افتد زہے عز وشرف

❁❁❁

حکیم الاسلام

اور

ان کی شاعری

حکیم الاسلامؒ کی شاعری

از: حضرت مولانا محمد اسلم قاسمی شیخ الحدیث والتفسیر دار العلوم وقف دیوبند

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دار العلوم دیوبند کی ہمہ جہت شخصیت ایک فقیہ ایک عارف ایک عالم، ایک خطیب، ایک شیخ اور ایک مشفق مربی کی حیثیت میں اطرافِ عالم سے شایانِ شان خراجِ تحسین آفریں حاصل کر چکی ہے اور دانشوروں اور عوام کے زبان و قلم اعترافِ عظمت کے لیے اپنی صلاحیتیں لٹانے کے باوجود اپنے صحیح جذبات واحساسات کے اظہار کے لیے تشنگی محسوس کرتے ہیں۔

ایک فقیہ کی حیثیت سے حضرتؒ کی تحریریں نازک مسائل میں ان نکات کو تلاش کرلائی ہیں جو آپ کی ذہانت اور علمی گہرائی پر شاہد عدل ہیں اور جو علمی حلقوں میں اپنی بصیرت افزاء نکتہ آفرینیوں کی بناء پر ایک منفرد اور وقیع مقام حاصل کر چکی ہیں۔

ایک عارف کی حیثیت سے حضرتؒ کا بلند مقام اربابِ تصوف وطریقت میں ہمیشہ ممتاز رہا ہے اور آپ کی پوری حیاتِ طیبہ اور کردار واخلاق آپ کے عرفانِ حق کا عکاس ہے۔

ایک عالم کی حیثیت سے حضرتؒ کا منصب جس عظمت سے ہمکنار ہے اس کا اندازہ ہم نشینوں اور خوشہ چینوں کو حضرتؒ کے اس استحضار اور قوتِ تفہیم سے ہو چکا ہے جو علمی مذاکروں اور مجالس میں طالبانِ علم کی آسودگی واطمینان کا باعث بنتا ہے۔

ایک خطیب کی حیثیت سے حضرتؒ کے زور بیان حسنِ تعبیر اور سحر انگیز تکلم کی صدائے بازگشت سے برصغیر ہندوستان و پاکستان سے لیکر بحر اٹلانٹک کے ساحل تک گونج رہے ہیں جہاں حضرتؒ کے نشانِ قدم اسلام کے ایک مخلص مجاہد اور عظیم مقرر کی حیثیت سے ثبت ہیں اور جہاں ان بے لوث اور پرشوکت لفظوں کا تأثر عظمتِ دین کے لیے ایک دفاعی حصار کا درجہ رکھتا ہے تاریخ اس حقیقت کی بجا طور پر شاہد رہے گی کہ

اسلامی خدمات کے باب میں حضرتؒ کی خطیبانہ اور واعظانہ سرگرمیوں نے نئے رنگ بھرے ہیں اور ایک دنیا کے سامنے قرونِ اولیٰ کے ان مبلغوں کا پیغام تازہ کیا ہے جن کے مدفن آج مسلمانوں کی بے راہ روی پر ماتم کناں ہیں۔

ایک شیخ کی حیثیت سے حضرتؒ نسبت قاسمی کی میراث کے ایک سچے اور پر جوش وارث ہیں، اور آپ کے متوسلین وخدام کا دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلا ہوا عظیم قافلہ آپ کے فیوض وبرکات کا مشاہد ہے اور آپ کا بابرکت دامن تھام کر جادۂ روحانیت کی طرف گامزن ہے۔

ایک مربی کی حیثیت سے حضرتؒ نے علاوہ اپنے متوسلین وخدام کی روحانی تربیت دارالعلوم دیوبند کے ۶۰ رسالہ دور اہتمام میں طلبہ عزیز کی جس شفقت ومحبت کے ساتھ علمی سرپرستی اور ان کے سامنے علمی طور پر مستقبل کے لیے طرزِ حیات اور راہیں متعین فرمائیں وہ شاید حضرتؒ کی زندگی اور نصب العین کا سب سے تابناک اور قابلِ رشک پہلو ہے اور فرزندانِ دارالعلوم دیوبند جن میں آج بڑے بڑے مشاہیر علماء اور منفرد شخصیتیں موجود ہیں ہر قدم پر اس اسوہ اور عملی نمونہ کو متاعِ عزیز کی طرح حرزِ جان بنائے ہوئے ہیں۔

آپ کی زندگی کے یہ سب وہ روشن پہلو ہیں جن سے آپ کے ساتھ وابستگی رکھنے والے حلقوں میں افادہ واستفادہ کا سلسلہ جاری ہے، یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان تمام مشاغل ومصروفیات اور اس دستورِ حیات کے ساتھ آپ کو صنفِ شعر سے دل چسپی لینے کے مواقع شاذ ہی ملتے ہوں گے — حضرتؒ کا صنفِ شعر سے دل چسپی کا سلسلہ زمانہ طالب علمی سے جاری تھا اور اب تک نظموں کا اک معقول اور قابلِ لحاظ ذخیرہ جمع ہو چکا ہے جو "عرفانِ عارف" کی زینت ہیں۔

آپ کی شاعری، شوقِ شعر گوئی کے بجائے واقعات وحادثات پر ذہنی تأثر، حقیقی جذبات اور تبادر ذہنی پر مبنی ہے، ان تمام نظموں کے محرکات جماعت دیوبند یا اپنے خاندان میں پیش آنے والے اہم واقعات وتقریبات یا حادثات ہیں جن سے متاثر ہو کر جذبات نے جامۂ شعر اختیار کر لیا، یہی وجہ ہے کہ آپ کے تمام اشعار میں تصنع وپُرکاری

کے بجائے سادگی وسلاست اور خلوص جذبات ہے یہی ان اشعار کی سب سے بڑی خصوصیت اور دلکشی ہے اور یہی بنیاد حضرتؒ کی صنفِ غزل سے عدم دل چسپی کی ہے جس کی تعمیر محض نزاکتِ تخیل اور ندرتِ اظہار و بیان پر ہے واقعات وحوادث سے متاثر ہوکر سادگی کے ساتھ اپنے جذبات کی عکاسی میں حضرتؒ کا کلام نزاکتِ تخیل کے بجائے متصوفانہ رنگ سے رنگین ہے۔

لفظ ''عارف'' حضرتؒ نے اپنی بعض ابتدائی نظموں میں بطور تخلص استعمال فرمایا ہے تاہم آپ کے کلام پر تفصیلی نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تخلص اور اس کے استعمال کا آپ کے یہاں کبھی کوئی التزام نہیں رہا جس کی وجہ بظاہر یہی ہوسکتی ہے کہ شعر گوئی کو کبھی آپ نے مقصدی اہمیت نہیں دی۔

حضرتؒ کا کلام اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں ہے لیکن کلام کی بنیادی خصوصیات ہر زبان میں یکساں نظر آتی ہیں جس سے اس حقیقت کا اندازہ بہت واضح طور پر ہوجاتا ہے کہ ان تینوں زبانوں پر آپ کو مضبوط دستگاہ حاصل ہے اور مضامین کی آمد روانی کلام اردو کی طرح عربی اور فارسی میں بھی حیرت انگیز طور پر یکساں ہے۔

حمد الٰہی (بزبانِ اردو)

خدا کی ذات میں ہے ہر بڑائی ❁ پہنچ سکتی نہیں اس تک برائی
غنا ہے اس کی شانِ کبریائی ❁ نہیں محتاجگی کو واں رسائی
کمالات اس کے سب دریوزہ گر ہیں ❁ جمالات اس کے سب زیرِ اثر ہیں
وہی مبدا وجود اور جود کا ہے ❁ معاد آخر ہر اک بہبود کا ہے
بری ہر وہم و قیل و قال سے ہے ❁ بری ہر مثل و ہر تمثال سے ہے
جہانِ عرش و کرسی اور افلاک ❁ جہانِ غیب و شاہد اس کی املاک
عطاؤ جود کی ہے اس کی کیا بات ❁ ہے توحید و رسالت اس کی سوغات

عطیّہ رحمتِ مہداہ اس کا ❁ ہدیّہ علم و ادراکات اس کا
نبی ہوں یا ولی مجبور ہیں واں ❁ مہ و مہتاب سب مزدور ہیں واں
ہر اک ذرہ میں جلوہ اس کا پیدا ❁ ہر اک پیکر سے نور اس کا ہویدا

نعت رسالت پناہی

جہانِ ذکر اوصاف و کمالات ❁ فدائے ذکر والائے محمدؐ
بیاضِ روز و مہر و ماہ و انجم ❁ نثارِ زلفِ سودائے محمدؐ
ازل سے تا ابد ایام دنیا ❁ نثارِ لیل اسرائے محمدؐ
اگر ہے سرِّ حق دنیا میں ظاہر ❁ تو مظہر ذات والائے محمدؐ
اگر ہو علمِ ربّانی مصوّر ❁ تو ہو وہ نقشِ زیبائے محمدؐ
مجسم گرہوں اخلاقِ الٰہی ❁ تو بن جائے سراپائے محمدؐ
کمالاتِ بشر ہیں ختم ان پر ❁ تو ہے پھر کون ہمتائے محمدؐ
ہے دنیائے دنی سورج سے روشن ❁ ضیاء مہر اسمائے محمدؐ
بلندی آسمانوں کی مسلّم ❁ تھے اسراء میں تہ پائے محمدؐ
طوافِ تن کو کعبہ بس ہے لیکن ❁ مطافِ روح ہے جائے محمدؐ

عروج قاسمی کی انتہا ہے
کہ ہے خاکِ کفِ پائے محمدؐ

انقلاباتِ دہر (بزبانِ فارسی)

ہماں گوہر کہ او بودہ جہاں تاب ❁ جہاں از آبِ فیضش گشتہ بیتاب
بصد حیفم کہ نورِ مہر رخشاں ❁ نہ ہر ذرّہ بود از مہر رخشاں
بافسوسم کہ ابرِ آبِ حیواں ❁ نبارد از پئے اطفال بُستاں

بفریادم کہ فیضِ لا تناہی ❁ گذارد تشنہ اندر آبِ ماہی
خدارا اے وفا دارانِ دل ریش ❁ بمن گوشے کہ می گویم غمِ خویش
چہ غم! افسانۂ صد درد و ماتم ❁ بہ ہولِ روز رستاخیز ہمدم
چہ غم! جورِ فلک ہر صبح و ہر شام ❁ چہ غم! تیر قضا بے وقت وہنگام
چہ غم! من زندہ و جانم تہِ خاک ❁ چہ غم! تن سالم و در سینہ صد چاک
چہ غم! بے چادری و ابرِ باراں ❁ چہ غم! بے مادری و شیر خواراں
چہ غم! با بے نوائی ساز کر دن ❁ چہ غم! فریاد بے آواز کر دن
چہ غم! ماہی و ریگ گرم و گرما ❁ چہ غم! مفلوج و آب سرد و سرما
چہ غم! جامِ تہی ازبادہ و خم ❁ چہ غم! راہم دراز و زاد رہ کم
چہ غم! رو پوشی ایمان و جانم ❁ چہ غم بر بادگی خان و مانم
چہ غم! بے تو جہاں پُر نالہ وشور و چہ غم! بے تو ہزاراں زندہ در گور

تو اے مولائیم آخر کجائی
زما رو پوش بے چون و چرائی

نونیۃ الآحاد (مشاہیر امت) بزبانِ عربی

يا من هدىٰ قلبي و زان بياني ❁ فنظمتُ عقد جواهر الازمان
اعني بها اعلام من فاق الورىٰ ❁ فمضي الدُّهُورُ وَ مَا لَهُمْ مِن ثانٍ
مَن كان فردَ زمانهٖ في فَنِّهٖ ❁ سمَّيتُهٗ فِيهَا بِحُسنِ بيانٖ
يَسّرْ مرادي لي فانت مُيَسِّرٌ ❁ كُلَّ الصِّعابِ عَزَزجتَ مِن رحمانٖ
سرد السيوطي حبر نا و اَجَلُّنا ❁ اَعني جَلالَ الدين ذي الاتقانٖ
وَ لَقَدْ رَآها الشيخ في خط من الذّ ❁ ذهبِيّ ذي العرفان و الاحسانٖ
وَ متي رَفَعتُ لك الرواية مسنداً ❁ فارِع بسَمعِك واعيا تبيانٖ

❁❁❁

حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ شاعر کی حیثیت سے

از: ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن خدا بخش لائبریری پٹنہ

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ (متوفی ۱۴۰۳ھ ۱۹۸۳ء) ایک متبحر عالم، بے مثل خطیب، متقی و پرہیزگار شخصیت، اور مہتمم دار العلوم کی حیثیت سے پورے ہندو پاک میں مقبول و مشہور تھے، یہی نہیں بلکہ عالم اسلام کے مختلف حلقوں میں نہایت قدر و منزلت اور عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ وہ مذہبیات کے علاوہ شعر و ادب سے بھی خصوصی دلچسپی رکھتے تھے اور ایک بلند پایہ شاعر تھے۔

بات دراصل یہ تھی کہ وہ محض شاعر نہیں تھے کہ مشاعروں میں شرکت کرتے، اخباروں و رسائل میں اپنا کلام چھپواتے اور اہل ذوق حضرات سے داد تحسین حاصل کرتے، بلکہ ان کی زندگی کا اصل مقصد تو علم دین کی اشاعت و تبلیغ اور دار العلوم دیوبند کی آبیاری اور چمن بندی تھی، لیکن کبھی کبھار کسی ضرورت یا محض تفنن طبع کے طور پر کوئی نظم یا قصیدہ کہہ ڈالتے، جس سے ان کی شعری صلاحیت کا جوہر کھلتا اور پھر اہل ذوق انہیں سن کر جھوم اٹھتے۔

خوشی کی بات ہے کہ ان کے صاحب زادے مولانا اسلم قاسمی نے قاری محمد طیبؒ کا شعری مجموعہ ''عرفان عارف'' کے نام سے شائع کر دیا ہے جو ۲۸۰ ر صفحات پر مشتمل ہے اور جس کے اشعار کی مجموعی تعداد تقریباً ۴۲۰۷ ر ہے، اس میں فارسی کے ۴۳۳ ر اور عربی کے ۱۷۰ ر اشعار پائے جاتے ہیں، بقیہ ۳۶۰۷ ر اشعار اردو زبان میں ہیں۔

تخلص

مولانا قاری محمد طیبؒ صاحب نے شعر و شاعری کا فطری ذوق پایا تھا اس بناء پر وہ زمانہ طالب علمی میں گرچہ درسی کتابوں کے مطالعہ میں رہے، تاہم

وقتاً فوقتاً شعر گوئی بھی کر لیا کرتے تھے اس لیے انہوں نے نظموں میں اپنا تخلص "عارف" استعمال کیا ہے، لیکن عام طور پر اپنے نام طیب ہی کو تخلص کی حیثیت سے اختیار کیا ہے کہیں کہیں بغیر تخلص کے بھی نظم ملتی ہے۔

ادبی ماحول مولانا قاری محمد طیبؒ کی پرورش و پرداخت خالص علمی و دینی ماحول میں ہوئی تھی، ان کے دادا حضرت مولانا قاسمؒ نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ) دار العلوم دیوبند کے بانی اور ہندوستان کے مشہور عالم دین، فقیہ اور مرد مجاہد تھے، ان کے والد محترم حافظ محمد احمد بھی مشہور عالم دین اور دار العلوم دیوبند کے مہتمم تھے؛ اس طرح پورا گھرانہ خالص علمی و دینی تھا، جہاں مذہبیات کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو شعر و ادب کا چرچا رہتا تھا، ایسے خوشگوار علمی و ادبی ماحول نے مولانا قاری محمد طیبؒ کے فطری ذوق شاعری پر گہرا اثر ڈالا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بچپن ہی سے خوبصورت اور اچھے اشعار کہنے لگے۔

اردو شاعری جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا مولانا قاری محمد طیبؒ نے اردو زبان میں زیادہ اشعار کہے ہیں مجموعی طور پر ۴۷/ نظمیں ملتی ہیں سب سے طویل نظم "آنکھ کی کہانی" ہے جس میں تقریباً ۱۶۷/ اشعار پائے جاتے ہیں۔

اردو نظموں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا محمد طیب میں اچھی اور کامیاب نظم کہنے کی بھرپور صلاحیت موجود تھی، ان کی نظموں میں حالات و واقعات کی صحیح عکاسی، زبان کی سلاست و روانی، اردو الفاظ و محاورات کے برمحل استعمال اور جذبات کی ترجمانی کی پوری جھلک ملتی ہے، چونکہ وہ ایک متبحر عالم دین تھے، اس لیے مذہبی رنگ تقریباً ہر نظم میں نمایاں ہے، لیکن جا بجا طنز و مزاح کی جھلک ملتی ہے کہیں کہیں فلسفیانہ خیال اور منطقیانہ استدلال نظر آتا ہے، بعض بعض جگہ پند و نصیحت بھی پائی جاتی ہے۔

مولانا قاری محمد طیبؒ کی شاعری کس پایہ کی ہے، کتنے اچھے شاعر ہیں اور اس میدان میں ان کا کیا مقام ہے؟ اس لیے مناسب ہوگا کہ چند مستند اور معتبر شاعر و ادیب کے تأثرات بیان کیے جائیں اور دیکھا جائے کہ انہوں نے ان کی شاعری کے بارے میں کیا کہا ہے۔

اکبر الٰہ آبادی کا تأثر

لسان العصر حضرت اکبر الٰہ آبادی نے ایک انگریزی نظم کا منظوم اردو ترجمہ "پانی کی روانی" کے عنوان سے کیا تھا،

مولانا قاری محمد طیبؒ صاحب نے اس نظم کو پڑھ کر اس کی پیروی میں ایک دوسری نظم "اسلام کی روانی" کے عنوان سے کہی جو رسالہ القاسم ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی، اکبر الٰہ آبادی اس نظم کو پڑھ کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی دارالعلوم دیوبند کے نام ایک خط میں اپنا تأثر اس طرح پیش کیا "مولانا محمد طیبؒ کی نظم "روانی اسلام" نظر سے گذری، ماشاءاللہ صلّی علیٰ جزاک اللہ نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول"۔

خاکسار اکبر الٰہ آبادی

مولانا عبد الماجد دریا آبادی کا تأثر

مولانا قاری محمد طیبؒ کی ایک آنکھ کا آپریشن ۱۹ر جنوری ۱۹۶۳ء کو ہوا تھا اور پھر کچھ دنوں کے بعد دوسری آنکھ کا آپریشن ہوا، انہوں نے اس موقعہ پر بستر آپریش پر لیٹے لیٹے ایک طویل نظم کہی جو نہایت معرکۃ الآراء نظم ہے، اس نظم میں آنکھ سے متعلق بہت سے حقائق، فوائد اور کیفیات نہایت بلیغ انداز میں بیان کی گئی ہیں، حکمت و عبرت کی باتیں کہی گئی ہیں، سبق حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے خالقِ حقیقی کا شکر ادا کیا گیا ہے، ہسپتال کے ڈاکٹر وغیرہ کی تعریف و توصیف کی گئی ہے جب یہ نظم چھپی تو اہل علم نے نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور اس کی تعریف کی، اردو زبان کے مشہور انشاپرداز اور ادیب مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے اس نظم کو پڑھ کر اپنے تأثرات کا اظہار اس طرح کیا۔

حضرت محترم ——— السلام علیکم ——— "آنکھ کی کہانی" آں محترم کا عطیہ یہاں آتے ہی پڑھ ڈالی، سبحان اللہ ماشاءاللہ مجھے علم نہ تھا کہ آپ کو شعر و ادب میں اس درجہ قدرت حاصل ہے، ذالک فضل اللہ۔

کیا کیا قافیے نکالے ہیں، کیسے کیسے مضمون باندھے ہیں کہ پیشہ ور شاعروں کے

بھی چھکے چھوٹ جائیں، نہ کہیں جھول، نہ اتنی طویل نظم میں کہیں آورد، بس آمد ہی آمد، خوش دماغ تو بحیثیت ایک سچے قاسم زادہ کے آپ تھے ہی اب معلوم ہوا کہ ماشاء اللہ خوش فکر بھی اس درجہ میں ہیں، ماشاء اللہ۔

دعا گو و دعا جو

عبدالماجد ۱۵؍دسمبر ۱۹۶۴ء

مسٹر افضل اقبال ڈپٹی ہائی کمشنر کا تأثر: مسٹر افضل اقبال ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان برائے ہند نے بھی ''آنکھ کی کہانی'' والی نظم پڑھی تو وہ نہایت متأثر ہوئے اور انہوں نے اپنے تأثرات کو اس طرح بیان کیا، لکھتے ہیں: ''شعر کی سادگی، تخیل کی پرواز اور خلوص کی بہتات تمام ایسی خوبیاں ہیں جو آپ کی ذات سے نہایت آسانی سے منسوب ہوگئی ہیں، آپ کی روحانی عظمت کا کون قائل نہیں یہ مثنوی آپ کے ملکۂ شاعری کا لوہا ہم جیسے کافروں سے بھی منواتی ہے، بہت ظلم ہوگا اگر آپ اپنے مشاغل میں صنف شعر کی طرف توجہ نہ دے سکیں، اس ملک (ہندوستان) میں جہاں اسلام کو آپ کی ذاتِ بابرکات سے تقویت پہنچتی ہے وہاں اردو بھی منت پذیر شانہ ہے۔

نمونۂ کلام مولانا قاری محمد طیبؒ کی شاعری کو مکمل طور پر سمجھنے اور لطف اندوز ہونے کے لیے ان کے مجموعۂ کلام ''عرفانِ عارف'' کا مطالعہ نہایت ضروری ہے، تاہم یہاں ان کے چند اشعار بطور نمونۂ کلام پیش کیے جاتے ہیں، تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ ان کے یہاں کیسی زبان کیسے کیسے مضامین اور کیسے کیسے قافیے و ردیف کس خوش اسلوبی کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔

سب سے پہلے اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے جس کو پڑھ کر حضرت اکبر الٰہ آبادی نے داد دی تھی، یعنی اسلام کی روانی، دیکھئے یہ نظم اس طرح شروع ہوتی ہے ؎

چلا ارضِ بطحا سے اک بحرِ زاخر ❁ کہ تھا جس کی موجوں کا اول نہ آخر
وہ توحید کی لے بجاتا ہوا ❁ سرودِ حجازی میں گاتا ہوا

وہ جنگل میں منگل مناتا ہوا ❁ وہ شہروں میں شادی رچاتا ہوا
پہاڑوں پہ نعرے لگاتا ہوا ❁ سمندر میں طوفان اٹھاتا ہوا
ضلالت کی پیڑوں کو ڈھاتا ہوا ❁ زمانے میں اودھم مچاتا ہوا
صداقت کے جھنڈے اڑاتا ہوا ❁ وہ باطل کو نیچا دکھاتا ہوا
بتوں سے وہ رشتے تڑاتا ہوا ❁ خدا سے ہر اک کو ملاتا ہوا
اسی کی عبادت سکھاتا ہوا ❁ حضور اس کے سب کو جھکاتا ہوا
جہالت کی رسمیں مٹاتا ہوا ❁ معارف کے ایواں اٹھاتا ہوا
اذانیں زمیں پر دلاتا ہوا ❁ شیاطیں کو دھکے لگاتا ہوا
معاصی کو آنکھیں دکھاتا ہوا ❁ گناہوں کی گردن دباتا ہوا
وہ غیروں کو اپنا بناتا ہوا ❁ لگن اک نئی سی لگاتا ہوا
وہ آنکھوں سے آنکھیں لڑاتا ہوا ❁ دلوں میں ہر اک کے سماتا ہوا
تمدن کے بخئیں جماتا ہوا ❁ مہذب جہاں کو بناتا ہوا
دلوں کو وہ ہمت دلاتا ہوا ❁ وہ روحوں کی قوت بڑھاتا ہوا
دروس حقائق پڑھاتا ہوا ❁ خرافات یوناں بھلاتا ہوا
صدنہائے علمی بہاتا ہوا ❁ گہر ہائے عرفاں لٹاتا ہوا

نواب نظام حیدر آباد دکن نے دار العلوم دیوبند کے طلباء کے لیے سالانہ تقریب عید الفطر اور عید الاضحیٰ پر پانچ سو روپے دینا منظور کیا تھا، اس سے متاثر ہو کر قاری محمد طیبؒ نے ایک نظم "شکریہ نظام دکن" کے عنوان سے کہی، چند اشعار لائق توجہ ہیں۔

بحر راحت کا تلاطم لے چلا سوئے دکن
مژدہ اے دل ہو مبارک تجھ کو شوق انجمن
ہو رہی ہیں نا امیدی پر امیدیں خندہ زن
پھوٹ نکلی ہے افق سے مہر ہمت کی کرن

کیا عجب چشم تصور نے ہے باندھا انتظام
سامنے اک دم میں کر دی درگہہ شاہ نظام
اے کہ عالم میں طراز مسند عظمت ہے تو
از پئے دینِ الٰہی آیۂ رحمت ہے تو
ہستیاں ہیں راحت آمادہ تو تیرے نام سے
اور شرف اندوز ہے دنیا ترے انعام سے

اس نظم کے ابتدائی اشعار ان مذکورہ اشعار سے بھی زیادہ دل چسپ اور زوردار ہیں، یہ اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

اے سرورِ محفل عالم عجب ہے تیری تاب
بحر شادی میں ہے پیدا جزرو مد کا انقلاب
جلوہ پیدا ہے ہر اک ذرہ مثال آفتاب
مدعی ہے آسماں کی یہ زمین خاک ناب
دل کا غوغا ہے کہ لا ساقی مئے ناب سخن
ساغرو مینا ہے خالی اور پیاسی انجمن
رخصت اے ذوق خموشی چھوڑ دے اپنا سماں
دیکھنے دے اب تکلم کی بھی مجھ کو شوخیاں
آسماں آسا ابھر تا ہے مرا عجز بیاں
صورت لے ہوں سراپا اپنی بہجت کا نشاں
شعلۂ سوز الم سے آج میں کو سوں ہوں دور
چھیڑ مت مجھ کو کہ میں ہوں مستِ صہبائے سرور

مولانا قاری محمد طیبؒ نے اپنے زمانۂ طالب علم میں "کوثر العلوم کے عنوان سے ایک طویل نظم کہی ہے، جس میں اکابر دار العلوم کی خدمات بیان کی گئی ہیں اور مسلمانوں

کے انقلابات کی طرف اشارہ کر کے انہیں دین اور تعلیم کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔
یہ نظم اگرچہ زمانہ طالبعلمی میں کہی گئی ہے تاہم اس میں جتنا زور بیان، سلاست وروانی، منظر کشی اور خوبصورت اسلوب نظر آتا ہے اسکو پڑھ کر ایک اچھے قادر الکلام اور استاذ شاعر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، آپ بھی چند اشعار ملاحظہ کیجئے اور اس زبان و بیان سے لطف اٹھایئے ؎

یہ کیسی دھوم ہے باغ جہاں میں آج اے ہمدم
گلوں سے بلبل نالاں گلے ملتی ہے کیوں پیہم
خوشی میں کیوں ترانے گا رہی ہیں قمریاں باہم
برستا ہے یہاں پر ابر رحمت آج کیوں چھم چھم
ہوئے جاتے ہیں گل جامے سے باہر شادمانی سے
ہوئی جاتی ہے بلبل مست اپنی نغمہ خوانی سے
خرام ناز سے باد بہاری آج آتی ہے
بنا کر ہار پھولوں کا چمن میں ساتھ لاتی ہے
چمن میں ہر طرف سے یہ مبارک باد آتی ہے
مبارک ہو بہار بے خزاں گلشن میں آتی ہے
پلا دے ایک ساغر ساقیٔ رنگیں بیاں مجھ کو
تری آنکھوں کے صدقے دے شراب ارغواں مجھ کو
بتا دے عالم اسرار کے راز نہاں مجھ کو
پلا دے وہ مئے عرفاں کہ کر دے بے نشاں مجھ کو
مضامیں کا چلا ہے دل سے اک قلزم رواں ہو کر
مرے عجز بیاں نے سر اٹھایا آسماں ہو کر
تخیل کے ہے سینے میں مضامیں کی فراوانی
تصور کے خزانے میں ہے تصدیقوں کی ارزانی

شاعر آگے چل کر مسلمانوں کی ترقی اور ان کے زوال کی داستان پیش کر رہا ہے، اور اس بات کی وضاحت کر رہا ہے کہ عرب جیسی وحشی قوم نے جب نبی آخر الزماں کو اپنا ہادی اور رہبر تسلیم کر لیا اور ان کی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی گذاری تو اللہ نے انہیں دنیا کی بادشاہت مرحمت فرمائی اور زندگی کے ہر میدان میں انہیں رہبر بنایا اور جب انہوں نے اس سے منھ موڑا تو نامرادی و ناکامی ان کے حصہ میں آئی، دیکھئے اس تاریخی واقعہ کو کس خوبصورت دلچسپ پیرایۂ زبان میں بیان کیا گیا ہے، اشعار ملاحظہ کیجئے۔ ؎

عرب کے وحشیوں کو وہ بتائی رہ تمدن کی
کہ یورپ کے مہذب خوشہ چینی کر گئے ان کی
وہ وحشی قوم جو کل تک کہ خود گمراہ پھرتی تھی
بنی ہے رہنما اللہ اکبر آج عالم کی
غرض اس قوم پر وہ وہ ہوئے الطاف رحمانی
شتر بانی کہ بدلے میں ملی ان کو جہاں بانی
دل و جاں سے رہے جب تک کہ تم اسلام پر شیدا
سروں پر تھا تمہارے نیرِ اقبال کا سایا
مگر مذہب کی پابندی سے جوں ہی تم نے منھ موڑا
تو پھر اقبال نے بھی دوسری جانب کا رخ بدلا
نہ کی جب قدر اس کے نور کی کچھ اہل مشرق نے
طلوع آفتاب ہونے لگا آخر کو مغرب سے
عزیزو تم کہاں پھرتے ہو یوں حیران اور ششدر
ہے ٹھانی تم نے دل میں کیا بھروسہ ہے تمہیں کس پر
ترقی ڈھونڈتے پھرتے ہو کیوں غیروں کے برتے پر
نہ پہنچائے گا کیا اسلام معراج ترقی پر

تلاش آب حیواں میں کہاں جا کر بھٹکتے ہو
وہ ہے ریگِ رواں جس کو کہ تم پانی سمجھتے ہو
کمائی دولت دنیائے دوں بدخواہ دیں ہو کر
ڈسے گی یہ ترقی تم کو مار آستیں ہو کر
عبث تم چھوڑ کر اسلام کو پھرتے ہو یوں در در
اگر دنیا ہی ہاتھ آئی تو تف ہے اس ترقی پر
نہ لی تم نے صفت غیروں سے پابندیٔ مذہب کی
اسی کو چھوڑ بیٹھے بات تھی جو اصل مطلب کی
تمہارے دل کو بھائی ہے ادا غیروں کے مشرب کی
چھوا عقرب کو لیکن کی نہ پروا نیش عقرب کی
ستم ہے نور کو اندھیر ظلمت کی ضیاء سمجھے
پڑیں پتھر اس اوندھی عقل پر سمجھے تو کیا سمجھے
تمہاری عقل کا یہ پھیر ہے سوچو تو تم اتنا
زمانہ کب یہ کہتا ہے کہ مذہب چھوڑ دو اپنا
سلف نے وہ کیے تھے عزت و جاہ حشم پیدا
کہ یورپ خواب میں بھی اس ترقی کو نہ دیکھے گا
نئی تہذیب کی ان کو ذرا بو تک نہ پہنچی تھی
ذرا سوچو تو پھر کیسے ترقی ان کو حاصل تھی
اطاعت کیا نہ کرتے تھے سلاطین زماں ان کی
نہ تھی کیا کرسی اقبال رشک آسماں ان کی
ہمیشہ راہ پر رہتا تھا کیوں سارا جہاں ان کی
فرشتے چومتے تھے کیوں زمین آستاں ان کی

سبب یہ تھا کہ وہ اسلام کے ،اسلام تھا ان کا
بجز مذہب کی خدمت کے نہ کوئی کام تھا ان کا

دنیائے تصوف کے مشہور بزرگ اور صوفی منصور حلاج نے انا الحق کہا تھا اور اس کی وجہ سے انہیں سولی پر چڑھا دیا گیا، کیونکہ شریعت کا یہی فتویٰ تھا، اس سلسلے میں صوفیا کا ایک طبقہ کہتا ہے کہ منصور حلاج عشق حقیقی کی ایسی منزل پر پہنچ گئے تھے جہاں دوئی کا تصور ختم ہو گیا تھا، اور عالم وارفتگی میں ہونے کی وجہ سے ایسا جملہ ان کے منہ سے نکل گیا، وہ بے قصور تھے اور سولی غلط دی گئی تھی، دوسرا طبقہ کہتا ہے کہ گرچہ ان پر وارفتگی کی کیفیت طاری تھی تاہم عشق کی بہت منزلیں ہوتی ہیں، سب سے اہم اور اعلیٰ منزل یہ ہے کہ عاشق کی زبان سے اس کا اظہار نہ ہو اگر زبان سے اس کا اظہار کر دیا تو عشق ہی کہاں رہا۔ دیکھئے شاعر اس مضمون کو کس خوش اسلوبی سے اور منطقیانہ استدلال کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ ؎

اے نوا سنج انا الحق ترا کہنا تھا بجا ❁ پر نہیں پاس ادب عشق میں دعویٰ ہونا
ہے انا عشق میں اک راز درونِ پردہ ❁ پر نہیں راز کا حق ، راز کا افشا ہونا
عشق خود دار ہے خودراز درون عشاق ❁ عشق کی خامی و رسوائی ہے لب وا ہونا
اپنے آپے میں خودی ہو تو خودی ہے ورنہ ❁ اپنے آپے سے گذرنا ہی ہے رسوا ہونا
غیرت عشق ہے اسرار خودی ہوں خاموش ❁ نہ کہ اسرار خدا تک سے بھی گویا ہونا
دیکھ کر مہر کو اپنے میں نظر آئے جو مہر ❁ یہ نظر ہی نہیں، آنکھوں کا ہے خیرا ہونا
نعرہ سنجی انا حق سہی لیکن پھر بھی ❁ شرط انصاف ہے انصاف سے گویا ہونا
ہے انا حسنِ نوا بحر بقطرہ ہو اگر ❁ پر نہیں اس کا محل قطرہ بدریا ہونا

قاری محمد طیبؒ کے ایک صاحب زادے محمد اعظم ۱۹۶۵ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے، اس زمانہ میں مولانا نے ایک طویل نظم لکھ کر بھیجی، جو پند ونصیحت پر مشتمل ہے اور جس میں علم کی تعریف، فضیلت اور اس کی عظمت کو بیان کیا ہے، یہ نظم بڑی خوبصورت ، پر معنی، حکیمانہ، اور نصیحت آموز ہے، دیکھئے زندگی اور علم کا مقابلہ کس

خوش اسلوبی کے ساتھ کر رہے ہیں، اور بتا رہے ہیں کہ زندگی فنا ہو جاتی ہے، لیکن علم باقی رہتا ہے، اور اس کو دوام حاصل ہے۔ ؎

زندگانی سِل ہے گویا برف کی ❁ جو پگھلتی رہتی ہے لیل و نہار
ہاں دوامِ زندگی ہے علم سے ❁ علم ہی دنیا میں ہے دائم بہار
انقلاب دہر سے بالا ہے علم ❁ علم کے محکوم ہیں لیل و نہار
علم ہی پر چل رہے ہیں رات دن ❁ جہل سے ممکن نہیں یہ نظم کار
انقلاب آتے ہیں سب معلوم پر ❁ علم رہتا ہے ہمیشہ بے غبار
آمد و شد ہو نفس کی یا نہ ہو ❁ موت ہو یا ہو حیات مستعار
خندہ زن ہوں گل کہ شبنم گریہ زن ❁ ہو خزاں گلشن میں یا آئے بہار
شہر اجڑیں یا بسیں یا کچھ بھی ہو ❁ ہوں وہ ویراں یا رہیں باغ و بہار
بادشاہی ہو کہ محکومی کا داغ ❁ ہو غلامی یا ہو زور و اقتدار
آسماں ہل جائے ٹل جائے زمیں ❁ جوش پر دریا ہوں یا ہوں شعلہ بار
کچھ بھی ہو ہر حال میں یکساں ہے علم ❁ وہ نہیں ہرگز تغیر کا شکار
آئے لاکھوں اور گئے لاکھوں بشر ❁ علم پر اپنی جگہ ہے برقرار
زندگی نعمت ہے لیکن علم سے ❁ جاہل انساں ہے حقیقت میں حمار
زندگی نعمت ہے لیکن بے ثبات ❁ علم سے ہے تا ابد اور برقرار
علم ہے معیار اخلاق کمال ❁ علم ہی ہے نوع انساں کا ابھار
علم ہی ہے نور افزائے حیات ❁ علم ہی سے زندگی کا ہے وقار
علم ہی دارین میں وجہ نجات ❁ علم ہی آسودگی کا ہے شعار

آگے چل کر علم کا مقصد بیان کرتے ہیں اور اس کی افادیت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔ ؎

علم وہ ہے جس سے ہو حق سربلند ❁ اور باطل سرنگوں و شرمسار

علم وہ ہے جس سے حق آئے نظر ❁ جس سے باطل محو ہو یا بے وقار
علم ہے سرمایہ دار زندگی ❁ زندگی بنتی ہے ہے جس سے آبدار
علم سے آتی ہے سرافگندگی ❁ علم نافع ہے جمال زندگی
علم وہ ہے جس سے ہو خوف خدا ❁ خوف وہ ہے جس سے ٹپکے بندگی
علم وہ ہے جس سے ہو تہذیب نفس ❁ علم ہی کیا گر نہ سنورے زندگی
علم کا مقصد ہے اخلاق و عمل ❁ علم کی غایت صلاح زندگی
علم کیا ہے؟ اسوۂ پیغمبری ❁ پیروی ہو تب ہے صالح زندگی
علم نافع جذبۂ حسن عمل ❁ زندگی کی ہے یہی تابندگی

مولانا قاری محمد طیبؒ کے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حضرت اکبرالہ آبادی کی شاعری سے زیادہ متاثر تھے، اسی وجہ سے ''عرفان عارف'' میں کئی نظمیں ایسی ملتی ہیں جو حضرت اکبرالہ آبادی کی شاعری سے متاثر ہوکر اسی زمین اور اسی بحر میں قافیہ و ردیف بدل کر کہی گئی ہیں، مثال کے طور پر اکبرالہ آبادی نے ایک قطعہ کہا ہے۔؎

دنیا نے کہا کہ کیسے چپکوں   عورت نے کہا کہ گوند ہوں میں
چندا نے کہا کہاں سماؤں   کالج نے کہا کہ توند ہوں میں

دیکھئے قاری صاحب نے اس قطعہ سے متاثر ہوکر اسی زمین اور اسی بحر میں ایک دوسری نظم کہی، جس میں مذہبی رنگ پیدا کر دیا ہے اور نظم کو بھی بڑا دلچسپ بنا دیا ہے، نظم ملاحظہ ہو۔

عصیاں نے کہا کدھر سے آؤں ❁ شہوت نے کہا راہ ہوں میں
فتنے نے کہا کہاں پہ اتروں؟ ❁ غصے نے کہا پناہ ہوں میں
ذلت نے کہا کہ کیسے تاکوں ❁ نخوت نے کہا نگاہ ہوں میں
دولت نے کہا کھپوں کہاں میں ❁ بولی یہ ہوس کہ چاہ ہوں میں
شیطاں نے کہا جموں میں کیونکر ❁ عورت نے کہا نباہ ہوں میں

طغیاں نے کہا مرا سہارا ❁ دولت نے کہا کہ شاہ ہوں میں
ایماں نے کہا بچوں میں کیونکر ❁ نیکی نے کہا سیاہ ہوں میں
فطرت نے کہا کہاں ہے عزت؟ ❁ تعلیم بڑھی کہ جاہ ہوں میں
عزت نے کہا کہاں سے ابھروں ❁ بولا یہ عمل کہ راہ ہوں میں
ملت نے کہا کہ میں ہوں بد حال ❁ کوشش نے کہا رفاہ ہوں میں

لسان العصر حضرت اکبرالہ آبادی نے ایک دوسری جگہ کہا تھا۔ ؎

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے ❁ یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی ❁ وہ فقط وقت کا گذرنا ہے

اس قطعہ میں دنیا کی زندگی اور اس کے حالات کو ناقابل التفات ٹھہرایا گیا ہے جو اپنی جگہ بالکل درست ہے لیکن یہاں مقصد کا پتہ نہیں جس کے لیے ان حالات کو ناقابل توجہ قرار دیا گیا ہے اس کے علاوہ بعض حالات دنیا بیان ہونے سے رہ گئے ہیں، مولانا قاری محمد طیبؒ نے اس زمین اور اسی بحر میں مزید اشعار کہے ہیں جو بطور تتمہ۔ وہ اشعار یہ ہیں۔ ؎

رہ گیا عز و جاہ کا جھگڑا ❁ یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے
قابل ذکر بھی نہیں خورد و نوش ❁ یہ بہیمی کی خو سے لڑنا ہے
مقصد زندگی ہے طاعت حق ❁ نہ کہ فکر جہاں میں پڑنا ہے

آخر میں ''آنکھ کی کہانی'' والی نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے جو قاری صاحب کی تمام نظموں میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور طویل بھی ہے، اس نظم میں آنکھ کی تخلیق، اس کی افادیت، حکمت و مصلحت، آپریشن کے آغاز و اختتام اور اس کے مختلف مراحل بڑے خوبصورت اور دلچسپ شاعرانہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں، پھر اس کے لیے نیا اسلوب اور نئے قوافی و ردیف استعمال کیے گئے ہیں، جس سے شاعر کی شاعرانہ عظمت میں چار چاند لگ جاتا ہے، یہ نظم حمد و نعت سے شروع ہوتی ہے، دیکھئے اس میں بھی آنکھ ہی کی نعمت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ؎

مستحق حمد و ثنا کا ہے خدائے وہاب
جس نے دی آنکھ ہمیں، آنکھ کو دی نور سے اب
کھو لدی چشم بصارت بجمال ظاہر
جس سے ممتاز نگاہوں میں ہیں خواب اور خراب
دل کو دی چشم بصیرت بکمال باطن
جس کی رو سے متمیز ہیں خطا اور ثواب
ساری تعریفیں ہیں اس رب دو عالم کے لیے
جس نے بینائی کی آنکھوں میں ہے رکھی تب وتاب
نعت و توصیف ہے اس ذات مقدس کے لیے
دل کی بند آنکھ کے جس ذات نے کھولے ابواب
ختم جس ذات پہ ہے عین نبوت کا کمال
خوشہ چیں جن کے ہیں انسان و ملک اور دواب

آگے آنکھ کی افادیت کے مختلف پہلوؤں پر نہایت خوبصورتی کے ساتھ اس طرح پیش کرتے ہیں۔ ؎

آنکھ قائم ہے تو ہے لذت رنگ و صورت
نہ رہے باقی تو موعود ہے جنت کا ثبوت
ہو کھلی آنکھ تو اس سے ہے ظہور اعیاں
اور ہو بند تو ہے زیر نظر عالمِ خواب
آنکھ کھل جائے تو بھر پور رہے بجلی دل پر
نیم وا ہو تو بھری اس میں ہے مستی شراب
آنکھ نیچی ہو تو ہے نور حیا کا چشمہ
اور اٹھ جائے تو ہے نارِ فروزان عتاب

آنکھ پھر جائے تو ہے شعلۂ نفرت کی بھڑک
اور بھر آئے تو ہے بارش رحمت کا سحاب
آنکھ ترچھی ہو تو پھٹ جائے فضائے پیشیں
اور سیدھی ہو تو سیدھا ہے جہان اسباب
آنکھ گر امن پسند ہے تو ہے دل بھی آزاد
آنکھ لڑ جائے تو پھر دل ہے گرفتار عذاب
آگئی آنکھ تو کہتے ہیں کہ بیمار ہوئی
اور نہ آئی تو سمجھتے ہیں صحیح اور صواب
چشم حق بیں ہو تو ہے نافع دین و دنیا
چشم بد بیں ہو تو دارین کا خسران و عذاب
آنکھیں دو ہیں تو وہ ہیں کاشف الوان جہاں
چار ہوجائیں تو ہیں سر محبت کا نقاب

آنکھ کے آپریشن کے مختلف نازک مرحلے ہوتے ہیں ان سب مراحل اور کیفیات کا چند اشعار میں احاطہ کرنا نہایت مشکل کام ہے، لیکن دیکھئے شاعر نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ان کا احاطہ کس طرح کیا ہے، چند اشعار ملاحظہ کیجئے اور شاعر کی قادر الکلامی کا اندازہ کیجئے، فرماتے ہیں۔ ؎

ہاں خلاصہ اگر احوال کا ہو پیش نظر
مختصر طور سے ہیں اس کے ہیں یہ کل سات ابواب
دس منٹ کا ہے عمل آنکھ کے اپریشن کا
ہے یہ اس منزل مشکل کا اہم پہلا باب
چت پڑے رہنا ہے چھ گھنٹے پسِ اپریشن
ان مراحل کا اہم تر ہے یہی دوسرا باب

ساتویں گھنٹہ میں ملتی ہے کمر کو کروٹ
جو کہ اس مدت احوال کا ہے تیسرا باب
پانچویں روز میں ہے اذن نشست و برخاست
جو کہ اس قیصرِ مہمات کا ہے چوتھا باب
چار پائی پہ سوار آنکھ پہ پٹی ہو چڑھی
بارہ دن تک کی ہے یہ قید رواں پانچواں باب
ہاں اسی کا یہ تتمہ ہے کہ جب پٹی کھلے
آنکھ کے چہرے پہ چڑھ جائے جب ہی سبز نقاب
تین دن زخم کے ٹانکوں کی برآمد کے ہوئے
اس مداوا کی منازل کا چھٹا ہے یہ باب
اس سے اک ماہ کے بعد آتا ہے چشمہ کا مقام
سہل تر سارے مراحل کا یہ ہے ساتواں باب
آپریشن کے مہمات کی تلخیص ہے یہ
سات ابواب کا ہے ڈیڑھ مہینے کا نصاب

فارسی نظم

مولانا قاری محمد طیبؒ نے اردو نظموں کے علاوہ فارسی نظمیں بھی کہی ہیں جو کل ۱۴ ہیں اور ان کے اشعار کی تعداد ۴۳۳ ہے، یہ نظمیں بارگاہ نبوت میں فریاد، فکر حزیں، آہ دردمنداں، استقبال مجاہد، یاد رفتگاں، ہست و نیست اور موعظت و ذکریٰ کے عنوان پر مشتمل ہیں، ان نظموں میں واقعہ نگاری، منظر کشی، جذبات کی ترجمانی زبان کی صفائی وسادگی اور دلکشی و رعنائی پورے طور پر نظر آتی ہے۔

انگریزوں نے مولانا حسین احمد مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ کو ہندوستان کی تحریک آزادی میں حصہ لینے کی وجہ سے قید کر کے احمد آباد جیل بھیج دیا تھا، جب وہ جیل سے رہا ہو کر دیوبند پہنچے تو عمائدین شہر کی طرف سے ایک شاندار استقبالیہ دیا گیا اس موقعہ پر مولانا

قاری محمد طیبؒ نے استقبالیہ مجاہد کے عنوان سے ایک طویل نظم پڑھی، چند اشعار ملاحظہ کیجئے اور لطف زبان اٹھایئے۔ ے

با ممدوح کریمے کہ زممد حیٔ خویش ❁ از ثنائش ہمہ ترساں و گریزاں آمد
چہ کنم مدح عزیزے کہ زتسلیم و رضا ❁ مدح و ذم درنظرش واحد و یکساں آمد
شکر معبود بجا آرم و شاداں گویم ❁ از رہ فضل خدا یوسف زنداں آمد
پیکر صبر و رضا رہ گرِ اخوان صفا ❁ یوسف راہ وفا باز بکنعاں آمد
اسم سامیش حسین است و مسمّٰی حسن است ❁ روح تکبیر بہ تصغیر چہ پنہاں آمد
نیک مردے ست کہ سرمست شہادت بینم ❁ ہم حیاتش ہمگی ظلّ شہیداں آمد
اے تو عیسیٰ قدمی زانکہ ہمیں خطۂ ہند ❁ بود صحرا ز قدوم تو خیاباں آمد
راہ محمود سپر دی ہمہ محمود شدی ❁ باد فرخندہ ترا شاں کہ درخشاں آمد
برتش افگندہ اگر قید باایں مرد قوی ❁ روبہے اوست بہ شیران نیستاں آمد
مردے از جیل بروں آید و کارے بکند ❁ ملکے بود کہ در صورت انساں آمد

۳ر اگست ۱۹۶۲ء کو ڈربن (جنوبی افریقہ) میں ایک نعتیہ مشاعرہ منعقد ہوا جس میں مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ نے اپنا نعتیہ کلام پیش کیا، اس کلام میں شاعر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و کمالات بیان کرنے کے بعد امت مسلمہ کی زبوں حالی اور پریشانی تحریر کی ہے، اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دعاء کے لیے درخواست کی ہے، دیکھئے مندرجہ ذیل اشعار میں کس قدر وارفتگی، تڑپ اور بے چینی کا اظہار پایا جاتا ہے۔ ے

اے رحمت و غیرت مجسم ❁ حاضر بتو قوم دست بستہ
وقت است کہ خہ بر آب آئی ❁ باشد کی بما کرم نمائی
بر خیز زلطف خویش برخیز ❁ اے آنکہ بما رحیم بر خیز
دشمن زچہار سو بر آمد ❁ محصور بہ فتنہ ہیم بر خیز

یک گوشہ زچشم ہیبت انداز ❁ یک لحظہ نگاہ رعب انگیز
رحمے کہ شکستہ اہم و ناشاد ❁ مائیم و فسانۂ الم خیز
ابریست محیط تیرہ و تار ❁ آبست ز ابر آبرو ریز
یک قطرہ بحر فضل و فیضت ❁ ما خشک لباں و آتش تیز
دلہا ز فسوق شد شب تار ❁ یک خندہ ز عالم سحر خیز
برخیز کہ خالی انجمن شد ❁ بے برگ و ثمر ہمہ چمن شد

مہاراجہ شیر سنگھ والی ریاست اندر گڑھ (رجپوتانہ) کے سال گرہ کے موقع پر مولانا قاری محمد طیبؒ، مولانا محمود رائپوری وزیر ریاست کے ساتھ ان کے دربار میں حاضر ہوئے اس موقعہ پر قاری محمد طیبؒ نے مندرجہ ذیل قصیدہ سال گرہ کی تہنیت کے طور پر پیش کیا جس کو سن کر مہاراجہ شیر سنگھ نہایت خوش ہوئے۔ اس قصیدہ میں شاعر نے اپنا تخلص "عارف" استعمال کیا ہے چند اشعار حاضر خدمت ہیں۔ ؎

باغ و راغ است خوش طرب گاہے ❁ صرف دید است ہر حق آگاہے
روز بازار عشرت و شادی ست ❁ فرح بخش است برگ ہر کاہے
سبزہ استادہ چوں پیادہ بخاک ❁ گل نشستہ بہ تخت چوں شاہے
چوں نہ خرم شود جہاں بہ جہاں ❁ بود از دہر چشم بر راہے
از پئے روز جشن سالگرہ ❁ رائے را کز علوست جم جاہے
نام او شیر سنگھ و شیر فلک ❁ از نہیبش برنگ روباہے
شیر مردے کہ از شجاعت او ❁ در دہنہا فتادہ افواہے
پہلوانے کہ گشت کوہ ربا ❁ وقت ذکر جلا و تش کاہے
شہ سوارے کہ گنبد گردوں ❁ بہر یکراں او ست خرگاہے
شاطرے کش پیادہ در عرصہ ❁ اسپ و خرزیں نہادہ چوں شاہے
مہربانے کہ مثل درگاہش ❁ ما من خلق نیست درگاہے

از کمال کرم بدر گاہش ❁ نیست معمول عرض در خواہے
دیدن او ست دیدن مامول ❁ ہست در خواہ روئے در خواہے
خلق را در زمانِ میمونش ❁ ماہ عید است ماہ ہر ماہے
رشک صبح وطن بود ایں جا ❁ گر غریبے رسد بہ بے گاہے
در جہاں تا خوش است عارف داد ❁ تاز بو نست ظلم جاں کاہے
رائے ما شاد باد و بد خواہش ❁ پیش کوہ شکوہ او کاہے
مثل ایں جشن نیز میموں باد ❁ ماہ ہر سال و روزہ ہر ماہے

❁❁❁

قاری صاحبؒ کا ذوق شعر گوئی

از: مولانا ابوالقاسم صاحب نعمانی بنارس

شاعری اظہار مافی الضمیر اور ترسیل و ابلاغ کا ایک موثر ذریعہ ہے، شعر کی اثر آفرینی اور کارفرمائی کا مشاہدہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، خواہ بزم نوحہ و ماتم کی نوا سنجی ہو یا محفل عیش ونشاط کی زمزمہ خوانی، معرکۂ کارز ... ی رزمیہ شاعری ہو یا دربار سلاطین کی قصیدہ نگاری؛ ہر موقع پر شاعری کی ساحرانہ قوتوں نے اپنا لوہا منوایا ہے، ہر کلام کی طرح شعر بھی اپنے مضامین اور مشمولات کے اعتبار سے خیر اور شر کے ذروں میں تقسیم ہوتا ہے، اسی کو زبانِ رسالت نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ " الشعر کلام حسنهٗ حسن و قبحهٗ قبح " یعنی شعر بھی ایک کلام ہے اچھا ہے تو اچھا اور برا ہے تو برا۔ اگر ایک طرف قرآن پاک نے والشعراء یتّبعهم الغاوٗون ، اَلَمْ ترَ انّهُمْ فِی کُلِّ وادٍ یّهیمُوْن، وَ انهم یقو لو ن ما لا یفعلون ، کہہ کر شعرا کے بارے میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ یہ صرف خیالی گھوڑے دوڑانے والے اور گفتار کے غازی ہیں۔ ان کی گفتار اور کردار میں یکسانیت نہیں ہے تو دوسری طرف رسولِ اکرم ﷺ نے اِنّ مِنَ الشعر حکمۃً کی سند دے کر اچھے اشعار کو ایک مقام عطا فرما دیا ہے، شاعر رسولؐ حضرت حسان بن ثابت، حضرت علی بن ابی طالب، اور عبداللہ بن رواحہ کی پاکیزہ شاعری نے اسلامی علوم ومعارف کے اندر اپنا ایک منفرد مقام بنایا ہے، مولانا روم کی مثنوی، شیخ سعدی کے اخلاقی منظومات، شیخ فریدالدین عطار کا پند نامہ آج بھی وعظ وتذکیر میں اپنا خاص اثر رکھتا ہے، مولانا حالی کی مسدس، علامہ اقبال کا شکوہ جواب شکوہ اور مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی سیدھی سادھی نظمیں اپنا خاص اثر رکھتی ہیں، ملک کی آزادی میں انقلابی نظموں اور حریت پسندانہ ترانوں نے جو

کردار ادا کیا ہے اس کا اعتراف ہر انصاف پسند کو ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہندوستان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور تجدید دین کے لیے ـــــ علماء دیوبند کا انتخاب فرمایا تو ان کو علوم اسلامیہ کی گیرائی و گہرائی اور ملکۂ تحریر وتقریر کے ساتھ شعر گوئی کی بھرپور صلاحیت سے بھی نوازا، سرخیل جماعت دیوبند حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی، قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، فقیہ الامت مولانا رشید احمد گنگوہی، سراج الملت مولانا سراج احمد رشیدی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب، استاد العلماء حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی سے لے کر محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیری، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب دیوبندی علیہ الرحمۃ والرضوان تک، قادر الکلام، پاکیزہ شعری ذوق کے ماہرین کا ایک تسلسل ملتا ہے، مذکورہ بزرگوں نے شعر گوئی کو کبھی اپنا مشغلہ نہیں بنایا لیکن جس نے شعری زبان میں جب بھی لکھا ان بزرگوں کی عربی، فارسی اور اردو شاعری فن شعر گوئی کے لیے سرمایہ افتخار ہے۔

حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ صاحب قاسمی بھی جہاں ایک بلند پایہ خطیب اور منفرد انداز نگارش کے حامل وسیع النظر مصنف تھے وہیں ایک قادر الکلام اور زود گو شاعر بھی تھے، اگرچہ خطابت اور تحریر کی طرح ان کے اس وصف کو شہرتِ عامہ حاصل نہ تھی۔

حضرت قاری صاحب نے عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے۔

ان کے کلام کا بیشتر حصہ "عرفان عارف" کے نام سے ان کے منجھلے صاحبزادے مولانا محمد اسلم رمزی کی ترتیب وتزئین کے ساتھ مکتبہ قاسمی دیوبند سے شائع ہو چکا ہے، اس میں "آنکھ کی کہانی" کے دونوں حصے بھی شامل ہیں اور حضرت قاری صاحب کا شعری کلام ساز امکانی بھی شامل ہے جو جمادی الاول ۱۳۳۵ھ کا ماہنامہ "القاسم" دیوبند میں شائع ہوا تھا، یہ حضرت قاری صاحب کی عمر کا وہ دور تھا جب وہ صاحب زادہ محمد طیب سلمہٗ کہے جاتے تھے، اس نظم کے مضامین اور انداز نگارش سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ شعر گوئی کا جوہر ان کے اندر عنفوانِ شباب ہی سے تھا۔

یہ مجموعہ کلام ۱۹٦۷ء میں شائع ہوا ہے اس لیے اس میں ٦۷ء تک کا ہی کلام درج ہے، آپ کے مجموعۂ کلام میں ہم کو حمدِ الٰہی، نعت رسالت پناہی، سپاس وتشکر، استقبالیہ نظمیں، مرثیے، تہنیت، اور مختلف علمی موضوعات پر مختصر اور طویل نظمیں ملتی ہیں، ساتھ ہی بعض نظمیں فکاہیات سے متعلق ہیں لیکن کوئی کلام بعنوانِ غزل نہیں ملتا، اس کی وجہ ان کے مجموعۂ کلام کے مرتب اور ناشر مولانا محمد اسلم صاحب رمزی کے الفاظ میں درج ذیل ہے۔

"آپ کی شاعری شوق شعر گوئی کے بجائے واقعات وحادثات کے ذہنی تاثر، حقیقی جذبات اور تبادر ذہنی پر مبنی ہے، ان تمام نظموں کے محرکات جماعت دیوبند یا اپنے خاندان میں پیش آنے والے اہم واقعات وتقریبات یا حادثات ہیں جن سے متاثر ہو کر جذبات نے جامۂ شعر اختیار کر لیا، یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام اشعار میں تصنع اور پرکاری کے بجائے سادگی وسلاست اور خلوص وجذبات ہیں، یہی ان اشعار کی سب سے بڑی خصوصیت اور دلکشی ہے اور یہی بنیاد حضرت مدظلہٗ کی صنفِ غزل سے عدم دلچسپی کی ہے، جس کی تعبیر محض نزاکت تخیل اور ندرتِ اظہار و بیان پر ہے، واقعات وحوادث سے متاثر ہو کر سادگی کے ساتھ اپنے جذبات کی عکاسی میں حضرت مدظلہٗ کا کلام نزاکت تخیل کے بجائے متصوفانہ رنگ سے رنگین ہے جس نے عرفان عارف کے بجائے معنوی لحاظ سے بھی اس کا صحیح تر مصداق بنا دیا ہے۔ (پیش لفظ عرفانِ عارف)

صنفِ غزل سے عدم دلچسپی کے باوجود آپ کو اس صنف میں بھی دستگاہ حاصل تھی، اس کا اندازہ آپ کے متعدد قصائد کے ابتدائی تشبیبی اشعار سے ہوتا ہے۔

مثلاً اپنے والد ماجد محمد احمد صاحب مہتمم خاص دار العلوم دیوبند کی حیدر آباد سے واپسی کے موقع پر سپاس تہنیت واختصاص کے نام سے جو نظم لکھی ہے اس کے ابتدائی اشعار یوں ہیں۔۔ ؎

آج میں بزم تصور میں جو فانوسِ خیال
کر کے روشن ہوا نظارگیٔ شاہدِ حال

دیکھتا کیا ہوں کہ ہے خانہ بر انداز تماں
ہمہ تن ناز و کرشمہ ہمہ تن غنج و دلال
زلف اس کی وہ بلا جس سے خطا ہو نادم
چال اس کی وہ غضب جس سے ہوں فتنے پامال
ناز و انداز اس انداز کے جن کا انداز
ہند سے کی بھی ہو میزانِ تصور میں محال
بانکپن وہ کہ کرے کبک دری کو حیراں
غمزہ ایسا کہ کرے نرگسِ رعنا کو نڈھال
میں نے جس وقت یہ رنگ اس کا نرالا دیکھا
پوچھا کیا طرز ہے یہ آج تری حور شمال
ہیں ادائیں تری کیوں آج سراسر رنگیں
کیوں انوکھے ہیں ترے ڈھنگ نئی ہے کیوں چال
کس لیے آج پریشاں نہیں زلفیں تیری
آج طرّہ کے نہیں تیرے شکستہ کیوں بال
تیری قامت سے ہے کیوں آج ٹپکتی شوخی
چال سے آج لرزتا ہے تری کیوں بھونچال
گلشنِ حسن ہے کیوں آج سراسر دلکش
کس لیے آج ہے دلچسپ گلستانِ جمال
سن کے یہ بات کہا اس نے چڑھا کر چتون
دعویٔ فہم و خرد اور جہالت کا یہ حال
کر بہارِ چمنِ دیں کا نظارہ تو ذرا
تاکہ باقی نہ رہے اس میں تجھے کچھ اشکال

غزل کے لیے ندرت، اظہارِ بیان، نزاکتِ خیال اور دل نشیں استعارات وتشبیہات کی جو جو ترکیبیں مطلوب ہیں وہ ہمیں ان تشبیبی اشعار میں ملتی ہیں، لیکن تشبیب کے بعد جب اصل مضمون کی طرف گریز ہوتا ہے تو اس میں حضرت قاری صاحب کی طبعی نکتہ آفرینی اور دقیقہ سنجی اس طرح نمایاں ہو جاتی ہے کہ واقعتاً وہ ایک عارف کا کلام محسوس ہوتا ہے۔

قاری صاحب کے کلام میں سب سے طویل اور مسلسل نظم "آنکھ کی کہانی" ہے، یہ نظم دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلی نظم میں دائیں آنکھ کے آپریشن کے موقعہ پر جنوری ۱۹۶۳ء میں آئی گاندھی اسپتال علیگڈھ میں بستر علالت پر دراز رہتے ہوئے املا کرائے، یہ نظم تقریباً ڈھائی سو اشعار پر مشتمل ہے، اور دوسری نظم دوسری آنکھ کے آپریشن کے بعد دسمبر ۱۹۶۴ء میں اس عالم میں نظم کی گئی جو پہلی نظم سے بہت طویل ہے، دونوں نظمیں تقریباً سات سو اشعار پر مشتمل ہیں اور "آنکھ کی کہانی" کے نام سے علیحدہ کتاب کی شکل میں شائع بھی ہو چکی ہیں، کہنے کو تو یہ آنکھ کی کہانی ہے لیکن اپنے مشمولات کے لحاظ سے بلند پایہ علمی اور عرفانی مضامین پر مشتمل ہیں جن کا اندازہ نظم کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے، کمال یہ ہے کہ پوری نظم میں ایک ہی قافیہ بندی کی گئی ہے۔

اس نظم پر ہندوستان کے مشہور صاحب طرز ادیب مولانا عبد الماجد صاحب دریا آبادی نے اپنے مکتوب میں جن تأثرات کا اظہار فرمایا ہے وہ قاری صاحب کے ملکہ شعر گوئی کے لیے سند کا مقام رکھتی ہے، موصوف اپنے خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

حضرت محترم!-----------------السلام علیکم

"آنکھ کی کہانی" آں محترم کا عطیہ یہاں آتے ہی پڑھ ڈالی، سبحان اللہ، ماشاء اللہ مجھے علم نہ تھا کہ آپ کو شعر و نظم پر بھی اس درجہ قدرت حاصل ہے۔ ذالك فضل الله۔

کیا کیا قافیے نکالے ہیں کیسا کیسا مضمون باندھا ہے کہ پیشہ ور شاعروں کے بھی چھکے چھوٹ جائیں، نہ اتنی طویل نظم میں کہیں آورد، بس آمد ہی آمد۔ خوش دماغ تو بحیثیت ایک

سچے قاسم زادہ کے آپ تھے ہی، اب معلوم ہوا کہ خوش فکر بھی اسی درجہ کے ہیں (ماشاء اللہ)

دعا گو و دعا جو: عبدالماجد دریابادی / ۱۵ر دسمبر ۱۹٦۴ء

اردو کی طرح آپ کو فارسی کلام میں بھی کامل دستگاہ حاصل تھی، آپ کے مجموعۂ کلام میں متعدد فارسی نظمیں اور متفرق اشعار موجود ہیں، ان کی نظم ''خروش جگر'' کا پہلا بند جو درج ذیل ہے فارسی کلام کا ایک بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے، یہ نظم حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری کی وفات پر لکھی گئی ہے، ملاحظہ ہو۔ ــ

سراپا سوزشِ عشقم، سراپا چشم گریانم ❁ طلاطم ہائے بے پایاں ببیں در موج طوفانم
نہ امیدے بدل دارم بہ فیض نا امید یہا ❁ نہ حرماں آرزو دارم کہ خود تصویر حرمانم
زہستی صورتے دارم ہیولائش عدم باشد ❁ زسوز برق تکوینم زبرقِ سوز امکانم
کجا دل چوں زدل ارماں دل از دست بیروں شد ❁ شہ عبدالرحیم رائے پوری بود ارمانم
نہ تنہا رفت آں جانِ جہاں از عالم خاکی ❁ رواں شد از پسِ او حسرت وامیدوارمانم
بہ بیں در بے سروسامانی من صورت ساماں ❁ فغان وگریہ و سوز گدازو آہ سامانم
بمرات دلم تصویر جاناں جلوہ آرا شد ❁ ببیں اعجازِ الفت در دلِ آخر مسیحا شد

اسی طرح فکر حزیں کے عنوان سے جو فارسی نظم کہی گئی ہے اس میں دارالعلوم دیوبند اور بانیانِ دارالعلوم کے بارے میں فرماتے ہیں۔

ہمیں گلشن کنوں کو رشکِ ہند است ❁ ہمیں دار العلوم دیوبند است
بمرغانِ چمن فضلش ہویدا ❁ چمن اندر چمن بارانش پیدا
بہر ہر مرغ گوید کہ اُعطِی ❁ فانّی قاسم و اللہ یُعطی
بماہ ہند آمد ضوءِ ایں مہر ❁ بر اعدائے چنیں مہرے شود قہر
بارض ہند بیشک آں فلک ہست ❁ بچشمِ ہند انسانش ملک ہست
بذاتِ بانیش رحمت بباری ❁ بہ قربِ رحمت جانش در آری
بہر سو دین برحق زاں علم شد ❁ حکایتہائے شرک وکفر کم شد

جہادِ کر دہٗ و دیں را فزودہ ❁ کہ شرک و کفر از عالم ربودہ
بہم ایمان و دیں از بس رسیدند ❁ زنورش کفر و بے دینی رمیدند
محمد قاسم الخیرات ذی شاں ❁ گرفتہ دینِ برحق رونقے زاں

اس نظم کے اخیر میں دعائیہ اشعار کے ذیل میں فرماتے ہیں۔

خدا وندا بایں مر دانِ میداں ❁ کنی انجام من بر خیر و احساں
بکامِ نفسِ خود مشغول ہستم ❁ زیاد و ذکر تو معزول ہستم
زمانہ شد بعیش و کا مرانی ❁ ندارم ہیچ زادِ جا ودانی
نصیحت گوش کن اے نفسِ دوں کیش ❁ حذر کن بنگر اندر رہ پس و پیش
بیا بشنو کہ دنیا بے ثبات ست ❁ جہانے دیگر از بہر حیات ست
بساکس اندریں رہ پا نہادند ❁ بآخر سر نہا دہ یا نہادند
نگہ کن بر شہانِ آسمان جاہ ❁ نہ بر دنداز جہاں جز حسرت و آہ

آپ کے فارسی کلام میں نظم "ہست ونیست" بھی ایک شاہکار نظم ہے جس میں ہر شعر کے آخر میں ہست ونیست کو جمع کر کے جمع بین الاضداد کا ایک حسین مرقع پیش کیا ہے۔

عربی کلام پر بھی آپ کو پوری قدرت حاصل تھی، آپ کے مجموعۂ کلام میں عربی نظم "نونیۃ الاحاد" ایک بہترین نظم ہے، جس میں امت کے تمام ممتاز مشاہیر کو جو کسی نہ کسی فن یا صنعت میں یکتا گذرے ہیں جمع کر دیے گئے ہیں، یہ نظم ۱۶۸/اشعار پر مشتمل ہے۔

احادِ امت کا یہ تذکرہ دراصل علامہ جلا الدین سیوطی کی تحریر سے ماخوذ ہے، علامہ سیوطی نے علامہ ذہبی کی ایک تحریر سے لیکر اپنی مشہور زمانہ کتاب تاریخ الخلفاء میں درج کیا ہے۔

اس نظم کے علاوہ قاسم العلوم والخیرات کے عنوان سے جو عربی نظم کہی گئی ہے وہ بھی قدیم عربی ادب کی یاد دلاتی ہے پڑھیے اور لطف لیجئے۔

نفسی الفداء لقاسم الخیرات ❁ و بهیجتی اقدی لذی البر کاتٖ
فیضانه بالعلم عم عحم بحاره ❁ ما واه عند الله فی الجناتٖ

اولیٰ الاعاظم رتبة و کرامة ❁ اعلیٰ الاماجد قامع البدعاتٖ
سباق غایات المکارم فی الحیاة ❁ موبّد من رافع الدرجاتٖ
شمس الذکا طو د العلیٰ زین الهدی ❁ کهف الوریٰ بکرامة الدرجاتٖ
شیخ الائمة مقتدی الاعلام ❁ صدر الاجلة قبلة الحاجاتٖ
سلطان اصحابُ الحقائق با العلیٰ ❁ شیخ المشائخ زبدة الحسناتٖ

ضیافتِ طبع کے لیے آپ کی فکاہیہ عربی نظم کے متفرق اشعار بھی ذیل میں درج کئے جارہے ہیں یہ اشعار دراصل علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ایک فکاہیہ مصرع کی تضمین ہیں، شاہ صاحب کا مصرع تھا۔ ع

شربت شراب الزهد و الشیخ چوکس

اس کا قافیہ ہندی ہے بقیہ الفاظ عربی، قاری صاحب نے بھی اسی قافیہ بندی کی رعایت میں نظم کہی ہے، پوری نظم بہت دلچسپ ہے، اس نظم میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر ہے، اشعار ملاحظہ ہوں۔

الایا صدیقی اترك الدهر کلهٗ ❁ فان متاع الدهر لغو و بُوکس
الا انّما الدنیا قلیل متاعها ❁ ولو رحبت ایران وتوران وفارس
وما هی الا زینة ذات کدرة ❁ و قشر بلا لبّ و قصب و لا رسُ
و ما هی الا حسرة او ندامة ❁ و ان ضاء وجه الارض لندن و پیرسُ
فلا تستوی الدّنیا جناح بعوضة ❁ ومن لم یشفها ممعنافهو بے حسُ

یہ آپ کے شعری کلام کے کچھ حصوں کا ایک سرسری جائزہ ہے جس سے آپ کے ملکۂ شعر گوئی کی کچھ جھلک ملتی ہے، کلام کے شائقین کو آپ کی کتاب ''عرفان عارف'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

❁❁❁

حکیم الاسلام بحیثیت شاعر

از: عبید اقبال عاصم

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے ظاہر و معنوی خوبیوں سے نوازا تھا، ان کی زندگی علم و عمل، رشد و ہدایت، وعظ و خطابت اور تحریر و صحافت سے تو مرصّع تھی ہی، لیکن یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ انہیں شعر و ادب سے بھی غیر معمولی شغف تھا، اور وہ ایسے مضامین اشعار میں سمونا جانتے تھے کہ جن کی بلاغت و فصاحت میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں، حضرتؒ کو جہاں نثر میں یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ نازک سے نازک مسائل میں علمی نکات تلاش کر کے اپنی ذہانت کا لوہا قاری سے منوا لیتے ہیں وہیں ان کی شاعری میں ایسے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں کہ جن کی لطافت و نکتہ آفرینی کو داد دیئے بغیر چارہ کار نہیں، حقیقت یہ ہے کہ قاری صاحب مرحوم نے شعر گوئی کو کبھی اہمیت نہیں دی،، ان کے کلام اور ان پر لگائے گئے تحریری نوٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بسا اوقات ان کے ذہن میں فی البدیہہ اس قسم کے مضامین جمع ہو جاتے جو نظم کی شکل اختیار کر لیتے اور وہ موقع لگنے پر انہیں قلم بند کر لیتے تو محفوظ رہ جاتے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے بہت سے اشعار محفوظ ہی نہ رہے ہوں یا وہ ہجوم کار کے باعث انہیں قلبند ہی نہ کر سکے ہوں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کا بہت سا شعری سرمایہ عوام تک پہنچا ہی نہ ہو۔

ان کا مجموعہ کلام ''عرفانِ عارف'' پیش نظر ہے جو ۱۹۶۷ء میں کتب خانہ قاسمی دیوبند سے طبع ہوا، علاوہ ازیں ''آنکھ کی کہانی'' نامی طویل ترین دو نظموں پر مشتمل چھوٹا سا کتابچہ ہے، یہ بھی کتب خانہ قاسمی دیوبند سے طبع ہوا غالباً یہ بھی اسی دور کا ہے، اس طریقہ پر حضرت قاری صاحبؒ کا مطبوعہ کلام بھی انہیں دو کتابوں کی صورت میں ہے،

یقیناً آپ نے اس کے بعد بھی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہوگی، خصوصی طور پر دارالعلوم دیوبند کے اجلاسِ صد سالہ کے موقع پر آپ نے بہت کچھ نظم کیا ہوگا جو زمانہ کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے دارالعلوم کے قضیہ نامرضیہ () کے بعد ایک نعت کہی تھی جو بہت زیادہ مقبول ہوئی اور عرصہ تک اس کے اشعار...

نبی اکرم شفیع اعظم دکھے دلوں کا پیام لے لو
عجیب مشکل میں آگئے ہم زمیں بھی دشمن فلک بھی دشمن
تمام دنیا ہے ہم سے بدظن،
عجیب مشکل میں کارواں ہے نہ کوئی اپنا نہ ہم کسی کے
تمام دنیا خفا ہے ہم سے تمہیں محبت سے کام لے لو

عوام وخواص کی زبان پر سنے گئے، جس سے اس نعت کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی شعری صلاحیتیں ہمیشہ بیدار رہیں اشعار موزوں ہوتے رہے لیکن انہیں جمع کرنے والا یا ترتیب دینے والا کوئی نہیں رہا، اگر ان کا تمام کلام محفوظ رہتا تو یہ شعر وادب کی بڑی خدمت ہوتی۔

''عرفان عارف'' میں ستاون ۵۷ نظمیں ہیں جن میں پانچ عربی، بارہ فارسی اور چالیس اردو نظمیں شامل ہیں، جن میں سے بیشتر نظمیں طویل ترین نظمیں ہیں، بالخصوص ''آنکھ کی کہانی'' کے دونوں حصے جو سات سو سے زائد اشعار پر مشتمل ہیں جن کا ردیف وقافیہ ایک ہی ہے جس سے قاری صاحب مرحوم کی قادر الکلامی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ تینوں زبانوں میں شاعری پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔

اس تحریر میں اجمالی طور پر حضرت حکیم الاسلام کی شاعری کا سرسری طور پر اس غرض سے طالب علمانہ جائزہ لینے کی کوشش کی جارہی ہے کہ کوئی صاحب علم وقلم اٹھے اور گوناگوں صفات کی حامل شخصیت حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے

اس پہلو کا عالمانہ وناقدانہ جائزہ لے کر تشنگانِ ادب کو سیراب کرے۔

''عرفانِ عارف'' کے مطالعہ کے بعد یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی شاعری کے جو نمونے ملتے ہیں اگر چہ ان میں متنوع مضامین پائے جاتے ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ اسلامی تعلیمات کو پیش نظر رکھتے ہیں، حمد الٰہی، نعت نبوی ﷺ کے علاوہ شخصی مدائح، مراثی، تاریخی حکایات، ذاتی واقعات غرضیکہ کسی بھی انداز سے انہیں کچھ کہنا ہو وہ شعر موزوں کرنے کے لیے نہ تو عقیدہ کی صحت و سلامتی کو ہاتھ سے جانے دیتے ہیں اور نہ ہی فکری و مسلکی عقائد سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں، مذہبی، فکری و مسلکی تمام ہی مناظر کو پیش نظر رکھ کر شعر کہنا ''ید طولیٰ'' کے بغیر ممکن نہیں، اس کے باوجود ان کی شاعری پر معاصرین یا بعد کے حضرات نے کوئی خاصی توجہ نہیں دی حالانکہ یہ اردو ادب کے تئیں ایک بہت بڑی خدمت بھی ہوتی اور حضرت حکیم الاسلامؒ کو خراج عقیدت بھی، پیش نظر مضمون میں راقم نے ان نمونوں پر خصوصی توجہ دی ہے جن میں قرآن و حدیث سے اشارتاً و کنایتاً استفادہ بھی کیا گیا ہے، علاوہ ازیں ان کی شاعرانہ طبیعت کے ذوق کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے، اپنی ناقص معلومات کے اعتراف کے ساتھ یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ ایک طالب علمانہ کوشش ہے، جو ارباب بصیرت کو توجہ دلانے کی غرض سے لکھی گئی ہے۔

حضرتؒ نے اپنے والد ماجد مولانا محمد احمد صاحب مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند کی حیدر آباد کے سفر سے واپسی پر کہ جس میں سلطنت حیدر آباد کے خزانہ عالیہ نے دارالعلوم دیوبند کا چندہ آٹھ سو روپیہ سے بڑھا کر ایک ہزار روپیہ کر دیا تھا، ایک نظم کہی تھی جس کا ایک شعر ؎

روح و ریحاں کا سبب تھے اگر اس کے ریحاں
تو ہر اک شاہ سپر غم تھا غم و درد کی ڈھال

اس شعر میں قرآن مجید کی آیت ''فروح وّریحان وجنت نعیم'' الواقعہ آیت ۸۹ رکی طرف اشارہ ہے۔

اسی نظم میں ایک شعر

پا گئے مصر کو یوسف کے برادر جیسے
لے کے سر مایۂ ناقص پئے تحصیل نوال

یہ شعر بھی قرآنی آیت ''فلمّا دخلوا علیه قالوا یا ایھا العزیز مسّنا و اھلنا الضر و جئنا ببضاعة مزجاةٍ فاوفِ الکیل وتصدق علینا ''(یوسف ۸۸) کی طرف مشیر ہے۔

اپنے منجھلے صاحبزادے مولانا محمد اسلم قاسمی کی شادی کے موقع پر ہدیۂ دعاء وتہنیت کا شعر

مشہود اور جلوتوں کا جلوہ بردار ❁ اور حفظ غیبِ وخلوت کا امیں

قرآنی آیت '' فا لصّٰلحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیبِ بمَا حَفِظَ الله (سورہ نساء آیت ۳۴) کو ذہن نشین کر دیتا ہے، تو مندرجہ ذیل شعر

اصول عاشروھنّ ہے معروف ❁ یہی اک راہِ راہ مکر میں ہے

اسی سورہ کی انسویں آیت کے ایک حصہ وَ عا شروھنّ با لمعروف فانْ کرھتمو ھن فعسٰی ان تکرھوا شیئاً ''(الیٰ آخرہٖ) کی طرف توجہ مبذول کرا دیتا ہے، تو مندرجہ ذیل شعر

حقیقت انہیں دے جس کا تمغہ ❁ نوائے لَا اُحبُّ الاٰفلین ہے

بھی قرآنی آیت کے ایک جز ''فلمّا افل قال لا احب الاٰفلین ''(الانعام: ۷۷) سے مستعار ہے۔

'' آنکھ کی کہانی '' قاری طیب صاحب کی وہ معرکۃ الآراء نظم ہے جسے اردو کی رزمیہ شاعری میں ایک ممتاز مقام حاصل ہو سکتا ہے، لیکن ادبی حلقوں تک یا تو یہ رزمیہ نظم پہنچی نہیں یا پھر انہوں نے قصداً اس سے اعتناء برتا، یہ نظم دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ جنوری ۶۳ء میں دائیں آنکھ کے آپریشن کے وقت موصوف نے نظم کیا یہ حصہ ۲۵۰ر اشعار

پر مشتمل ہے، دوسرا حصہ دسمبر ۱۹۶۴ء میں بائیں آنکھ کے آپریشن کے وقت تقریباً ۴۶۵ر اشعار پر مشتمل نظم کیا، دونوں حصوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک ہی بحر، ردیف اور قافیہ میں نظم کیے ہیں، سات سو سے زائد اشعار پر مشتمل ان دونوں حصوں کو یکجا کر دیا جائے تو بھی اصحاب ذوق اشعار کی سلاست و تسلسل کی بنا پر اس کے زمانوں کے فرق کو بمشکل تمام تلاش کر پائیں گے۔

علاوہ ازیں ان دونوں حصوں میں جن موضوعات کو نظم کیا گیا ہے ان میں حمد باری، نعت نبویؐ، آنکھ کی اہمیت وافادیت، آنکھ کے جامع مقامات اپنی آنکھ کی اصلی وسابقہ کیفیت ،تلاشِ علاج، معالجہ کا آغاز، معالجے کی کیفیت، تعمیر نو، انکشاف، عالم خواب، نتیجہ علاج، پرہیز اور احتیاط تسلی واطمینان دہانی، معاونین کا تذکرہ، اظہار وتشکر ودعاء خاتمۂ کلام چشمۂ صافی پہلے حصہ کے موضوعات ہیں جب کہ دوسرے حصہ میں حمد الٰہی، حقیقی ربوبیت کا مقام اور پھر اس کی فلسفیانہ توضیح وتشریح، فقہاء کی نکتہ آفرینیاں، دہریوں کے اعتراضات و اشکالات، مشرکین اور مجوسیوں کے عقائد نیز ان کے مدلل جوابات، نعتِ نبویؐ، زمانۂ جاہلیت، جہالت کے اثرات، آفتاب نبوت کا طلوع، پروردگانِ نبوت کے اصطلاحی القاب، ختم نبوت کے ذکر کے ساتھ عالمی مدح خوانی وعالمینی نعت نبی کا ذکر کرنے کے بعد شکوۂ چشم کی تمہید باندھی گئی ہے، پھر اس کی حجتیں وحدت بصر کے شواہد ونظائر، شرعی وتکوینی، وجدانی حجتوں کے ساتھ ساتھ حسن منظر کی حجت اور پھر ان کا خلاصہ کرنے کے بعد شکوۂ چشم کا اثر، ضرورت آپریشن، علی گڑھ روانگی، اسپتال میں داخلہ خلاصۂ احوالِ معالجہ، آپریشن کی کامیابی اور شکر حق جلّ مجدہٗ، اللہ کی عطا کردہ نعمتیں اور ان کے شکر سے انسان کی عاجزی، شکر حقیقی، اعتراف نعمت، تشکر معاونین خصوصاً خدامانِ موصوف نیز میزبان علی گڑھ پروفیسر حفیظ الرحمٰن مرحوم، عملۂ اسپتال بالخصوص معالج خاص کرڈاکٹر گپتا، ان کے کمپاؤنڈر للت موہن شرما، مسز اے لال (نرس) وغیرہم سمیت پورے عملہ کا شکریہ ادا کرنے کے بعد علی گڑھ سے دیوبند واپسی کی منظر کشی کرتے ہوئے دیوبند اور علی گڑھ کے رشتوں کو

بہت خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے۔

الغرض یہ ایک بہترین رزمیہ نظم ہے جس میں شعری قواعد کا لحاظ رکھتے ہوئے قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کے اشارات وتصریحات سے اس کی علمی حیثیت دوچند ہو جاتی ہے، قرآنی آیات کے اشارات سے ماخوذ اس کے کچھ اشعار بطور نمونہ نذر قارئین کیے جاتے ہیں۔ ؎

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی سورہ قٓ کی ۲۲ویں آیت میں فرمایا ہے" **فكشفنا عنك غطائك فبصرك اليوم حديد**" ممدوح نے اس آیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے دائیں آنکھ کے کامیاب آپریشن کے بعد ڈاکٹروں کی تسلی واطمینان دہانی نیز آنکھ کی روشنی لوٹ آنے پر جو شعر نظم کیا وہ مندرجہ ذیل ہے۔ ؎

ہو گیا کشف غطاء اور ہے بصر آج حدید
جو رکاوٹ تھے کبھی اٹھ گئے سارے وہ حجاب

اس نظم کے دوسرے حصے میں جہاں آپ نے ربوبیت کا مقام متعین کرتے ہوئے اس کی تعریف اور جامعیت ذکر کی ہے اس کو سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت "**الحمد لله رب العلمين**" سے استدلال کرتے ہوئے ان اشعار سے مدلل کیا ہے۔ ؎

اسم اللہ کے بعد آئے اگر رب کی صفت
تو ہے ترتیب یہی حمد کی تکمیل کی آب
سورۂ الحمد میں ہے رب علم ذات کے بعد
جس سے واضح ہے کہ ترتیب ہے یہ عین صواب

اسی طریقہ پر اسی حصۂ نظم میں نعت رسالت پناہی ﷺ کے تعلق سے جو اشعار کہے گئے ہیں اس میں فرماتے ہیں کہ

ہو درود و سلام اس شہِ اقدس پہ مدام
خلق میں نور ہیں جو امر میں ہیں نور کتاب

اس شعر کو ذہن میں محفوظ رکھتے ہوئے سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۵۲ ''و کذالك او حینا الیك روحا من امرنا ، ما کنت تدری ما الکتٰب ولا الایمان ولکن جعلناہ نو راً نهدی به من نشاء من عباد نا '' پر نظر ڈالیے تو شعر خود بخود اپنے ماخذ کو بتا دیتا ہے۔

آیت نمبر ۶۹ سورۂ نحل میں شہد کی مکھی کے شہد کے سلسلہ میں فرمایا گیا ہے ''فیه شفاءٌ للناس '' اس کو پیش نظر رکھ کر قاری صاحب کے اس شعر پر نظر ڈالیے ؎

کوئی بھی روگ ہو ہے اس کی دوا بھی مخلوق
ہے ہر اک شے میں شفا گر چہ ہو مکھی کا لعاب

تو معلو ہوگا کہ اس آیت سے مستعار ہے۔

قرآنی تلمیحات کے یہ نمونے حضرت حکیم الاسلام کی شاعری میں جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں، اس کے علاوہ احادیث نبویہ پر ان کی عمیق، عالمانہ بالغانہ نظر کے نمونے بہت سے اشعار میں ملتے ہیں جن میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں۔

حمد باری تعالیٰ میں جب وہ کہتے ہیں کہ ؎

عطیۂ رحمت مہداۃ اس کا ❁ ہدیۂ علم وادراکات اس کا

تو ان کے پیش نظر وہ حدیث رہتی ہے جس میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے ''انا رحمةٌ مهداة ''

ارشاد نبوی ''المومن یموت بعرق الجبین '' کی روشنی میں حضرت حکیم الاسلام کا یہ فارسی شعر ملاحظہ فرمائیے۔ ؎

برلوحِ جبیں نوشتہ مومن ❁ از کلکِ قضاء عرق چناں رفت

ایسے ہی جب وہ اپنے صاحبزادہ مولانا محمد اسلم قاسمی صاحب کے نکاح کے موقع پر یہ شعر موزوں کرتے ہیں ؎

یہ فخر حاصل ہے آج اسلم میاں کو ❁ کہ کامل آج ان کا نصف دیں ہے

تو ان کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک رہتا ہے "النکاح نصف الدین فلیبق اللہ فی النصف الباقی" اسی طریقہ پر اسی سہرے کے مندرجہ ذیل اشعار ؎

سراپا لطف ہو جو اہل کے ساتھ ۞ وہی دانائے دیں ہے اور فطیں ہے

حدیث نبوی "ان اکرم المومنین احسنھم اخلاقاً و الطفھم اھلاً" کا پرتو اور ؎

ہے نفس انساں کا خود انساں کا دشمن ۞ جو اس سے بچ رہے وہ فطیں ہے

ارشاد رسول "انّ اعدیٰ عدوك الذی بین جنبیك" کا آئینہ دار اور ؎

یمین اللہ ملان شان تیری ۞ ترا جود و کرم بڑ الیمیں ہے

فرمان ہادیٔ عالم صلی اللہ علیہ وسلم "یمین اللہ ملان سمّاء اللیل و النھار" کا جلوہ دار ہے جس سے حکیم الاسلامؒ کی تبحر علمی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

آنکھ کی کہانی میں قرآنی تلمیحات کے ساتھ بہت سے اشعار میں ارشادات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نظم کیا گیا ہے جیسے ؎

کوئی بھی کار اہم حمد سے خالی ہو اگر
ہو کے برکت سے وہ خالی نہیں رہتا با آب

ملاحظہ فرمایئے اور حدیث نبوی "کل امر ذی بال لم یبدأ ببسم اللہ فھو اقطع و ابتر" کو ملاحظہ فرمالیجئے اور اسی حدیث کی تشریح درج بالا شعر معلوم ہوتا ہے۔
ایسے ہی احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم "اول ماخلق اللہ نوری" "انا اولھم خلقاً و آخر ھم بعثاً" حق تعالیٰ کا آدمؑ سے خطاب "لو لا خلقت محمداً لما خلقتك یا آدم" اقتباسِ حدیث لی مع اللہ وقتٌ لا لبیعه ملك مقربٌ ولا نبیٌ مر سلٌ اور "الشیطان قد یئس ان یعبدهٗ المصلون فی جزیرۃ العرب" جیسے ارشادات کو ذہن میں ملحوظ رکھتے ہوئے درج ذیل اشعار ؎

ہو درود اور سلام اس شہ اقدس پہ مدام
خلق میں نور ہیں جو، امر میں ہیں نورِ کتاب
خلق اور بعث میں ہیں اوّل وآخر لاریب
علم میں ظاہر و باطن ہیں با نوارِ کتاب
وجہ تخلیق جہاں ، روشنی کو ن و مکاں
اقرب الخلق الیٰ الربّ بکتاب و بخطاب
راستے رشد ہدایت کے تھے سارے مسدود
نفس و شیطاں کی عبادت میں تھی دنیا غرقاب

پر نظر ڈالئے تو احادیث بالا کی تفسیر اشعار بالا معلوم ہوتے ہیں۔

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک پر غور کیجئے کہ "مثلی و مثل ما بعثنی اللہ بہ من الھدی والعلم کمثل الغیث الکبیر اصاب ارضاً "اور اس حدیث کے ضمن میں عرفانِ عارف کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

آسمانوں سے چلی زور کی وہ بارش علم ❁ وادی وکوہ وبیاباں تھے سارے تہِ آب

یا ارشادِ نبوی "انا نبی الانبیاء" کو ذہن نشین رکھتے ہوئے اس شعر ؎

آپ خاتم ہیں تو ہیں آپ ہی نبیوں کے نبی
مدح خواں سارے رُسُل ہوں تو نہیں امر عجاب

پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی شاعری میں احادیث رسولؐ کا ایک گراں قدر ذخیرہ ہے۔

حکیم الاسلام کی شاعری فکری بالیدگی کے جہر سے تو مالا مال ہے ہی کہیں کہیں انتہائی ظریفانہ رنگ بھی لیے ہوئے ہے، مثلاً سردھنہ ضلع میرٹھ میں آموں کی دعوت کے موقع پر انہوں نے جو دقتوں اور پریشانیوں کا ذکر جس ظریفانہ انداز سے کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، فرماتے ہیں ؎

بہت ہی سُر دُھنے سے سَر دھنے تک ✿ پہنچ پائے بفضلِ ایزدی ہم
بگڑ بیٹھی اچانک کار اپنی ✿ لگی رکنے. مکرّر. اور پیہم
چلی کار اور بیکاروں کی مانند ✿ رہی کچھ دیر رک رک اور تھم تھم
بگڑ کر دی پھر اک پرزے نے آواز ✿ کہ اب ممکن نہیں منزل کا مقدم
غرض موٹر کا باطن کچھ خفا تھا ✿ مگر اس میں خِفا تھا شے تھی مبہم

ایک سو اکسٹھ اشعار پر مشتمل یہ سفرنامہ جہاں حضرت حکیم الاسلام علیہ الرحمۃ کی شوخیٔ طبعیت کا نمونہ ہے وہیں اس میں عجائبات قدرت، پھلوں میں آم کی بادشاہت، اہل سردھنہ کی ضیافت، اللہ کے انعامات واکرامات غرضیکہ بیشتر مضامین نظم کردیئے گئے ان کی وسعت علمی کی دلیل ہے۔

الفاظ کو زبر، زیر، پیش سے بدل کر ہم معنیٰ بنا لینے میں قاری صاحب کو مہارت تامہ تھی، جیسے "سرُ دھنے" سے "سرَ دھنے" وغیرہ۔

اسی طریقہ پر ان کے ان اشعار کو ملاحظہ کیجئے ؎

آج بے روح نمائش کی ہے گرما گرمی
بات ہی بات ہے اس دور کی مردا مردی
گرمیٔ بزم کہاں؟ دل ہی جب ہو برف کی قاش
بزم اخلاق پہ کیوں چھائے نہ سردا سردی
راحتِ جان کہاں؟ جان کے لالے ہیں پڑے
یاں تو پھیلی ہوئی ہے ہر سمت مُردا مُردی
بنتِ آدم میں حیا کا ہی وہ جوہر نہ رہا
لاکھ گاتے پھرو تم نغمۂ پردہ پُردی

حضرت حکیم الاسلام کی شوخیٔ طبع وظرافت کے نمونے عرفانِ عارف میں بکھرے ہوئے ہیں لیکن اسی شوخیٔ وظرافت میں انہوں نے اخلاقِ عالیہ اور اسلامی تعلیمات کو کس

طرح پیش نظر رکھا، اس کے نمونے جگہ جگہ دیکھنے کو ملتے ہیں، مولانا عبدالواحد صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے ناظمِ محاسبی کی سماعت بہت زیادہ کمزور تھی، اور اس باعث وہ موضوع مذاق بنے رہتے تھے، حضرت قاری صاحبؒ نے ان کے اس عیب کو اپنے اشعار سے وصف میں تبدیل کردیا، یہ اشعار موصوف نے خود اپنے قلم سے اس طرح نظم کیے جیسے ان کے قائل خود مولوی عبدالواحد ہوں فرماتے ہیں ۔

لوگ کہتے ہیں کہ تم بہرے ہو، سب ٹھیک مگر
میں نہ بہرہ ہوں اور ہوں نہ کسی کا مقروض
شرع میں سمع و تکلم کی ہے قلت مطلوب
مردِ صالح کے لیے ہیں یہی ایماں کے حظوظ
کان گو میرے ہیں بند، ان کی زباں بھی تو ہے بند
کہنے سننے کے معائب سے ہیں دونوں محفوظ
یہ ہے کیا کم، کہ ہے کم، سمع و زباں کا منکر
ہو بڑی بات کہ معروف سے ہوں ہم محظوظ

درج بالا اشعار میں جہاں مولانا عبدالواحد صاحب مرحوم کی تسلی و دل جوئی دیکھنے کو ملتی ہے وہیں ان سے چٹکی لینے والوں کی اصلاح کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اسلامی نظریے کو بہت خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا گیا ہے۔

ایسے ہی حکمت و عبرت کے عنوان سے جو نظم کہی گئی ہے اس میں اعضاء انسانی خصوصاً حواس خمسہ ظاہرہ و باطنہ کی حکمت و مصلحت بڑے دل نشیں انداز میں کر کے قدرت کی کرشمہ سازیوں کو دادِ تحسین پیش کیا گیا ہے، فرماتے ہیں ۔

کانوں کو نا گوار نہ ہو تلخیٔ کلام
رکھا ہے تلخ میل بدیں وجہ کان میں

شیریں دہن ہو آدمی میٹھا کلام ہو
اس واسطے ہے چشمۂ شیریں زبان میں
شوریدگی ہو سر میں تو آنکھوں سے بہہ پڑے
آنسو ہیں شور اس لیے آنکھوں کی کان میں
خالق کو ہے پسند نگہ میں حجاب وشرم
رکھی ہے آنکھ اس لیے پردوں کی تان میں
زائل نہ ہو وقار فضولِ کلام سے
رکھا زباں کو اس لیے قید دہان میں

پوری نظم عبرت وحکمت کا حسین مرقع معلوم ہوتی ہے، طوالت کے خوف سے صرف اشعار بالا پر اکتفا کیا گیا۔

''عرفان عارف'' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ مشہور ومعروف طنز ومزاح کے شاعر اکبر الٰہ آبادی کے اشعار پر تضمین کرکے اکبر الٰہ آبادی کے ذوق مزاح کو اسلامی جہت دینے میں مہارت رکھتے تھے، اکبر نے کہا ؎

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے ❁ یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج وراحت کی ❁ وہ فقط وقت کا گذرنا ہے

قاری صاحبؒ کی تضمین بلکہ اشعارِ بالا کی تکمیل اگر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا فرماتے ہیں کہ ؎

رہ گیا عز وجاہ کا جھگڑا ❁ یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے
قابل ذکر بھی نہیں خوردونوش ❁ یہ بہیمی کی خو سے لڑنا ہے
مقصدِ زندگی ہے طاعت حق ❁ نہ کہ فکر جہاں میں پڑنا ہے

حقیقت یہ ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے اشعار نے اکبر الٰہ آبادی کے مزاحیہ اشعار کے مقابلے میں اسلامی تعلیمات کو پیش کرکے انہیں اسلامی قالب عطا کردیا اور

زندگی کا مقصد واضح کردیا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی شاعری کا ایک نمایاں وصف موعظت ونصیحت ہے، وہ عصر جدید کے تقاضوں کو بخوبی سمجھتے تھے، شریعت کی حدود میں ان کو پورا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔

علوم کی تفریق میں مبتلا حضرات نے اس مسئلہ میں شدت اختیار کرتے ہوئے عصری علوم کہلانے والے سائنسی وانگریزی پر مشتمل علوم کی مخالفت اختیار کی اور انہیں "شجر ممنوعہ" قرار دے دیا لیکن مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے اس معاملہ میں وسعتِ ذہنی اور توسعِ فکری سے کام لیا، چنانچہ جب آپ کے چھوٹے صاحب زادے ڈاکٹر محمد اعظم قاسمی صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے اس وقت آپ نے ان کے نام جو منظوم خط لکھا تھا اس میں علم کے بارے میں جو وضاحت کی ہے وہ مندرجہ ذیل ہے۔

علم وہ ہے جس سے ہو حق سر بلند ❁ اور باطل سرنگوں و شرمسار
علم وہ ہے جس سے حق آئے نظر ❁ جس سے باطل محو ہو یا بے وقار
علم ہے سرمایہ دار زندگی ❁ زندگی بنتی ہے جس سے آبدار
علم کی انواع ہیں گو خود ہے ایک ❁ ایک وحدت سے ہے کثرت آشکار
علم ابداں علم ادیاں دو ہیں علم ❁ اک سے دنیا اک سے عقبیٰ کا وقار
علم طبعی، علم عقل علم وحی ❁ علم ظاہر علم باطن نور بار
علم ابداں ہے بدن کی تازگی ❁ علم ادیاں سے ہے عقبیٰ شاندار
علم الہامی دوامِ زندگی ❁ زندگی بنتی ہے جس سے پائیدار
علم وہ ہے جس سے ابھرے کچھ عمل ❁ وہ عمل جس سے ہو تسکین و وقار

اس منظوم خط میں جو پند ونصائح کا خزانہ ہے حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے علمی تجربات کا خلاصہ اس طرح پیش کیا ہے۔

علم کے ساتھ آتے ہیں آثار علم   جو ہیں آثارِ بقاء زندگی

یعنی فہم و خلق و دین و عقل و عشق | اے عزیز ان سے بنا کچھ زندگی
جہل کے بھی کچھ ہیں آثار قبیح | جو ہیں اسباب ہلاکِ زندگی
یعنی ظلم و سُفہ و طغیاں سرکشی | ان سے بچ یہ ہیں وبالِ زندگی
امر کی تعمیل ، منہی سے گریز | خوش نصیبی کی یہی ہے زندگی
امتحانوں کے لیے تیار ہو | ہے یہی طالب کی علمی زندگی

''عارف'' کا ''عرفان'' دینی و عصری علوم کے امتزاج کی اس خصوصی کیفیت کو بخوبی محسوس کرتا تھا جن پر عمل پیرا ہو کر دنیا بالخصوص ہندوستان کے مسلمان کامیابی و کامرانی کی راہ پر گامزن ہو سکتے ہیں ، اسی وجہ سے صاحبِ ''عرفانِ عارف'' نے ہندوستان کے دو اہم علمی مراکز علی گڑھ اور دیوبند (جن کے بارے میں تنگ نظر حضرات کا خیال ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں) کو ایک دوسرے کی اہم ضرورت قرار دیا ہے، فرماتے ہیں۔ے

ایک ہے مرکزِ دل دوسرا ہے مرکزِ فکر
دین و دانش کی انہی دونوں سے بنتی ہے کتاب
ایک ہے تربیت روح کی غیبی قوت
ایک سے تربیت جسم کا مفتوح ہے باب
ایک، عقبیٰ کا کمال ایک ہے دنیا کا جمال
بنتی ان دونوں سے ہے صحت دارین کی آب
ایک سے عقل معاش ایک سے ہے عقل معاد
دین و دنیا کا انہی دو سے مکمل ہے نصاب
ایک ہے دل کی شفاء ، ایک دماغوں کی دوا
مضمر ان دو ہی میں ہے قوت و شوکت کا شباب

کوئی ایک ان میں نہ ہو، ہوگا یہ دنیا کا اندھیر
جیسے گردوں پہ رواں مہر نہ ہو یا مہتاب

عملی سیاست سے حکیم الاسلام کو زندگی کے کسی بھی لمحہ میں دل چسپی نہیں رہی لیکن وہ سیاست پر بھر پور نظر رکھتے تھے، ملک میں پیش آمدہ انقلابی حالات تقسیم وطن، دوقومی نظریات کا تنازعہ سب کچھ ان کے سامنے تھا، اور وہ ان موضوعات پر سیر حاصل بحث بھی کرتے تھے لیکن اپنے علمی مقام و مرتبہ سے نیچے آنا ان کے شایانِ شان نہیں تھا، سنجیدہ مباحث میں وہ دلچسپی بھی لیتے اور اگر کوئی قابلِ اعتراض بات ہوتی تو اس کا مثبت جواب بھی دیتے تھے، لیکن ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں اس قسم کے اشعار سب سے کم نظر آتے ہیں۔

مجاہدِ جنگ آزادی دار العلوم دیو بند کے صدر المدرسین، شیخ طریقت، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحبؒ صدر جمعیۃ العلماء ہند نے جب دوقومی نظریہ کی مخالفت میں شرعی دلائل فراہم کیے تو علامہ اقبال نے کہا۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ ❁ ز دیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست

حالانکہ بعد میں انہوں نے اس سے رجوع بھی کیا لیکن چونکہ سلسلہ چل نکلا تھا اس لیے حضرت قاری صاحبؒ نے بھی مندرجہ ذیل فارسی اشعار نئے انداز سے پیش کیے جن میں ایک حد تک دونوں افکار کو یکجا کیا گیا ہے۔

زقوم و نسل وطن ملتے کہ سر بزند ❁ چو پارہ ایست زکل، کل آتش دین نبی است
میانِ ہود و مسلماں کہ عہد وحدت شد ❁ بشرطِ غلبۂ حکم محمد عربی است
وجودِ وحدتِ ملت بہر چہ طور شود ❁ خلاف شرطِ مقرر شرار بولہبی است

المختصر حضرت حکیم الاسلام کی شاعری بہت بلند پایہ شاعری ہے جو کام کی متقاضی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ حضرت کا بعد کا کلام بھی اگر میسر ہو جائے تو اس کی جدید انداز سے ترتیب و تدوین کی جائے، فارسی عربی کلام کی افادیت میں کسی کلام کی گنجائش

نہیں ہے، لیکن موجودہ دور کے اردو سے نابلد نوجوانوں کی فکری اوقات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر فارسی و عربی کلام کو الگ شائع کر دیا جائے تو یہ زیادہ مفید ہوگا، آخر میں حضرت حکیم الاسلام کے ان دو اشعار پر بات ختم کرتا ہوں کہ ؎

میں وہ کشتی ہوں جس کا ناخدا آغوش طوفاں ہے
فضا کے تند جھونکوں پر چلا ہے بادباں میرا
عنادل کے ترنم سے الگ ہے زمزمہ اپنا
نہیں صحنِ گلستاں میں کوئی ہم داستاں میرا

عبید اقبال عاصم
۴/۴۶۰ زہرہ باغ علی گڑھ ۲۹ / مارچ ۲۰۰۴ء

کلمات طیبات

یعنی

ذکر اللہ کے دس اسلامی کلمے

حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب نور اللہ مرقدہ کو بیعت کا شرف حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ سے اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے اجازت بیعت حاصل تھی۔ حضرت حکیم الاسلام سے سلسلۂ بیعت رکھنے والے حضرات کے لیے عرصہ ہوا خود حضرتؒ نے کلمات طیبات کے نام سے ان معمولات اور اوراد و وظائف کو تحریر فرمایا جو کافی تفصیل سے سامنے آئے، ان اوراد و وظائف اور معمولات کو یہاں درج کیا جارہا ہے، جن کی اس حلقہ سے تعلق رکھنے والوں کو تلقین کی جاتی ہے۔ آخر میں وہ منظوم شجرۂ چشتیہ بھی شامل ہے جو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی تالیف ہے۔ (مؤلف)

الحمد للّٰہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

ذکر اللہ روح عالم ہے

اما بعد! کائنات عالم کی روح جس سے وہ زندہ اور برقرار ہے ذکر اللہ اور یاد حق ہے یہ روح اس میں سے نکل جائے تو پھر یہ عالم برقرار نہیں رہ سکتا۔

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک زمین میں اللہ اللہ کہا جارہا ہے۔ یعنی ذکر اللہ کی گونج جب تک اس جہان میں قائم ہے جب ہی تک یہ جہان قائم ہے جس دن اس میں یاد الٰہی باقی نہ رہے گی اسی

دن اس عالم کی موت آجائے گی جس کا نام قیامت ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عالم کی روح ذکرِ الٰہی ہے جس کے گم ہوتے ہی ہماری زندگی ختم ہو جائے گی۔

ذکر اللہ ہی تمام اجزائے کائنات کی بھی روح ہے

نہ صرف مجموعہ عالم بلکہ اجزائے عالم کی زندگی بھی یادِ الٰہی ہی سے قائم ہے۔ حق تعالٰی نے ارشاد فرمایا کہ "کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اللہ کی تسبیح اور حمد نہ کرتی ہو، لیکن تم اس کی تسبیح کو نہیں سمجھتے"۔ اور فرمایا کہ: "ہر چیز نے اپنی نماز اور تسبیح کو جان لیا ہے"۔

حدیث میں ہے ماء جاری اللہ کی تسبیح کرتا ہے، یعنی جب اس کی روانی رک جاتی ہے تو تسبیح بند ہو جاتی ہے اور وہی اس پانی کی موت کی ساعت ہوتی ہے۔

ارشاد نبوی ہے کہ سرسبز ٹہنی اللہ کی تسبیح کرتی ہے یعنی جونہی وہ اپنی اصل سے جدا ہوتی ہے اس کی تسبیح بند ہو جاتی ہے اور یہی اس کے مرجھانے اور مرنے کی گھڑی ہوتی ہے۔

اسی طرح حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ: "سفید کپڑا اللہ کی تسبیح کرتا ہے"۔ پس جونہی وہ میلا ہوتا ہے اس کی تسبیح بند ہو جاتی ہے اور یہی اس کے معنویت کی موت کا وقت ہوتا ہے۔ غرض ہر چیز کی زندگی ذکر اللہ سے ہے اور موت غفلت عن اللہ سے ہے۔

ذکر اللہ ہی انسان کی روحانی زندگی کی روح ہے

کائنات کا اہم جز و انسان ہے انسان کی حقیقی زندگی بھی ذکر اللہ سے ہی ہے اس کی معنویت کی روح بھی یہی ذکر اللہ ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: "جو شخص اپنے پروردگار کو یاد کرتا ہے اور جو یاد نہیں کرتا ان کی مثالیں زندہ اور مردہ کی سی ہیں"۔

یعنی ذاکر زندہ ہے اور غافل مردہ اس سے واضح ہے کہ انسان کی روحانی اور قلبی زندگی کی روح بھی ذکر اللہ ہے جس سے اس کا دل زندہ ہے کہ اصل زندگی دل ہی کی زندگی ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے ✿ کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

ذکر اللہ ہی عمل صالح کی بھی روح ہے

پھر اسی طرح انسان کے عمل کی روح بھی ذکر اللہ ہی ہے جس سے وہ عمل قبول اور پائدار ہوتا ہے اگر انسانی عمل کا ڈھانچہ ذکر اللہ سے خالی ہو اور اس میں یہ روح نہ ہو تو وہ عمل ہی مردہ ہے جس پر نہ آخرت میں کوئی پھل آئے گا نہ دنیا میں اس کی قدر وقیمت ہوگی۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: "ذکر اللہ کرنے والے کی مثال ایک سرسبز درخت کی سی ہے درختوں کے مجموعہ میں" یعنی جیسے سرسبز درخت ہی پھل وپھول لاسکتا ہے، نہ کہ خشک جھاڑ۔ ایسے ہی ذکر اللہ کی تازگی رکھنے والا عمل باثمر ہوسکتا ہے نہ کہ غفلت آمیز اور ریاکارانہ عمل۔

ذکر اللہ افضل ترین عمل ہے

ظاہر ہے کہ جب ذکر اللہ روح عالم روح کائنات روح قلب وجان اور روح اعمال و افعال ہے تو ذکر اللہ ہی تمام اعمال میں افض ترین عمل بھی ہوسکتا ہے اسی لیے حدیث نبوی میں ذکر اللہ کو "خیر الاعمال" بہترین عمل، پاکیزہ ترین عمل، بلند پایہ عمل، چاندی سونا خرچ کرنے سے بھی زیادہ اونچا عمل، جہاد فی سبیل اللہ سے بھی اعلیٰ ترین عمل فرمایا گیا ہے۔

ذکر اللہ کے فوائد و برکات

اسی لیے یہ ذکر اللہ کمال قرب الٰہی اور معیت حق کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ حدیث قدسی میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب کہ وہ میری یاد کرتا ہے۔ اگر وہ دل میں اور اپنے نفس میں مجھے یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے نفس میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے کسی مجمع میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اس سے بہتر مجمع (یعنی جماعت ملائکہ) میں یاد کرتا ہوں"۔

عالم میں سب سے بڑے ذاکر جناب رسول اللہ ﷺ تھے آپ کی شان حدیث شریف میں فرمائی گئی ہے کہ کوئی گھڑی ذکر اللہ سے خالی نہ ہوتی تھی اور مختلف اندازوں

سے آپ ہر ہر آن ذکر اللہ میں مشغول رہتے تھے۔ ''کان یذکر اللہ علیٰ کل احیانہٖ'' (آپ اپنے تمام اوقات میں اللہ کو یاد کرتے رہتے تھے) حدیث شریف میں ذکر اللہ کی مجلسیں جنت کے باغات بتائی گئی ہیں گویا حضور ﷺ دنیا میں رہ کر بھی ہمہ وقت جنت ہی کے باغوں میں سیر فرماتے رہتے تھے۔

ذکر اللہ کے آثار ذکر اللہ ہی سے قلب میں رقت اور نرمی پیدا ہوتی ہے اور سخت دلی کافور ہو جاتی ہے ارشاد نبوی ہے کہ ذکر اللہ کے بغیر کلام مت کیا کرو۔ کیونکہ کثرت کلام بلا ذکر الٰہی کے کساوت قلب اور سخت دلی ہے اور اللہ تعالیٰ سے بعید تر آدمی وہی ہے جس کا دل سخت ہو۔ نیز پاکیزگیٔ نفس اور صفائیِ اخلاق بھی ذکر اللہ ہی سے ممکن ہے۔ ارشاد نبویؐ ہے کہ جو قوم بھی کسی مجلس سے اٹھتی ہے کہ اس میں یاد الٰہی نہ کی گئی ہو تو وہ ایسے اٹھتے ہیں جیسے کسی گدھے کی مردہ لاش پر سے اٹھے ہوں اور ان پر حسرت وہلاکت پڑی ہوئی ہو۔

پھر ذکر اللہ ہی سے نفس میں شیطانی اثرات زائل ہو سکتے ہیں ارشاد نبویؐ ہے کہ آدمی کے قلب کو شیطان چمٹا رہتا ہے جونہی اس نے یاد الٰہی کی اور ذکر اللہ میں مشغول ہوا و نہی شیطان کھسک جاتا ہے اور جونہی آدمی ذکر اللہ سے غافل ہوا و نہی وہ وسوسے ڈالنا شروع کر دیتا ہے۔

پھر عذاب الٰہی سے بچاؤ کا بھی سب سے بڑھ کر مؤثر ذریعہ یہی ذکر اللہ ہے حدیث نبوی میں ارشاد ہے کہ: '' ذکر اللہ سے بڑھ کر کوئی بھی عمل عذابِ الٰہی سے نجات دلانے والا نہیں۔

ساتھ ہی قلب کے زنگ دور کرنے اس پرنور کی پالش کرنے والی چیز بھی ذکر اللہ ہی ہے۔ ارشاد نبویؐ ہے کہ ہر شی کے لیے ایک صیقل ہے (جس سے اس پر چمک آتی ہے جیسے تانبے کے لیے قلعی اور لوہے ولکڑی کے لیے پالش) اور قلوب کا صیقل ذکر اللہ ہے۔ اس لیے اگر ایک مرد مومن چاہتا ہے کہ اس کے قلب میں نور اور صیقل پیدا ہو، دل

میں نرمی اور رحمت پیدا ہو عذابِ الٰہی سے نجات پا جائے، شیطانی اثرات سے محفوظ رہے اور اسے قربِ الٰہی نصیب ہو تو وہ ذکر اللہ کی کثرت کرے اور ہمہ وقت اپنی زبان کو یادِ الٰہی سے تر رکھے۔

ذکر اللہ کی عظمت حق تعالیٰ نے جو صیغہ خود اپنی بڑائی بیان کرنے کے لیے استعمال فرمایا ہے وہ ہی صیغہ اپنے ذکر کی عظمت و بڑائی کے لیے بھی استعمال فرمایا ہے۔ اپنے لیے فرمایا اللّٰہ اکبر یعنی اللہ ہر چیز سے بڑا ہے اور ذکر اللہ کے لیے فرمایا وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اکبر (اور اللہ کا ذکر ہر چیز سے بڑا ہے)۔

ذکر اللہ کے واجب ہونے کی دلیل اس لیے حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ذکر اللہ کرنے کا حکم فرمایا اور بصیغہ امر اسے واجب ٹھہرایا۔ ارشاد ربانی ہے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْراً کثیراً۔ **ترجمہ**: اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کو خوب کثرت سے یاد کیا کرو۔

آیت بالا سے مطلقاً ذکر اللہ کی ضرورت اور احادیث مذکورہ سے مطلق ذکر اللہ کی عمومی فضیلت و منقبت واضح ہو گئی۔ ارشاد ربانی اور عرض کردہ فضائل ذکر کے پیش نظر اشد ضرورت ہے کہ ہم مسلمان ذکر اللہ کی قوت و عظمت کو پہچانیں اور اپنی تمام دینی و دنیوی مصائب کا علاج اس میں تلاش کریں۔ چونکہ مطلق ذکر کی ادائیگی بغیر کسی مخصوص صیغہ اور خاص کلام کے نہیں ہو سکتی اس لیے ہم سہولت عمل کے لیے ذکر اللہ کے اقسام اور ان کی خصوصی حقیقت و نوعیت اور ان کے ورد کا طریقہ و وقعت ان چند سطروں میں مختصراً پیش کرتے ہیں تا کہ طالبین ذکر کے لیے ان اذکار کا اپنا دائمی ورد اور معمول بنا لینے میں آسانی ہو۔

اذکار عشرہ شریعت اسلام کے عرف میں ذکر اللہ کے دس کلمے منتخب اور معروف ہیں جو اپنی جامعیت کے لحاظ سے ہر نوع کے ذکر پر حاوی ہیں اور اسی لیے خصوصی طور پر ان کے ورد کی تاکید اور فضیلت آئی ہے اور جن میں سے ہر ایک کلمہ

بجائے خود ایک مستقل ذخیرۂ دین، عمدہ ترین خزانۂ اجر وثواب اور میزان عمل میں ثقیل ترین وزن دار جنس ہے اور اسی لیے ہر دور میں اہل اللہ اور مشائخ نے ان کلمات کی تلقین بھی فرمائی ہے اور خود بھی انہیں اپنا معمول بنائے رکھا ہے وہ دس کلمے یہ ہیں۔

(۱) کلمۂ تسبیح یعنی اللہ کی پاکی بیان کرنے کا کلمہ اور وہ سبحان اللہ ہے

(۲) کلمۂ تحمید یعنی اللہ کی ثنا وصفت بیان کرنے کا کلمہ اور وہ الحمد للہ ہے

(۳) کلمۂ توحید یعنی اللہ کی ذات وصفات کی یکتائی بیان کرنے کا کلمہ اور وہ لا الہ الا اللہ ہے۔

(۴) کلمۂ تکبیر یعنی اللہ کی بڑائی بیان کرنے کا کلمہ اور وہ اللہ اکبر ہے۔

(۵) کلمۂ توبہ یعنی اللہ سے گناہوں کی معافی مانگنے کا کلمہ اور وہ استغفر اللہ ہے جس کا جامع صیغہ حدیث شریف میں یہ فرمایا گیا ہے استغفر اللہ الّذی لا الٰہ الّا ھو الحیُّ القیُّوم وَ اتوبُ اِلیہ۔

(۶) کلمۂ تعوذ یعنی آفات ومصائب کے وقت اللہ سے پناہ مانگنے کا کلمہ اور وہ اَعُوذُ باللہ ہے جس کا جامع صیغہ حدیث شریف میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے اَعُوذُ بِکَلِمَات اللہ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ ما خَلَقَ۔

(۷) کلمہ بسملہ یعنی اللہ کے نام سے اوقات اور افعال کو شروع کرنے کا کلمہ اور وہ بسم اللہ ہے جس کا جامع صیغہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے بسم اللہ الّذی لا یَضُرُّ مَعَ اسْمِہٖ شیٌٔ فی الْاَرْضِ ولا فی السماء وھو السمیع العلیم۔

(۸) کلمہ حوقلہ یعنی اللہ تعالیٰ ہی کو تمام قوتوں کا سرچشمہ ماننے کا کلمہ اور وہ لا حَوْلَ ولا قوۃَ الّا باللہ ہے۔

(۹) کلمہ حَسْبَنہ یعنی اللہ ہی کو اپنے اور اپنے ہر کام کے لیے کافی ووافی سمجھنے کا کلمہ اور وہ حَسْبُنا اللہُ ہے جس کے لیے قرآن کریم نے یہ دو جامع صیغے ارشاد فرمائے ہیں (۱) حَسْبُنا اللہ و نِعْمَ الوَکِیْلُ۔ (۲) وَ حَسْبِیَ اللہُ لَا الٰہَ اِلّا ھو عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وھُوَ رَبُّ العَرْشِ العَظِیم۔

(۱۰) کلمہ تصلیہ یعنی اللہ تعالیٰ سے حضرت ﷺ کے لیے رحمت مانگنے کا کلمہ اور وہ درود شریف ہے جس کا جامع اور مختصر صیغہ یہ ہے اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ بِعَدَدِ کُلِّ مَعْلُوْمٍ لَّکَ۔

تِلْکَ عَشَرَۃٌ کَامِلَۃٌ

کلماتِ عشرہ کا قرآن سے ثبوت اور وجوب

ان دسوں کلموں کا ماخذ قرآن حکیم ہے جس میں ان کے ورد رکھنے اور پڑھتے رہنے کا امر فرمایا گیا ہے۔

(۱) ذکر تسبیح کے بارے میں ارشاد ہے: وَسَبِّحُوْہُ بُکْرَۃً وَّ اَصِیْلًا (اور صبح وشام اس کی تسبیح کرتے رہو)۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی (آپ اپنے پروردگار عالیشان کے نام کی تسبیح کیجئے)۔ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّکَ الْعَظِیْمِ (سو اپنے عظیم الشان پروردگار کی تسبیح کیجئے۔

(۲) ذکر تحمید کے بارے میں حکم دیا گیا: قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ وَ سَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی (آپ کہئے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے سزاوار ہیں اور اس کے ان بندوں پر سلام ہو جن کو اس نے منتخب فرمایا)۔ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ سَیُرِیْکُمْ اٰیٰتِہٖ فَتَعْرِفُوْنَھَا (اور کہہ دیجئے کہ سب خوبیاں خالص اللہ ہی کے لیے ثابت ہیں عنقریب اپنی نشانیاں دکھلاوے گا اور تم ان کو پہچانو گے)۔

(۳) ذکر توحید کے بارے میں ارشاد ہے فاعلم انہ لا الہ الا اللہ جان رکھ کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ۔

(۴) ذکر تکبیر کے بارے میں ارشاد ہے: وَکَبِّرْہُ تَکْبِیْرًا۔ اور اس کی خوب بڑائیاں بیان کیجئے دوسری جگہ ارشاد ہے: وَ رَبَّکَ فَکَبِّرْ (اور اپنے رب کی سو بڑائی بیان کر)

(۵) ذکر توبہ واستغفار کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا (اے ایمان والو! تم اللہ کے آگے سچی توبہ کرو)۔ ایک جگہ

ارشاد ہے: و تُوبُوا اِلَی اللّٰہِ جَمِیعاً اَیُّھَا المُؤمِنُونَ لَعَلَّکُم تُفلِحُونَ (اور (اے) مسلمانوں! تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو تا کہ فلاح پاؤ)۔ ایک جگہ ارشاد ہے: وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ و للمُؤمِنِیْنَ (اور مغفرت چاہو اے پیغمبر اپنی خطا کے لیے اور مومنین کے لیے)۔

(۶) ذکر تعوذ و استعاذہ کے بارے میں حکم ربانی ہے: قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ الخ (آپ کہیے کہ میں صبح کے مالک کی پناہ لیتا ہوں۔ قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ الخ (آپ کہیے کہ میں لوگوں کے مالک کی پناہ لیتا ہوں)۔

(۷) ذکر بسملہ کے بارے میں ارشاد ربانی ہے: اِقْرَاءْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَكَ (اے پیغمبر آپ قرآن اپنے رب کا نام لے کر پڑھا کیجئے جس نے پیدا کیا)۔

(۸) ذکر حوقلہ کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا: وَ لَوْلَا اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللّٰہُ لَا قُوَّۃَ اِلَّا باللّٰہِ۔ حدیث میں اس پر کلمہ لَا حَوْلَ کا مزید اضافہ ہے اس لیے مجموعی کلمہ "لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّۃَ اِلَّا باللّٰہِ" ہو جاتا ہے۔

(۹) ذکر حَسْبَنَہٗ کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے: فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھو عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَ ھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ (پھر اگر وہ روگردانی کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میرے لیے اللہ کافی ہے اس کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں ہے اسی پر بھروسہ کر لیا اور وہ بڑے بھاری عرش کا مالک ہے) اور فرمایا: قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ (اور کہا انھوں نے کہ ہم کو حق تعالیٰ کافی ہے اور وہ ہی سب کام سونپ دینے کے لیے اچھا ہے)۔

(۱۰) ذکر تصلیہ کے بارے میں ارشاد حق ہے: یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا صَلُّوا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْماً (اے ایمان والو! تم نبی پر صلوٰۃ و سلام بھیجا کرو)۔

بہرحال ان دس کلمات طیبات کے لیے قرآن نے مستقل باب قائم کر دیے ہیں اور ان کی نہ صرف ترغیب ہی دی بلکہ حکم اور امر کیا ہے کہ انسان انہیں اپنا وردو وظیفہ بنائے۔ پھر

حدیث نبویؐ نے ان مخصوص اذکار کی تفصیلات پر روشنی ڈالی کہ ان کے فوائد اور ثمرات کیا ہیں، ان کے ورد کی مقدار کیا ہے اور ان کے پڑھنے کے اوقات کیا ہونے چاہئیں۔

کلمات عشرہ کے فضائل

کلمۂ تسبیح کلمۂ تسبیح کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص سو مرتبہ سبحان اللہ پڑھتا ہے تو اس کے نامۂ اعمال میں ایک ہزار نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور اس سے ایک ہزار برائیاں ہٹادی جاتی ہیں۔ اس ذکر کا حاصل ہر عیب و نقص سے خدا کی پاکی بیان کرنا اور اس کے ہر کمال کو عیب سے پاک بتلانا ہے کہ اس کی حیات مثلاً موت کی آمیزش سے پاک ہے، اس کا علم جہل کی آمیزش سے بری ہے، اس کی قدرت عجز کی آمیزش سے پاک ہے وغیرہ۔ قرآن حکیم نے اپنی سات سورتوں کو کلمۂ تسبیح سے شروع فرما کر تسبیح الٰہی کی طرف توجہ دلائی ہے جیسے سَبَّحَ لِلّٰہِ اور یُسَبِّحُ لِلّٰہِ وغیرہ۔

نیز کائنات کی ہر شئی کے لیے تسبیح کا وظیفہ ثابت کیا ہے: وَاِنْ مِّنْ شَیْئٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَ لٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ (کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کی تسبیح وتحمید نہ کرتی ہو مگر تم اس کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ تو انسان زیادہ مستحق ہے کہ دن ورات اس کی تسبیح کرے۔

کلمۂ تمجید یعنی ذکر الحمدُ لِلّٰہِ کا حاصل۔ ہر کمال وخوبی کو اللہ کے لیے ثابت کرنا ہے۔ کیونکہ تعریف وثنا کسی خوبی اور کمال ہی پر ہوتی ہے جب الحمدُ للہ کے معنی یہ ہیں کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ سارے کمالات اور خوبیاں بھی اللہ ہی کے لیے ہیں۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ عالم میں جہاں بھی کوئی حسّی یا معنوی خوبی ہے وہ اسی ذاتِ بابرکات کی خوبی کی کوئی جھلک ہے اس لیے جس کی بھی کوئی تعریف اور مدح کی جائے گی وہ درحقیقت اسی مخزن خوبی کی

حمد وثنا ہوگی پس الحمدللہ کے معنی یہ ہوئے کہ تمام تعریفیں (خواہ کسی کے لیے کی جائیں بلا واسطہ ہوں یا بالواسطہ) صرف اسی کے لیے ہیں اور اسی کے لیے سزاوار ہیں۔

چونکہ تسبیح کے ذریعہ ہر عیب سے خدا کی پاکی بیان کی جاتی ہے اور تحمید کے ذریعہ ہر کمال خدا کے لیے ثابت کیا جاتا ہے اور یہ دونوں باتیں آپس میں لازم وملزوم ہیں کہ جو عیب سے پاک ہوگا وہ اپنی ذات سے تمام خوبیوں کا مالک ہوگا۔ اور جو ذاتی طور سے خوبیوں کا مالک ہوگا وہی ہر عیب سے پاک بھی ہوگا اس لیے دعاؤں میں یہ دونوں کلمے سُبْحَانَ اللہ اور الحمدُللہ عموماً ملے جلے آتے ہیں جیسے: سُبْحَانَ اللہ وَالحمدُللہ اور سُبْحَانَ اللہِ وبحمدِہٖ اور فَسَبِّحْ بحمدِ ربك اور فَسُبْحَانَ اللہِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ و حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ عَشِیًّا و حِیْنَ تُظْهِرُوْنَ (سو تم اللہ کی تسبیح کیا کرو شام و صبح اور تمام آسمان اور زمین میں اسی کی حمد ہوتی ہے اور بعد زوال اور ظہر کے وقت۔ کہیں یہ تسبیح تہلیل کے ساتھ جمع کر کے لائی گئی ہے جیسے ارشاد ہے: لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّی كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (آپ کے سوا کوئی معبود نہیں میں ہوں ظالموں میں سے) اسی کو عرفِ شریعت میں آیت کریمہ کہتے ہیں جس میں تسبیح وتہلیل دونوں جمع ہیں اور یہ مستقل کلمۂ ذکر ہے جسے کلمۂ کریمہ کہنا چاہیے۔ اس کے بارے میں صحیح بخاری میں حدیث آئی ہے کہ یہ دو کلمے زبان پر ہلکے ہیں مگر میزان اعمال میں بھاری ہیں اور اللہ کے یہاں محبوب تر ہیں اگر ہم اسے کلمۂ طیب کہیں تو بجا ہے۔

حمد الٰہی کے بارے میں حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ روز قیامت جو لوگ سب سے پہلے جنت کی طرف بلائے جاویں گے وہ وہ لوگ ہوں گے جو عیش ومصیبت (دونوں حالتوں میں) اللہ کی حمد کیا کرتے تھے۔

کلمۂ توحید یعنی لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہُ کے ذکر کا حاصل خدا کی یکتائی ذات وصفات میں اور تن تنہا بلا شرکت غیرے صرف اسی کا اللہ ومعبود ہونا ثابت کرتا ہے

یعنی کوئی بھی اس کے سوا ایسا نہیں جسے حاکمِ مطلق اور معبودِ مطلق مانا جائے اور اس کے سامنے بلا پس و پیش ہمہ تن ذلت بن کر سرِ تسلیم خم کر دیا جائے کیونکہ اللہ کے معنی اس ذات بابرکات کے ہیں جو ذاتی طور پر بلا عطائے غیرے تمام کمالات کا سرچشمہ ہے اس کا کمال کسی کا دیا ہوا اور بخشا ہوا نہیں کہ اس کے چھن جانے اور زوال کا سوال پیدا ہو بلکہ خود اس کا اپنا خانہ زاد ہے اس لیے وہ ازل سے ہے ابد تک رہے گا۔ نہ اول میں کمال اس سے جدا تھا، نہ آخر میں جدا ہو سکتا ہے۔ پس ذات وصفات وغیرہ میں موت و فنا یا زوال کا مزہ تو وہ چکھے جس کی نہ ذات اپنی ہو نہ زندگی اپنی بلکہ دوسرے کی دی ہوئی ہو کہ وہ جیسے دی جا سکتی تھی ویسے ہی لی بھی جا سکتی ہے، جب وہاں وجود اپنا، زندگی اپنی، وجودی کمالات اپنے تو پھر دینے لینے والا کون؟ کہ اندیشۂ فنا و زوال ہو۔ پس وجود بھی اس کا ازلی و ابدی حیات بھی ازلی و ابدی علم بھی ازلی و ابدی اور تمام کمالات ازلی و ابدی اور جب یہ صورت حال اس کے سوا کسی اور کے پاس نہیں سب کے پاس جو کچھ ہے عارضی اور مستعار ہے جو اسی کا دیا ہوا ہے اور رات دن آتا اور جاتا رہتا ہے تو پھر تن تنہا وہی اپنی ذات اور صفات و کمالات میں یکتا بے مثل بے نظیر اور لاشریک لہٗ ہوگا کوئی دوسرا اس جیسا نہیں ہو سکتا اور اسی لیے انتہائی ذلت کے معنی عبادت کے ہیں تنِ تنہا اسی کے سامنے اختیار کی جا سکتی ہے۔ ہاتھ و پیر اپنی قوتوں سمیت دماغ اپنے حواس سمیت اور قلب اپنے علوم و اخلاق سمیت اسی کے سامنے ہمہ وقت سربسجود اور عبادت گذار ہوگا یہ ہی حاصل ہے ذکر لا الٰہ الا اللہ کا کوئی بھی اللہ کے سوا معبود نہیں ہے کہ اسے یکتا اور لاشریک مانا جائے اور صرف اس کے آگے سرِ نیاز خم کیا جائے۔

اس ذکر سے انسانی نفس میں غنا و استغنا پیدا ہوتا ہے اور انسانیت ہر ایک اپنی جیسی مخلوق سے بے پروا اور اس کی قید و بند سے آزاد ہو جاتی ہے بلکہ پھر دنیا اس کی محتاج ہو جاتی ہے، موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ خداوندا مجھے ایسی چیز سکھلا دیجئے کہ میں اس کے ذریعہ آپ کو یاد کیا کروں اور دعا مانگا کروں فرمایا کہ موسیٰ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ

پڑھا کرو۔ عرض کیا کہ الٰہی یہ کلمہ تو آپ کے سارے ہی بندے کہتے ہیں میں کوئی مخصوص ذکر چاہتا ہوں جسے آپ میرے لیے ہی خاص کر دیں۔ فرمایا کہ اے موسیٰ! اگر ساتوں آسمان اور ان کی آبادیاں اور اس کے ساتھ ساتوں زمینیں اگر ایک پلڑے میں رکھی جائیں اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ایک پلڑے میں۔ تو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہی کا پلڑا بھاری رہے گا۔ نیز حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ جو بندہ اخلاص سے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پڑھتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں یہاں تک کہ یہ کلمہ عرش تک پہونچتا ہے یعنی اس کے اجر و ثواب سے یہ ساری فضا عرش سے فرش تک لبریز ہو جاتی ہے۔

کلمۂ تکبیر

اس ذکر کا حاصل ہر چیز پر اللہ کی بڑائی ثابت کرنا ہے یعنی جس طرح وہ بلحاظ نسبت ہر بڑی سے بڑی چیز سے بھی بڑا ہے اور ہر چیز جو اس کے سوا ہے اس سے چھوٹی اور اس کی نسبت سے حقیر و ذلیل ہے اور ہر چیز اسے اپنے سے بڑا ماننے لگتی ہے حدیث شریف میں ہے کہ ''اللہ اکبر'' کا ثواب زمین و آسمان کی درمیانی فضا کو بھر دیتا ہے یہ چاروں کلمے سُبْحَانَ اللّٰہ ، الحمد للہ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور اللہ اکبر اپنی نوعیت کے لحاظ سے اللہ کی حمد و ثنا پر مشتمل ہیں اور اللہ کی عظمت و جلال کا مخصوص نقشہ پیش کرتے ہیں اس لیے احادیث نبویہ میں ان کے مجموعہ کی مخصوص شان و منقبت فرمائی گئی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: ''جنت چٹیل میدان ہے اس کے درخت اور باغات یہی کلمات ہیں''۔ اور حضورؐ نے فرمایا کہ: جس شخص نے سبحان اللہ صبح کو سو مرتبہ اور شام کو سو مرتبہ کہا تو وہ ایسا ہے جیسے اس نے سو حج کیے اور جس نے الحمد للہ صبح کو سو مرتبہ اور شام کو سو مرتبہ کہا تو وہ ایسا ہے جیسے اس نے سو غازیوں کو سو گھوڑوں پر جہاد فی سبیل اللہ کے لیے سوار کر دیا اور جس نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ صبح کو سو مرتبہ اور شام کو سو مرتبہ کہا تو وہ ایسا ہے جیسا کسی نے سو غلام (جو بنی اسمٰعیل سے ہوں) آزاد کر دیے اور جس نے اللہ اکبر صبح کو سو مرتبہ اور شام کو سو مرتبہ کہا تو اس دن میں کوئی بھی اس سے زیادہ اجر و ثواب لے کر نہیں آئے گا سوائے اس کے جو یہی کلمہ پڑھے یا اس سے زیادہ کچھ پڑھ لے۔

نیز حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک سوکھے ہوئے درخت پر سے گذرے اور آپ نے اس پر لاٹھی ماری جس سے اس درخت کے پتے جھڑ کر بکھر گئے تو فرمایا کہ سُبْحَان الله ، الحمد لله، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ،الله اکبر بھی اسی طرح بندے کے گناہوں کو جھاڑ دیتے ہیں جیسی اس درخت کے پتے جھڑ گئے۔

کلمۂ استغفار وتوبہ اس کلمہ کا حاصل گناہوں اور صعوبتوں کا میل کچیل زائل کر کے نفس کو پاک وصاف کرنا اور اللہ سے بخشش مانگ کر شرمساری کے ساتھ اس کی جناب میں اعتراف قصور کرنا ہے اس ذکر کی خاصیت یہ ہے کہ نفس کی گھٹن اور کدورت زائل ہوتی ہے نفس سے سرکشی اور بغاوت کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے اور اس میں اللہ سے حیا پیدا ہو جاتی ہے جس سے آدمی بآسانی نیک اعمال کی راہ لگ لیتا ہے۔ ارشاد نبوی ہے کہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہ تھا۔ یعنی توبہ سے پاک وصاف ہو جاتا ہے، استغفار کے بارے میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ میرے دل پر ایک گھٹن لائی جاتی ہے اور میں دن بھر میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔

نیز ارشاد نبویؐ ہے کہ حق تعالیٰ شب میں اپنا ہاتھ پھیلاتے ہیں عطاء و بخشش کے لیے تاکہ دن میں گناہ کرنے والا توبہ کرلے اور دن میں ہاتھ پھیلاتے ہیں تاکہ رات کا گناہ کرنے والا توبہ کرلے۔ اور یہ عمل جاری رہے گا یہاں تک کہ آفتاب مغرب سے طلوع کرے (یعنی قیامت قائم ہو جائے اور توبہ کا دروازہ بند ہو جائے) حدیث میں ارشاد ہے کہ زندوں کا ہدیہ مردوں کے لیے استغفار ہے کہ وہ اپنے ساتھ ان کے لیے بھی اللہ سے بخشش مانگیں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی نیک بندے کا درجہ بلند کریں گے تو وہ عرض کرے گا کہ الٰہی یہ رتبہ مجھے کیسے مل گیا؟ باری تعالیٰ فرمائیں گے کہ تیرے بیٹے کی استغفار کی بدولت جو اس نے تیرے لیے کیا یعنی ہم سے تیرے لیے مغفرت مانگی۔ اور حضورؐ نے ان لوگوں کے لیے خوشخبری دی ہے جن کے نامۂ اعمال

میں استغفار کثرت سے ہوگا۔

کلمۂ تعوذ واستعاذہ اس کلمہ کا حاصل آفات دنیا وعقبٰی سے بچاؤ اور تحفظ اللہ سے مانگتا ہے کیونکہ جو آفات ہمارے قبضۂ قدرت سے باہر ہوں ان سے بچنے کے لیے اس کے سوا چارۂ کار کچھ نہیں کہ اس ذات کے دامن میں پناہ لی جائے جس کے قبضہ میں ہم بھی ہوں اور آفتیں بھی ہوں۔ اسی لیے دنیا میں جس قدر بھی فتنے اور آفتیں ہوسکتی ہیں اس سب سے پناہ مانگنے کے صیغے احادیث میں اختیار فرمائے گئے ہیں۔ جیسے جبن، کسل، شر اعداء، غم والم، بیماریاں، قرض، گناہ، تکبر، بخل، فقر وفاقہ، عذاب نار، عذاب قبر، فتنۂ دجال، فتنۂ اولاد، فتنۂ فساد، علم غیر نافع، سخت دلی، غضب الٰہی، ظلم، بد اخلاقی، بری موت، ناگہانی مصیبت، شر نفس، شر شیطان، قہر رجال، غلبۂ دشمن، شماتت اعداء وغیرہ سے پناہ مانگی گئی ہے، لیکن اس سب پر تعوذ کا جو کلمہ حاوی اور شامل ہے وہ یہ ہے اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللہِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ

(میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں ہر اس چیز کے شر سے جو اللہ نے پیدا فرمائی ہے)

حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص دن میں تین مرتبہ تعوذ کا یہ کلمہ پڑھے گا تو وہ اس دن کی تمام آفتوں سے محفوظ رہے گا، اور ایسے ہی رات کو تین مرتبہ پڑھنے سے رات کی آفات سے بچا رہے گا۔

کلمۂ بسملہ اس ذکر کا حاصل یہ ہے کہ کوئی کام اور کوئی وقت اللہ کا نام لیے بغیر شروع نہ کیا جائے تاکہ بندہ کا ہر کام اور ہر ساعت بابرکت اور حقیقی معنی میں آخرت ناکار آمد ہوجائے۔ کھانا پکاؤ تو بسم اللہ سے ابتدا کرو، کپڑا پہنو تو بسم اللہ کہہ کر پہنو، گھر سے نکلو تو بسم اللہ کہہ کر گھر کا دروازہ بند کرو تو بسم اللہ کہہ کر، کھولو تو بسم اللہ کہہ کر کھولو۔

غرض کہ ہر کام کا آغاز نام حق سے کرو تاکہ وہ بابرکت ہوجائے حتی کہ آغازِ نبوت بھی جو خود بذاتہٖ معدن برکت تھا بسم اللہ ہی کی وحی سے شروع کیا گیا اور اِقْرَءْ

بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِی خَلَقَ سب سے پہلے وحی ہوئی۔

حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ: ”کُلُّ اَمْرٍ ذِی بَالٍ لَمْ یُبْدَءْ بِبِسْمِ اللّٰهِ فَهُوَ اَقْطَعُ “(جو کام بھی بسم اللہ سے شروع نہ کیا جائے وہ خالی از برکت ہے پائیدار نہیں)۔اس بسملہ کے ذکر میں جامع ترین ذکر یہ کلمہ ہے بسم اللہ الّذی لا یَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شیٌٔ فی الاَرْضِ ولا فی السماء وھو السمیع العلیم ۔(شروع اس اللہ کے نام سے کہ جس کے نام کے ہوتے ہوئے کوئی چیز زمین کی ہو یا آسمان کی نقصان نہیں پہنچا سکتی اور وہ سننے اور جاننے والا ہے ——— ابان بن عثمانؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس نے یہ کلمہ بسم اللہ الذی الخ صبح وشام میں تین تین مرتبہ پڑھ لیا تو اسے کوئی چیز نقصان نہ پہنچا سکے گی۔

کلمۂ حوقلہ

اس ذکر کا حاصل یہ ہے کہ عالم کی ہر چیز سے قوت وطاقت کی نفی کر کے یعنی ہر چیز کو عاجز و بے بس جان کر صرف اللہ کو طاقت وقوت والا سمجھا جائے کہ تمام قوتوں کا سرچشمہ وہ ہی ہے کوئی مخلوق بھی اپنی ذاتی قوت سے کسی چیز پر حاوی اور غالب نہیں ہے۔اس ذکر کے ورد سے آدمی پر اپنی بیچارگی اور بے بسی منکشف ہوتی ہے اس کا غرور ختم ہوجاتا ہے اور وہ صرف اللہ کی طاقت پر بھروسہ کر کے کام کرنے کا عادی ہوجاتا ہے جس سے غیبی مدد اس کے شامل حال ہوجاتی ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ کثرت سے لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا باللہ پڑھا کرو کہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے اور فرمایا گیا کہ یہ کلمہ ننانوے امراض کا علاج ہے جس میں ہلکے درجہ کا مرض غم والم ہے۔ظاہر ہے کہ جب ہلکے درجہ کا مرض جو اس سے زائل ہوتا ہے غم والم ہے جسے ہم سب سے بڑا اور گہرا مرض جانتے ہیں اور سارے امراض کو اس سے ہلکا سمجھتے ہیں تو خیال کرلیا جائے کہ یہ لاحول اور کتنے بڑے بڑے لاعلاج امراض کو زائل کردیتا ہوگا۔

اور حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب بندہ یہ کلمہ پڑھتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتا

ہے کہ اَسْلَمَ عَبْدِیْ وَ اسْتَسْلَمَ (میرا بندہ مطیع وفرمانبردار بن گیا اور اس نے راہِ تسلیم ورضا اختیار کرلی)۔

کلمۂ حسبنہ اس ذکر کا حاصل اپنے حق کو حق تعالیٰ پر ڈال دینا اور اس پر کلی توکل و اعتماد اس طرح کرنا جیسے ایک شیر خوار بچہ اپنی ماں پر کامل بھروسہ کرکے اپنا کل نفع وضرر ماں ہی سے متعلق سمجھتا ہے حتیٰ کہ اگر وہ مارتی بھی ہے تب بھی اسی کی گود کی طرف دوڑتا ہے کہ میرے لیے اس آغوش کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں۔ اس ذکر سے قلب کی قوت بڑھتی ہے غیر اللہ کا خوف وخطر دل سے نکل جاتا ہے مصیبتیں نعمتوں سے بدل جاتی ہیں اور آدمی بدحالی سے نکل کر خوش حالی کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ چنانچہ حضرات صحابہ نے جب کہ غزوۂ حمراء الاسد میں انھیں دشمنوں کے ساز سامان سے ڈرایا گیا اور انہوں نے یہ کلمہ دل سے کہا تو منجانب اللہ ان پر یہ انعام کیا گیا کہ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْءٌ (تو وہ خدا کی نعمت اور فضل سے بھرے ہوئے لوٹے اور ان کو ناگواری ذرا بھی پیش نہیں آئی) جس سے واضح ہوا کہ حَسْبُنَا اور توکل کا ثمرہ انقلاب ہے شر سے خیر کی طرف اور مصیبت سے نعمت کی طرف۔

کلمۂ تصلیہ اس ذکر کا حاصل جس کا نام درود شریف ہے تمام جہانوں کے مربیٔ اعظم اور محسن اکرم جناب رسول اللہ ﷺ کا حق پہچاننا اور آپ کی ذات اقدس کے ساتھ غلامانہ تعلق کو ترقی دے کر حضور ﷺ کے ساتھ خصوصی نسبت پیدا کرنا ہے تاکہ اس نسبت کے سبب سے ایک طرف تو حضور ﷺ کو ہم گنہ گار امتیوں کی طرف خصوصی توجہ ہو جائے اور ایک طرف حق تعالیٰ کی عنایت خاص ہم پر منعطف ہو جائے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ جو شخص مجھ پر ایک دفعہ درود پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دس مرتبہ درود پڑھتے ہیں اور اس کی دس خطائیں نظر انداز کی جاتی ہیں اور اس کے دس درجے بلند کیے جاتے ہیں اور بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اس ایک دفعہ درود بھیجنے والے پر ستر دفعہ درود پڑھتے ہیں اور بعض

احادیث میں ہے کہ جس دعا کے اول میں درود شریف پڑھ لیا جائے تو وہ دعا قبول ہو جاتی ہے۔ یہ تو اللہ کی توجہ ہے کہ جب کوئی مجھ پر درود و سلام پڑھتا ہے تو میری روح مجھ پر لوٹائی جاتی ہے تا آں کہ میں سلام کا جواب دیتا ہوں یعنی میں بھی اپنے اس امتی پر صلوٰۃ و سلام بھیجتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر توجہ خاص اور کیا ہو سکتی ہے؟

غرض درود شریف سے نسبت عبودیت بھی مضبوط ہوتی ہے اور نسبت سنّیہ بھی مستحکم ہوتی ہے۔

کلمات عشرہ کے ذکر کے اوقات

ان اذکار کو معمول بنانے کے لیے انہیں دو وقت پر منقسم کر لینا چاہیے صبح اور شام۔ صبح کو بعد نماز فجر اور شام کو بعد نماز مغرب یا بعد نماز عشاء جس میں جو شخص اپنی سہولت اور نبھاؤ محسوس کرے ان میں سے بعض اذکار صبح شام دونوں وقت کیے جاویں گے اور بعض صرف صبح کو اور بعض صرف شام کو۔ تفصیل یہ ہے۔

دونوں وقت ادا کرنے کے اذکار

(۱) اولاً صبح اور شام کلمۂ بسملہ بسم اللہ الّذی لا یَضُرُّ مَعَ اسْمِہٖ شیٌٔ فی الْاَرْضِ ولا فی السماء وھو السمیع العلیم تین تین بار پڑھا جائے حدیث شریف میں اس کی مقدار یہی آئی ہے۔

(۲) اس کے بعد صبح اور شام کلمۂ استعاذہ اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللہِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ ما خَلَقَ تین تین بار پڑھا جاوے کہ اس کی بھی یہی مقدار حدیث شریف میں ارشاد فرمائی گئی ہے۔

(۳) اس کے بعد کلمۂ تمجید سُبْحَانَ اللہِ و الحمد للہ و لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ واللہ اکبر صبح اور شام ایک ایک سو مرتبہ پڑھا جاوے اس کی یہی مقدار از روئے حدیث نبویؐ ثابت ہے۔

(۴) اس کے بعد کلمۂ استغفار استغفر اللہ الّذِی لا الٰہ الّا ھو الحَیُّ القَیُّوم وَ اتوبُ اِلیہ صبح و شام ایک ایک سو مرتبہ پڑھا جاوے اس کی بھی یہی مقدار حدیث شریف میں وارد ہوئی ہے۔

(۵) اس کے بعد کلمۂ درود شریف اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ بِعَدَدِ کُلِّ مَعْلُوْمٍ لَکَ صبح وشام ایک ایک سو مرتبہ پڑھا جاوے گو اس کی کوئی مقدار خاص احادیث سے ثابت نہیں مگر اس کی کثرت کی فضیلت بہت سی احادیث سے ثابت ہے اس لیے مشائخ نے اس کی مقدار بھی صبح وشام سو مرتبہ رکھی ہے۔

صرف صبح کے اذکار!

(٦) ان پانچوں کے ذکر کے ساتھ کلمۂ تحبیب سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ بِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ صرف صبح کو ۴۱/مرتبہ پڑھا جاوے۔

(۷) اس کے بعد کلمۂ حوقلہ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ ۴۱/ بار پڑھا جاوے۔

صرف شام کے اذکار

(۸) پھر انہی اوپر والے پانچ کلموں کے ساتھ شام کو کلمۂ حسبنہ حَسْبُنَا اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ ۴۱/مرتبہ (صرف شام) کو پڑھا جاوے۔

(۹) پھر کلمۂ تکریم (آیت کریمہ) لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ صرف شام کو ۴۱/مرتبہ پڑھا جاوے۔

جو حضرات قلت وقت یا کثرت مشاغل یا ضعف کے سبب اختصار چاہیں وہ صبح اور شام اوپر والے پانچ کلمات پر قناعت کریں انہیں ترک نہ کریں البتہ یہ اختیار ہے کہ ابتدا میں صرف پانچ کلمات صبح وشام پڑھیں اور طبیعت کے خوگر اور متحمل ہو جانے کے بعد رفتہ رفتہ آخر کے چار اذکار بھی ملالیں۔

اور اگر کوئی شخص اپنے غیر معمولی مشاغل کی وجہ سے ابتداء ان پانچ اذکار کی مقدار بھی پوری نہ کر سکے تو اس کے لیے اول کے دو کلموں کی تعداد تین تین رکھ کر بقیہ کلمات کو دس دس مرتبہ پڑھ لیا کرے تو یہ حکم میں سو سو ہی کے ہو جاویں گے کیونکہ شریعت اسلام نے ہر نیکی کا ثواب دس گنا رکھ کر ایک نیکی کو دس گنا شمار کیا ہے تو اس

طرح فضل خداوندی سے یہ دس قائم مقام سو کے ہوجاویں گے اور گویا وہ شخص ہر کلمہ کو سو سو مرتبہ پڑھنے والا شمار کیا جاوے گا۔ پس یہ مختصر معمول ہر فارغ اور مشغول آدمی بآسانی نبھا سکتا ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ جسے راہ سلوک طے کرنی ہو تو وہ انہی مقداروں کو پورا کرے جو اوپر کے نمبروں میں لکھی گئی ہیں۔ مگر ساتھ ہی جو یہ مختصر راستہ اختیار کرے اور دس دس ہی کے عدد پر اکتفا کرے اس کے لیے بھی مناسب یہ ہے کہ ہفتہ میں کم از کم ایک دن مثلاً شب جمعہ یا روز جمعہ مقرر کر کے اس میں یہ اذکار اسی اصلی عدد کے ساتھ پڑھ لیا کرے اس سے امید پڑ جائے گی کہ وہ روزانہ بھی اسی عدد کا عادی ہو جائے اور بعد چندے اسے نبھانے کی توفیق ہو جائے۔

اذکار عامّہ

ذکر تلاوت قرآن ہاں پھر ان تمام اذکار پر جو چیز مستولی اور چھائی ہوئی ہے اور ان سارے اذکار کا سر منشا اور سر چشمہ ہے وہ تلاوت قرآن شریف ہے جو افضل الاذکار ہے اور بنص حدیث حق تعالیٰ سے بات چیت کرنا ہے اور انتہائی قرب کا ذریعہ ہے۔ حدیث میں ہے کہ جو مومن قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال ترنج کی سی ہے کہ خوشبو بھی پاکیزہ ہے اور مزہ بھی عمدہ ہے اور جو مومن قرآن نہیں پڑھتا ہے اس کی مثال کھجور کی سی ہے کہ مزہ تو عمدہ ہے مگر خوشبو نہیں ہے جو پھیلے اور دوسروں کو منتفع کرے، اس کے علاوہ اگر آدمی فتنوں سے بچنا چاہتا ہے تو اس کا واحد علاج تلاوت قرآن ہے سمجھ کر پڑھے گا تو بصیرت کے ساتھ فتنوں سے محفوظ رہے گا اور بے سمجھے اگر تلاوت کریگا تو کم از کم اس کی تاثیر اور برکت سے عملاً فتنوں سے بچا رہے گا خواہ اسے اس تحفظ و برکت کی خبر بھی نہ ہو۔

نیز حدیث میں ہے کہ قرآن شریف کی ہر آیت جنت کا ایک درجہ ہے محشر میں حافظ سے کہا جائے گا کہ تلاوت کرتا جا اور درجات میں ترقی کرتا جا۔ حدیث میں ہے

کہ نماز میں قرأت قرآن افضل ہے نماز کے باہر کی قرأت سے اور نماز سے باہر کی قرأت افضل ہے تسبیح و تکبیر کے ذکر سے الخ۔ اس لیے اگر تلاوت قرآن نماز میں کی جائے تو بہتر ہے جب کہ آدمی حافظ ہو مثلاً تہجد کی آٹھ رکعتوں میں یا بعد مغرب اوابین کی چھ رکعتوں میں۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ قلوب پر اسی طرح زنگ آتا ہے جیسے لوہے پر جب کہ لوہے کو پانی لگ جائے اور زنگ زدہ دلوں کی جلاء ذکر موت کی کثرت اور تلاوت قرآن ہے۔ بہرحال مذکورہ اذکار عشرہ کے ساتھ یہ افضل الاذکار یعنی تلاوت کلام ربانی بھی لازم کرلی جائے۔ قرآن حکیم نے اس ذکر تلاوت کا بھی امر فرمایا ہے ارشاد ربانی ہے وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا (اور قرآن کو صاف صاف پڑھو) اور ارشاد ہے: فَاقْرَءُوا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (جتنا آسان ہو قرآن پڑھو)

ذکر دعا و سوال

اس کے علاوہ ایک اہم ذکر دعا و سوال بھی ہے جس کا قرآن نے بڑے اہتمام کے ساتھ امر فرمایا ہے ارشاد ہے: وَ قَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (اور تمہارے پروردگار نے فرمادیا ہے کہ مجھ کو پکارو میں تمہاری درخواست قبول کروں گا)۔ اس لیے دعا کثرت سے کی جاوے اور اس کی عمدہ صورت یہ ہے کہ مناجات مقبول پاس رکھی جاوے اور روزانہ اس کا ایک حزب پڑھ لیا جاوے جس میں حدیث شریف کی دعائیں جمع کر کے سات دنوں پر تقسیم کردی گئی ہیں اس لیے روزانہ صبح کے معمولات سے فارغ ہو کر یہ حزب پڑھا جاوے۔

ذکر اسماء حسنیٰ

پھر اس دعا و پکار میں اعلیٰ ترین دعا و پکار وہ ہے جو اسمائے حسنیٰ کے ذریعہ سے ہو جس کے بارے میں امر الٰہی ہے "وَ لِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِہَا (اور اللہ کے پاک نام ہیں ان کے ذریعہ اللہ کو پکارو) پس اللہ کو اس کے اسمائے حسنیٰ کے ساتھ اس سے دعائیں مانگنا بھی ذکر مطلوب ہوا جس کے لیے عمدہ صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام جو حدیثوں میں آئے ہیں یاد کرلیے جائیں اور بچوں کو یاد کرادیے جائیں اور روزانہ نہیں تو کم از کم ہفتہ میں

ایک بار پڑھ لیے جاویں۔ چونکہ اسماء حسنیٰ اور ذکر دعا وسوال اور ذکر تلاوت متعین اور مخصوص کلمہ نہ تھا اس لیے ہم نے ان تین اذکار کا تذکرہ اذکار عشرہ میں نہیں کیا لیکن عملاً ان کو لازم کر لینا چاہیے۔

شجرۂ مشائخ جس طرح فیضان الٰہی ہم تک جناب رسول اللہ ﷺ کے طفیل اور توسل سے پہنچا ہے اور اسی لیے آپ تمام عالم بشریت کے محسن اعظم ومربیٔ اکبر ہیں اور اسی احسانِ عظیم کو پہچاننے اور ماننے کے لیے درود شریف رکھا گیا ہے جس سے حضور کے ذکر مبارک کے علاوہ بارگاہِ خداوندی میں توسل اور قرب وقبول بھی مقصود ہے چنانچہ اسی بناء پر دعا کے اول وآخر درود شریف پڑھنے کا حکم اور اس دعا کی مقبولیت کا وعدہ احادیث میں دیا گیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح فیضانِ نبوت ہم تک نائبانِ نبوت اور وارثان رسالت کے واسطہ اور وسیلہ سے پہونچا ہے بالخصوص فیضان اخلاق وکمالات باطن کے پہنچنے کا واسطہ اور وسیلہ مشائخ طریقت کے سوا دوسرا نہیں جو ان کمالات میں خلفائے نبوی ﷺ اور نبوت کے بعد آپ کے سچے وارث ہیں بنا بریں حضور اکرم علیہ السلام کے بعد یہی حضرات امت کے محسن اور مربی مانے گئے ہیں اس لیے اس احسان کو پہچاننے اور ماننے نیز قرب خداوندی اور نسبت نبویؐ ڈھونڈنے کے لیے ان کا تذکرہ بھی شامل طاعت اور ذکر اللہ ہی شمار کیا گیا ہے (کہ یہی لوگ حدیث نبوی اذا ذکر اللہ ذکرو واذا ذُکروا ذکر اللہ (جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کا بھی ذکر زبان پر آجاتا ہے اور جب ان کا ذکر کیا جاتا ہے تو اللہ کا ذکر زبان پر آجاتا ہے) کے سچے مصداق ہیں گویا ؎

خاصانِ خدا خدا نہ باشند ❁ لیکن ز خدا جدا نہ باشند

اور اس ذکر کی صورت مشائخ نے شجرہ پڑھ لینا تجویز کی ہے جو اکابرِ طریق کا معمول رہا ہے۔ بنا بریں سجرہ چشتیہ مولفہ حضرت شیخ المشائخ قطب طریق مرشدنا ومولانا حضرت شاہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس اللہ سرہ العزیز کا پڑھنا بھی معمول بنا لیا جاوے، خواہ

روزانہ یا حسب ذوق وشوق دوسرے تیسرے دن۔

شجرۂ طیبہ

کشجرۃ طیّبۃٍ اَصلُھا ثابتٌ و فرعھا فی السّماءِ

حمد ہے سب تیری ذات کبریا کے واسطے	اور درود و نعت ختم الانبیاء کے واسطے
اور سب اصحاب و آل مصطفیٰ کے واسطے	رحم کر مجھ پر الٰہی اولیاء کے واسطے
حضرت طیبؒ شہ علم و ہدیٰ کے واسطے	حضرت محمودؒ و اشرفؒ ذوالعلا کے واسطے
حاجی امداد اللہؒ ذوالعطا کے واسطے	حضرت نور محمدؒ پُر ضیا کے واسطے
حاجی عبد الرحیمؒ اہل فزا کے واسطے	شیخ عبد الباریؒ شہ بے ریا کے واسطے
شاہ عبد الہادیؒ پیر ہدیٰ کے واسطے	شاہ عضد الدینؒ عزیز دوسرا کے واسطے
شہ محمدؒ اور محمدی اتقیا کے واسطے	شہ محبّ اللہؒ شیخ با صفا کے واسطے
بو سعیدؒ اسعدِ اہل ورا کے واسطے	شہ نظام الدینؒ بلخی مقتدا کے واسطے
شہ جلال الدینؒ جلیل اصفیا کے واسطے	عبد القدوسؒ شہ قدس و صفا کے واسطے
اے خدا شیخ محمدؒ رہنما کے واسطے	شیخ احمدؒ عارف صاحب عطا کے واسطے
احمد عبد الحقؒ شہ ملک بقا کے واسطے	شہ جلال الدینؒ کبیر اولیاء کے واسطے
شیخ شمس الدینؒ ترکِ باصفا کے واسطے	شیخ علاء الدینؒ صابر با رضا کے واسطے
شہ فرید الدینؒ شکر گنج بقا کے واسطے	خواجہ قطب الدینؒ مقتول ولا کا واسطے
شہ معین الدینؒ حبیب کبریا کے واسطے	خواجہ عثمانؒ با شرم و حیا کے واسطے
شہ شریفؒ زندنی با اتقیا کے واسطے	خواجہ مودودؒ چشتی پارسا کے واسطے
شاہ بویوسفؒ شہ شاہ گدا کے واسطے	بو محمدؒ محترم شاہ ولا کے واسطے
احمد ابدالؒ چشتی باسخا کے واسطے	شیخ ابو اسحٰقؒ شامی خوش ادا کے واسطے
خواجہ ممشاد علوی بو العلاء کے واسطے	بو ہبیرہؒ شاہ بصری پیشوا کے واسطے

شیخ حذیفہ مرعش شاہ صفا کے واسطے
شیخ ابراہیم ادہم بادشا کے واسطے
شہ فضیل ابن عیاض اہل دعا کے واسطے
خواجہ عبدالواحد بن زید شا کے واسطے
شیخ حسن بصری امام الاولیاء کے واسطے
ہادیٔ عالم علی شیر خدا کے واسطے
سرور عالم محمد مصطفیٰ کے واسطے
یا الٰہی اپنی ذاتِ کبریا کے واسطے
آخرت میں کر شفاعت کا وسیلہ ان کو تو
مجھ ذلیل وخوار ومسکین وگدا کے واسطے
کر دوئی کو دور اور پر نور وحدت سے مجھے
تاہوں سب میرے عمل خالص رضا کے واسطے
کر ذرا اس ہوش سے بیہوش ومستانہ مجھے
با حق اپنے عاشقانہ با وفا کے واسطے
دیکھ مت میرا عمل کر لطف پر اپنے نگاہ
یا رب اپنی رحم واحسان وعطا کے واسطے
چار سو ہے فوج غم کر جلد اب مجھ پر کرم
کر رہائی کا سبب اس مبتلا کے واسطے
تیرے در کو چھوڑ کر تو ہی بتا جاؤں کہاں
کون ہے تیرے سوا مجھ بینوا کے واسطے
ہے عبادت کا سہارا عابدوں کے واسطے
اور تکیہ زہد کا ہے زاہدوں کے واسطے
سجدۂ طاعت سہارا ساجدوں کے واسطے
ہے عصائے آہ مجھ بے دست وپا کے واسطے
نے فقیری چاہتا ہوں نے امیری کی طلب
دردِ دل پر چاہیے مجھ کو خدا کے واسطے
نعمتیں دنیا کی سب دیں تو نے اے پروردگار
بخش وہ نعمت جو کام آوے سدا کے واسطے
کوئی بھی تحفہ نہیں لائق ترے دربار کے
جان ودل لایا ہوں بس تجھ پر فدا کے واسطے
کر مری امدا دالله وقت ہے امداد کا
اپنے لطف ورحمت بے انتہا کے واسطے

جس نے شجرہ یہ دیا ہو جس نے یہ شجرہ پڑھا
بخش دیجے سب کو ان اہلِ وصفا کے واسطے

خاتمہ

بہر حال ذکر اللہ ہی وہ چیز ہے جس سے عالم بھی زندہ رہے گا، ذاکر بھی زندہ رہے گا اور اس کا عمل بھی زندہ رہے گا۔ پس اگر یہ ساری زندگیاں مطلوب ہیں تو ذکر اللہ

پر دوام کیا جائے اور اس جزو زندگی بنا لیا جائے جو طریقہ سلف کا تھا، اور ہر دور میں سچے اور پختہ کار مسلمانوں کا رہا ہے۔ اس کو چھوڑ کر مسلمان کتنی ہی رسمی ترقیات کر جائیں اللہ کے یہاں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عمل عطا فرماوے اور خاتمہ ایمان پر کرے۔ آمین! وَاللّٰہُ الْمُوَفِّقُ وَ الْمُسْتَعَانُ وَ عَلَیْہِ التُّکْلَانُ ۔

احقر محمد طیب غفرلہ
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۲۷ر شوال ۱۳۷۵ھ

بزم طیب کے چراغ

فہرست خلفاء حضرت حکیم الاسلامؒ

(۱) حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند
(۲) حضرت مولانا حکیم محمد اسلام صاحب انصاری مہتمم مدرسہ نورالاسلام، میرٹھ
(۳) حضرت مولانا علامہ رفیق احمد صاحب بھینسانی مظفر نگر
(۴) مولانا سید ابرار احمد صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر (گجرات)
(۵) مولانا انوار الحسن صاحب مبلغ دارالعلوم دیوبند
(۶) مولانا عبیداللہ صاحب ناظم اعلیٰ مدرسہ اشرفیہ لاہور (پاکستان)
(۷) مولانا شیخ اخلاق احمد صاحب دیوبندی کراچی (پاکستان)
(۸) مولانا عبدالحق صاحب سلہٹ (بنگلہ دیش)
(۹) مولانا قمر الزماں صاحب بنگالی خطیب مسجد جامع کرلا (بمبئی)
(۱۰) مولانا محمد زیدصاحب پروفیسر اسلامیہ کالج لائل پور (پاکستان)
(۱۱) مولانا شرقی صاحب (بنگلور)

(۱۲) مولانا قاری عبداللہ سلیم صاحب دیوبندی، امریکہ

(۱۳) مولانا اکبر علی صاحب "سلہٹی مہتمم مدرسہ قاسم العلوم سلہٹ

(۱۴) مولانا عبدالحق صاحب فاضل دیوبند نواکھالی (بنگلا دیش)

(۱۵) مولانا سید محمد حامد صاحب صدیقی پروفیسر عثمانیہ کالج حیدرآباد (دکن)

(۱۶) صوفی عبدالرحمٰن صاحب محمد عمر چاند بھائی کھوکھا بازار ناگدیوی اسٹریٹ (بمبئی-۳)

(۱۷) مولانا معین الدین صاحب قاسمی ناندیڑ

(۱۸) شیخ ابوبکر احمد صاحب (بمبئی)

(۱۹) اسماعیل منصوری صاحب بزرگ مجاز صحبت (بمبئی)

(۲۰) مولانا قاری حفظ الرحمٰن ابن جناب قاری شریف احمد صاحب دیوبندی (مقیم دہلی)

وصیت نامہ حضرت حکیم الاسلامؒ

بمطالعہ | "برخوردار عزیز محمد سالم و محمد اسلم و محمد اعظم سلمہم۔ و برخورداریان عزیزات فاطمہ و ہاجرہ اور حمیراء۔ و عزیزات امۃ الاکرام و عائشہ اسلم و عائشہ اعظم سلمہن۔ و عزیزان محترمان محمد رشید فریدی، مولوی حامد میاں غازی و محمد احتشام کاظمی سلمہم"۔

یہ احقر ناکارہ آوارہ اس توصیہ کے وقت چوراسی یا پچاسی سال کی منزل میں ہے وقت تھوڑا ہی رہ گیا ہے کہ کشتی کنارے آ لگی ہے حق تعالیٰ خاتمہ ایمان و اسلام اور احسان پر فرمائے" آمین! یا رب العالمین"

خدا کرے کہ میرے آخری وقت میں تم سب عزیز تسلی و تسکین دیتے ہوئے اور تلقین کرتے ہوئے میرے پاس موجود ہو" وَمَا ذالك على الله بعزيز "

حدیث شریف میں ہے" جو وصیت کر کے نہیں جاتا وہ عالم برزخ میں گونگا رہتا ہے اسے بولنے کی اجازت نہیں ہوتی خواہ وہ مقبول اور ناجی بھی ہو"۔

یوں بھی ارشاد نبویؐ ہے کہ آدمی کی وصیت ہر وقت اس کے پاس تیار رہنی چاہیے اس لیے یہ ذیل کے چند کلمات بطور وصیت و نصیحت تحریر کر دیے ہیں جو آپ سب کے حوالہ ہیں۔

ان وصیتوں کے اولین مخاطب تم سب احقر کی اولاد یعنی لڑکے اور ان کی بہنیں اور لڑکیاں اور ان کے شوہر ہیں جن سے میں الحمد للہ بے حد خوش اور راضی ہوں اور ان کی سعادت مندیوں پر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس ناکارہ کی اطاعت و راحت رسانی بالخصوص اہلیہ مرحومہ حنیفہ خاتون رحمہا اللہ انتقال کے بعد جس پر آج پانچ برس گذر چکے ہیں اس قدر راحتیں پہنچائیں اور اس درجہ دلجوئی اور دلداری کے ساتھ ہر ہر لمحہ خدمت کے لیے تیار اور مستعد رہے اور رہتے ہیں، بجز اس کے کہ حق تعالیٰ کا شکر ادا کر کے اس سے ملتجی ہوں اور دعا کروں اور کرتا بھی رہتا ہوں، تم سب نے جیسی جیسی مجھے راحتیں پہونچائی ہیں حق تعالیٰ ہزاروں گنا اس سے زیادہ راحتیں دارین میں تمہیں اور تمہاری اولادوں کو اولادوں سے تم کو پہنچائیں اور سرخرو اور سربلند رکھیں اور اپنے بزرگوں کا سچا جانشین بنائیں" آمین ثم آمین " حق تعالیٰ کی ذات بابرکات سے امید ہے کہ ایسا ہی ہوگا" وما ذالك على الله بعزيز "

(۱) اگر میرا حادثۂ رحلت دیوبند میں ہو تو مجھے میری اہلیہ کی برابر جانب مشرق میں دفن کیا جائے تاکہ میں حضرت جد امجد قدس سرہ اور اپنے شیخ و استاذ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے قریب رہوں۔

(۲) دفن کے بعد کچھ وقفہ اولاد وہاں ٹھہر جائے اور تلاوت قرآن کریم یا تسبیح و تہلیل کرتی رہے تاکہ مجھے قبر میں انس حاصل رہے اور وحشت نہ ہو اور قرآن حکیم اور کلمات پاک کی برکت سے منزل سہل ہو جائے، خدانخواستہ کہیں باہر حادثہ ہو تو دل کی آرزو تو یہی ہے کہ حضرت جد امجدؒ سے جدا نہ ہوں اور قریب رہوں لیکن اس وقت کا کیا تقاضہ ہوگا اسے اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔" وما تدری نفس بای ارض تموت " تاہم امکانی حد تک سعی کی جائے کہ یہ قرب فوت نہ ہو۔

(۳) مجھ پر الحمدللہ کسی کا قرض نہیں ہے اس لیے جو کچھ متروکہ ہوگا وہ قرض سے پاک ہوگا وہ حسب ارشاداتِ حق تعالیٰ ورثہ کا حق ہوگا، اس بارے میں البتہ یہ نصیحت اور وصیت ضرور ہے کہ سالم واسلم سلمہما اپنے چھوٹے بھائی اعظم سلمہ کے حق میں ایثار سے کام لیں حق حقوق کے بارہ میں قانونی انداز کا برتاؤ نہ کریں۔ اعظم سلمہٗ زیادہ تر تعلیم اور ملازمت کے سلسلہ سے گھر سے باہر ہی رہا اور گھر کی راحت سے اس نے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے اس لیے اس کا حق زیادہ محسوس کریں اس کی دل جوئی اور دلداری کو بہرحال مقدم رکھیں۔

(۴) سب سے باہمی محبت سے رہیں اور ہر ایک دوسرے کو اپنے سے مقدم رکھے مالیات اور املاک کے سلسلہ میں کبھی لڑائی جھگڑا نہ کریں بلکہ ایثار اور ترجیح اخوۃ سے کام لیں۔ مال جیسی حقیر چیز پر تعلق باہمی اور استحکام مودۃ اور اخوۃ جیسی عظیم نعمت کو بہرحال مقدم رکھیں، اگر استواریٔ تعلق کی خاطر اپنا جائز حق بھی کچھ چھوڑنا پڑے تو اس سے دریغ نہ کریں اور تعلق میں فرق نہ آنے دیں اور وہ بھی بالخصوص اپنے چھوٹے کے حق میں۔

(۵) میرے تجربہ کے مطابق غفلت کے اسباب جو نزاع باہمی کا سبب بنتے ہیں، تین ہیں، کثرتِ علائق، کثرتِ حوائج اور کثرتِ امانی۔ اس لیے غیر ضروری تعلقات غیر ضروری سامان اور اس کی کثرت اور غیر ضروری امیدیں باندھتے رہنا اور ان سے دل کو اٹکانا تشویش و پراگندگی کا ذریعہ ہوتا ہے جس سے سکون قلب باقی نہیں رہتا در حالیکہ حوائج دنیا سکون کے لیے ہیں نہ کہ تشویش کے لیے، لیکن حقیقی سکون کا تعلق فراغ قلب سے ہے نہ کہ حرص و ہویٰ یا سامانوں کی کثرت سے، پس قلب بے نیاز رہنا چاہیے خواہ دنیا بکثرت پاس ہو "آز بگزار و بادشاہی کن"

تحصیل اور کسب وسعی اتنے ہی کی ہو جتنی ضرورت ہو اور ضرورت کو زیادہ بڑھایا نہ جائے------کار دنیا کسے تمام نہ کرد☆ ہر چہ گیرید مختصر گیرید------بہر حال غیر ضروری سامان اور اس میں قلبی انہماک سے ہمیشہ احتراز کریں حق تعالیٰ اپنے

خزانۂ غیب سے جو عطا فرمائیں اسے سر آنکھوں پر رکھیں اور ہمہ وقت شکر گذار رہیں نیز اسے صحیح مصرف میں صرف کریں۔

(۶) یہاں ہندوستان میں تم سب کی ایک بہن ہاجرہ سلمہا ہے وہ شرعاً تو ہر چیز میں حق دار ہے ہی حق بقدر اور ہونا ہی چاہیے۔ پر یوں بھی اس کی دل جوئی اور دلداری میں کمی نہ کی جائے اور اسے جب بھی کوئی مجبور کن ضرورت لاحق ہو اور بھائی اسے پورا کر سکتے ہوں تو اسے مقدم رکھیں۔ میں الحمد للہ جتنا لڑکوں سے خوش ہوں اتنا ہی لڑکیوں سے بھی خوش بخوش ہوں اور دلی آرزو ہے کہ انہیں کوئی کلفت لاحق نہ ہو۔

لڑکوں کی دلہنوں کو میں نے ہمیشہ بیٹیوں کی طرح سمجھا اور انہوں نے بھی ہمیشہ بیٹی بن کر دکھایا ہے اور لڑکیاں تو بیٹیاں ہیں ہی جنہوں نے ہمیشہ میرے ساتھ صرف ادب و تعظیم ہی کا نہیں بلکہ جذبۂ خدمت کے ساتھ عقیدت مندی کا برتاؤ کیا ہے۔

اسی طرح لڑکیوں کے شوہروں رشید میاں غازی میاں احتشام میاں سلمہم اللہ سے میری قلبی وابستگی لڑکیوں سے بھی زیادہ ہے ان سب نے جب بھی موقعہ پڑا ہے میرے ساتھ انتہائی دلداری، دل جوئی اور وہ بھی تعظیم و تکریم کے ساتھ خدمت شعاری کا برتاؤ کیا ہے اور اولاد سے بڑھ کر اولاد ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ یہ جہاں بھی رہیں حق تعالیٰ انہیں سربلند، سرخرو اور خوشحال و خوش مآل رکھے۔ آمین

(۷) سالم و اسلم و اعظم کے بچے حق تعالیٰ کی امانتیں ہیں سب سے زیادہ اہم فریضہ ان کی فطری صلاحیتوں اور آبائی اثرات کے تحت ان کی دینی اور ذہنی تربیت کا ہے تاکہ وہ اپنے آبائی اثرات سے بے بہرہ نہ رہیں الحمد للہ کہ سالم سلمہٗ کی اولاد میں سفیان سلمہٗ جس سے مجھے ابتداء ہی سے خاص لگاؤ ہے حافظ و عالم بن چکا ہے، عاصم سلمہٗ حفظ کر رہا ہے، فللہ الحمد۔ اسلم سلمہٗ کے بچے فاروق و ہشام سلمہما دونوں بحمد اللہ حافظ ہو چکے ہیں، فاروق کو علمی مناسبت ہے وہ علم و فن کی تحصیل میں لگا ہوا ہے دل کا تقاضا ہے کہ یہ سب حافظ ہونے کے ساتھ دین اور علم دین ہی کے سلسلہ سے وابستہ رہیں۔ اسی

طرح اعظم سلمہٗ کی اولاد بھی جیسے فطری طور پر صلاحیت مند ہے دل چاہتا ہے کہ وہ عملاً بھی اپنے آباء صالحین کی جانشین رہے۔ احمد فرید سلمہٗ کے لیے دلی تمنا اور دلی تقاضا ہے کہ وہ حافظ قرآن بنے اور آباء صالحین کے زمرہ میں شمار ہو جس کے جوہر اس میں موجود ہیں۔ علی گڈھ میں بظاہر حفظ قرآن کا سلسلہ دشوار ہے۔ اور ماحول بھی دوسرا ہے اس لیے سالم واسلم اسے اپنے پاس رکھ کر قرآن حفظ کرائیں۔ اور تعلیم دین دلائیں اور ساتھ ہی عصری تعلیم کا بھی فی الجملہ بندوبست کریں جس کے مصارف اعظم برداشت کرے۔

علم دین کے ساتھ عادۃً ترفُّہ اور تنعم جمع نہیں ہوتا اس کا بڑا شعار زہد و قناعت ہے۔ بقدر بقاء حیات رزق کا وعدہ حق تعالیٰ کی جانب سے ہے، اس لیے رزق موعود پر یقین رکھ کر اولاد کو اصل مقصد کے راستے پر ڈالیں۔ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بالصَّلٰوة۔ واصطبر عليها لا نسئلك رزقاً نحنُ نرزُقُكَ۔ و العافيةُ للتقوىٰ۔

مقبولیت عند اللہ صرف دین ہی کی لائن میں ہے تو یہ بچے دنیا سے بھی محروم نہ رہیں گے، یہ سب بچے الحمد للہ صالح القلب ہیں آبائی جوہر ان میں موجود ہیں۔ اگر دینی لائن پر ان کی تربیت ہو گئی تو وہ وقت کے علماء ثابت ہوں گے اور آباء کے لیے صدقۂ جاریہ بنیں گے۔ اس لیے آباء فیصلہ کرلیں کہ آیا انہیں دنیائے دنی میں پھانسنا ہے یا حامل دین بنانا ہے۔ حامل دین بنانا ہے تو مجالات عامہ، کثرت تنعم سے قطع نظر کرنی پڑے گی یوں حق تعالیٰ کا فضل بہت بڑا ہے کہ وہ غیب سے دنیا بھی بکثرت عطا فرمادے۔ اور اگر حامل دنیا یا صاحب جاہ وثروت بنانا ہے تو دین کا بقا عام حالات کے لحاظ سے دشوار ہے یوں حق تعالیٰ اسے آسان بنادیں تو یہ ان کا فضل ہے۔ بہر حال ماں باپ کی نیت اولاد کے بارہ میں صلاح وتقویٰ ہی پر پروان چڑھانے ہی کی ہونی چاہیے اور دنیوی معیشت کا معاملہ بقدر ضرورت کسب کرکے مفوّض الی اللہ کر دینا چاہیے تو دونوں جہاں کی نعمتیں ان شاء اللہ حاصل ہوں گی۔ ''وَما لنا اَنْ لَا نَتَوَكَّلَ على اللّٰه و قد هَدانا سُبُلَنا''۔

(۸) دلی آرزو ہے کہ حضرت اقدس مولانا نانوتوی قدس سرہ کا علمی سلسلہ جیسے اب تک محض بفضل خداوندی اولاد میں چل رہا ہے آئندہ بھی چلتا رہے اور یہ گھرانہ انہیں کی نسبت پر قائم رہے۔ آمین ! یا رب العالمین ۔

دارالعلوم کو ہمیشہ ہم لوگوں نے اپنا گھر سمجھا ہے اس کے تعلق کو کبھی ملازمت نہیں سمجھا بلکہ گھریلو خدمت کی طرح انجام دیا ہے اسی طرح اب بھی سب یہی سمجھتے رہیں لیکن دنیا کی حد تک اس پر نظریں ہرگز نہ جمائیں نہ اس میں ہمارا کوئی دعویٰ ہے نہ وہ ہمارا ورثہ ہے دارالعلوم خود تم لوگوں سے کوئی خدمت چاہے تو سر آنکھوں سے کیجائے، نہ چاہے تو ذرہ برابر اس کا کوئی شکوہ دلوں میں نہ لایا جائے، نہ اس کی کوئی حرص دل میں رکھی جائے۔ جہاں تک بھی ہو اس کی خدمت کو فریضۂ دینی سمجھا جائے اور اخلاص سے انجام دیا جائے اور اسے اپنی سعادت سمجھا جائے۔

(۹) یہ عاجز و مسکین تم سب کو اللہ کے سپرد کرتا ہے وہی ہم سب کا والی و وارث اور معین و ناصر ہے، اولاد سے اور بالخصوص اولاد حفاظ سے میری درخواست ہے کہ مجھے فراموش نہ کریں اور ایصال ثواب کا سلسلہ برابر جاری رکھیں جس کی مجھے پوری توقع ہے۔ میں نے بھی الحمد للہ اپنے بزرگوں کو کبھی فراموش نہیں کیا اور سلسلہ ایصال ثواب امکانی حد تک برابر جاری رکھا ہے۔ جیسا کہ مجھے میرے والد ماجد رحمہ اللہ نے وصیت فرمائی تھی۔ یہی توقع مجھے اپنی اولاد سے بھی ہے ----- برزخ میں توفیق ملی تو دعائیں کرتا رہوں گا اور وہ ان شاء اللہ لگتی رہیں گی۔

احقر العباد محمد طیب غفر اللہ لہ ولوالدیہ ولاولادہٖ واحفادہٖ

۲۰؍رجب المرجب ۱۳۹۹ھ (بوقت سفر افریقہ)

بفضلہٖ تعالیٰ تیسری جلد تمام ہوئی اس سلسلے کی باقی جلدیں زیرِ ترتیب ہیں جو انشاء اللہ جلد ہی منظر عام پر آئیں گی۔ اس سلسلے میں از راہِ کرم ہم سے رابطہ قائم رکھیں۔ (مؤلف)

فکرِ ولی اللّٰہی کے چلتے پھرتے عنوان، حجۃ الاسلامؒ کے علوم کے شارح، شیخ الہندؒ کے جذبے اور خیال کے حامل، امام العصرؒ کے علوم وکمالات کے ترجمان، اکابر دارالعلوم کے زہد وتقویٰ، فضل وکمال اور بلند اخلاق وکردار کے نمونے، حق وصداقت کے پیکر، صبر ورضا کے کوہِ گراں، امانت ودیانت کی نورانی شخصیت، مظلومیت کی ایک کرب انگیز داستان کے مرکز، اہتمام وانتظام کی مثالی ہستی، دیوبندیت کی آخری نشانی علمی بصیرت، فقہی مہارت، تحقیقی عظمتوں کے بلند وبالا مینار، خطابت وبیان کا حسین مجسمہ، سلوک وتصوف کی روشن قندیل، بیعت وارشاد کا مقدس چراغ، وعظ وتلقین کی پاکیزہ کڑی، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی زندگی کے ہر گوشے تک رسائی کی ایک کوشش، ان کی خدمات کو اجاگر کرنے کی ایک سعی، ان کے کارناموں کو جاننے کا ایک جذبہ، ان کی ساٹھ سالہ عظیم مساعی کا ایک جائزہ، ہر سطر، ہر صفحہ، ہر ورق، حقائق، صداقتوں اور سچائیوں سے لبریز، اس مردِ مومن کے حالات اور واقعات کا ذکر جو زندگی کے آخری چند سالوں میں بے چینی، بے قراری، کرب اور دلآزاری کے زخموں سے چور تھا، جس نے اتنے زخم کھائے کہ وقت رو پڑا آسمان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے مگر ظالموں نے اس کے جسم کو لہو لہان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

حکیم الاسلامؒ دارالعلوم دیوبند کی ایک مظلوم شخصیت: ایک آئینہ ہے ایک ایسا آئینہ جس میں کوئی چہرہ دھندلا نہیں، کوئی واقعہ ادھورا نہیں سب کچھ کھلا ہوا اور صاف شفاف ہے۔

(مؤلف)

IDARA ANWARUL QURAN DEOBAND
247554 DISTT SAHARANPUR U.P.